اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ

سچے امانت دار تاجر کو (قیامت کے دن) انبیاء صدیقین اور شہداء کی معیت حاصل ہوگی

ترمذی شریف کے ابواب البیوع سے متعلق ابحاث کا مجموعہ

خزائن السنن

جلد دوم

تالیف

حافظ عبدالقدوس خان قارن

مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

ناشر عمر اکادمی نزد مدرسہ نصرۃ العلوم گھنٹہ گھر گوجرانوالہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَاءِ۔

(ترمذی صفحہ ۲۲۹ ج ۱)

سچے امانتدار تاجر کو (قیامت کے دن) انبیاء، صدیقین اور شہداء کی معیت نصیب ہوگی۔

خزائن السنن

جلد دوم

ترمذی شریف ــــــ ابواب البیوع

احادیث کی کتابوں میں بیوع (خرید و فروخت) سے متعلق ابحاث کا شمار مشکل ترین ابحاث میں ہوتا ہے جس کی وجہ سے طلبہ و طالبات کو خاصی دشواری پیش آتی ہے بفضلہ تعالیٰ ان ابحاث کو عام فہم و آسان انداز میں بیان کر دیا گیا ہے جس سے نہ صرف حدیث پڑھنے والے طلبہ و طالبات بلکہ عام پڑھے لکھے حضرات بالخصوص تاجر حضرات بھی استفادہ کر سکتے ہیں اور اپنی تجارت کو شرعی احکامات کے دائرہ میں رکھنے کے لیے اس کتاب سے راہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو عبادات کے ساتھ ساتھ معاملات کی اصلاح کی بھی توفیق نصیب فرمائے اور احقر کی اس خدمت کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور آخرت کی نجات کا ذریعہ بنائے۔

اٰمِیْنَ یَا اِلٰہَ الْعٰلَمِیْنَ۔

احقر محمد عبدالقدوس خان قارن

طبع ششم .... اکتوبر ۲۰۱۲ء

نام کتاب .... خزائن السنن جلد دوم (ترمذی شریف ابواب البیوع)

تالیف .... حضرت مولانا حافظ عبد القدوس خان قارن

مطبع .... مکی مدنی پرنٹرز لاہور

تعداد .... بارہ سو پچاس (۱۲۵۰)

قیمت .... -/۱۹۰ (ایک سو نوے روپے)

ناشر .... عمر اکادمی نزد مدرسہ نصرۃ العلوم گھنٹہ گھر گوجرانوالہ

﴿ملنے کے پتے﴾

☆ کتب خانہ صفدریہ حق سٹریٹ اردو بازار لاہور

☆ ادارہ الانور بنوری ٹاؤن کراچی
☆ کتب خانہ مظہری گلشن اقبال کراچی
☆ مکتبہ امدادیہ ٹی بی ہسپتال روڈ ملتان
☆ مکتبہ حقانیہ ملتان
☆ مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور
☆ مکتبہ قاسمیہ اردو بازار لاہور
☆ مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور
☆ مکتبہ الحسن اردو بازار لاہور
☆ کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی
☆ کتب خانہ مجیدیہ بوہڑ گیٹ ملتان
☆ مکتبہ صفدریہ چوہڑ چوک راولپنڈی
☆ مکتبہ حلیمیہ درہ پیزو لکی مروت
☆ مکتبہ سلطان عالمگیر اردو بازار لاہور
☆ ادارہ اسلامیات انارکلی لاہور
☆ اسلامی کتب خانہ اڈا گامی ایبٹ آباد
☆ مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ
☆ مکتبہ عثمانیہ میانوالی روڈ تلہ گنگ
☆ مکتبہ الاظہر بانو بازار رحیم یار خان
☆ اقبال بک سنٹر نزد صالح مسجد صدر کراچی
☆ مکتبہ فاروقیہ ہزارہ روڈ حسن ابدال
☆ مکتبہ علمیہ جی ٹی روڈ اکوڑہ خٹک
☆ مکتبہ سید احمد شہید اکوڑہ خٹک
☆ مکتبہ رحمانیہ قصہ خوانی پشاور
☆ مکتبہ العارفی فیصل آباد
☆ مکتبہ فاروقیہ حنفیہ اردو بازار گوجرانوالہ
☆ والی کتاب گھر اردو بازار گوجرانوالہ

☆ ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ ☆ ظفر اسلامی کتب خانہ جی ٹی روڈ گکھڑ

فہرست مضامین خزائن السنن حصہ چہارم

(جلد دوم)

عرض حال

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم ، اما بعد ،

ترمذی شریف کی مع اضافات ان تقاریر کا مجموعہ جو کہ والدگرامی قدر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدر دام مجدہم ترمذی شریف پڑھاتے وقت مختلف سالوں میں بیان کرتے رہے ہے وہ ابواب البیوع تک انتہائی جامع، مدلل اور مختصر انداز میں تین حصوں پر مشتمل ایک ہی جلد میں اب سے کئی سال پہلے شائع ہو چکا ہے جس کو برادر عزیز المولوی رشید الحق خان عابد صاحب سلمہ نے ترتیب دیا اور علماء کرام و طلبہ عظام اس علمی ذخیرہ سے استفادہ کر رہے ہیں۔ احادیث کی کتابوں میں بیوع (خرید و فروخت) سے متعلق ابحاث کا شمار مشکل ترین ابحاث میں ہوتا ہے جس کی وجہ سے حدیث پڑھنے والے طلبہ و طالبات کو خاصی پریشانی ہوتی ہے احقر نے طالب علمی زمانہ میں یہ ابحاث بخاری شریف میں اپنے والد محترم دام مجدہم سے اور مسلم شریف و ترمذی شریف میں عم مکرم مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان صاحب سواتی دام مجدہم سے اور ابوداؤد شریف مشکوٰۃ شریف اور ہدایہ میں جامع المعقول والمنقول حضرت مولانا عبد القیوم صاحب ہزاروی دام مجدہم سے پڑھی تھیں۔ ان شیوخ کے بیان کردہ مسائل کسی حد تک ذہن میں مستحضر تھے اور پھر جب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ترمذی شریف و ابوداؤد شریف میں یہ ابحاث پڑھانے کا موقع ملا تو شروحات کے مطالعہ سے ان ابحاث کے متعلق کافی معلومات کا اضافہ ہوا تو ان معلومات کو ایک کاپی میں درج کرتا رہا اور کئی سال تک طلبہ کو یہ ابحاث لکھواتا رہا۔ پھر یہ محسوس کر کے کہ لکھنے میں طلبہ کو مشقت کے ساتھ وقت بھی بہت صرف ہوتا ہے تو یہ فیصلہ کیا کہ جس طرح ترمذی شریف کی کتاب البیوع تک کی ابحاث شائع کی گئی ہیں اسی طرح ان ابحاث کو بھی شائع کر دیا جائے تاکہ صرف ہمارے ہاں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ ہی نہیں بلکہ جس مقام میں بھی طلبہ و طالبات تعلیم حاصل کر رہے ہیں وہ خزائن السنن جلد اوّل کی طرح اس سے بھی استفادہ کر سکیں۔ بفضلہ تعالیٰ ہر بحث میں

مسائل کی وضاحت اور فقہاء کرام کے اقوال باحوالہ بقید صفحات ذکر کر دیئے گئے ہیں تاکہ مزید معلومات کے خواہش مند حضرات اصل کتابوں کی طرف مراجعت کر سکیں۔

عمِ محترم استاذی المکرم حضرت مولانا صوفی عبدالحمید خان صاحب سواتی دام مجدہم کی ترمذی شریف ابواب البیوع بھی شائع ہو کر منظرِ عام پر آچکی ہے جس کو ان کے صاحب زادہ فاضل نوجوان مولانا حاجی محمد فیاض صاحب سلمہ نے کیسٹوں سے نقل کر کے ترتیب دیا ہے اس میں ابواب البیوع کے تحت پیش کی گئی تمام احادیث کا اردو ترجمہ کیا گیا ہے، اور راویوں کا تعارف ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ فقہی مسائل کی بقدر ضرورت بحث کی گئی ہے طلبہ کرام کو اس سے ضرور استفادہ کرنا چاہیے۔

علماء کرام و طلبہ عظام سے گزارش

علماء کرام و طلبہ عظام سے گزارش ہے کہ اس کتاب میں جہاں بھی عبارت میں سقم (کمزوری) یا کسی مسئلہ میں غلطی محسوس کریں تو اس سے احقر کو ضرور مطلع فرمائیں ان شاء اللہ العزیز معقول اغلاط کی درستی میں کوئی تامل نہ ہوگا اور آگاہ کرنے والے حضرات کے شکریہ کے ساتھ غلطی کی اصلاح کو ذمہ داری سمجھا جائے گا۔ نیز گزارش ہے کہ میرے شیوخ کے لیے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ صحت و عافیت کے ساتھ تا دیر سلامت با کرامت فرمائے۔ اور احقر کی اس خدمت کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور میرے، میرے والدین اور اساتذۂ کرام کے لیے اس کو صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین یا الٰہ العالمین۔

حافظ محمد عبدالقدوس خان قارن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رب یسر ولا تعسر وتمم بالخیر وبک نستعین

اَبْوَابُ الْبُیُوْعِ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خرید و فروخت کے متعلق احکامات

بیع کی اہمیت اور حکمت

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ دینی امور کا مدار پانچ چیزوں پر ہے۔ (۱) اعتقادات (۲) عبادات (۳) معاملات (۴) زواجر (۵) آداب ۔ معاملات میں اکثر بیع کی طرف ضرورت پیش آتی ہے اس لیے فقہاء کرام معاملات میں بیوع کو زیادہ اہمیت سے ذکر کرتے ہیں۔ اور علامہ عینیؒ بیع کی حکمت یہ بیان کرتے ہیں کہ اس کی وجہ سے نظام عالم کو فساد سے بچانا اور امور معاش کو قائم رکھنا ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۵۹)

اور نظام عالم کو بیع کی وجہ سے فساد سے بچانے کی وضاحت یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے۔ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (پارہ ۱ آیت ۲۹) اللہ تعالیٰ وہی ذات ہے جس نے تمہارے فائدہ کے لیے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے۔ ان چیزوں سے انسان فائدہ اٹھا سکتا ہے اور ان میں تصرف کر سکتا ہے۔ تو اس تصرف کے لیے عقود کو ذریعہ بنایا۔ اس لیے کہ اگر ایک چیز کسی کے پاس موجود ہے، اور کوئی دوسرا آدمی اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو اس کی پانچ صورتیں ہو سکتی ہیں۔

پہلی صورت یہ ہے کہ یہ آدمی دوسرے سے زبردستی چھین لے یا اس سے چوری کر کے اس سے فائدہ اٹھائے تو اس صورت کی نہ شریعت اجازت دیتی ہے اور نہ ہی عقلاً یہ درست ہے۔ اس لیے کہ اس کی وجہ سے جھگڑے ہوں گے اور نظام عالم میں فساد ہوگا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ یہ آدمی اس چیز کے مالک سے اجازت لے کر اس سے فائدہ اٹھائے بشرطیکہ اس سے فائدہ اٹھانے کی شرعاً ممانعت نہ ہو اور فائدہ حاصل کرنے کا کوئی عوض مالک کو نہ دیا جائے تو اس کو عاریت کہتے ہیں۔

تیسری صورت یہ ہے کہ مالک کی اجازت کے ساتھ اس چیز سے فائدہ اٹھایا جائے اور فائدہ اٹھانے کا عوض مالک کو دیا جائے تو اس کو اجارہ کہتے ہیں۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ اس چیز کا مالک کوئی معاوضہ لیے بغیر وہ چیز دوسرے کو دے کر مالک بنا دے تو اس کو ہبہ کہتے ہیں۔

اور پانچویں صورت یہ ہے کہ کسی چیز کے عوض اس چیز کا دوسرے کو مالک بنا دے تو اس کو بیع کہتے ہیں۔ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ بیع کی حلت پر مسلمانوں کا اجماع ہے اور حکمت بھی اسی کا تقاضہ کرتی ہے کہ بیع حلال ہو۔ (فتح الباری ج ۵ ص ۱۹۱)

بَیع کی تعریف

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ بیع' باع سے مشتق ہے (یعنی کسی کو کوئی چیز دینے کے لیے ہاتھ پھیلانا) اور بیع کو بیع اس لیے کہتے ہیں کہ بائع اور مشتری میں سے ہر ایک مبیعہ اور ثمن لینے اور دینے کے لیے ہاتھ دراز کرتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بیع کے وقت بائع اور مشتری رضا ظاہر کرنے کے لیے ایک دوسرے سے مصافحہ کریں اسی لیے بیع کو صفقہ بھی کہا جاتا ہے۔ (اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۳)

علامہ عینیؒ اور بعض دیگر فقہاء کرامؒ نے بیع کی تعریف یہ فرمائی ہے مُبَادَلَةَ الْمَالِ بِالْمَالِ عَلٰى سَبِيْلِ التَّرَاضِىْ اس میں المال میں الف لام عہدی ہے یعنی وہ مال جس کو شریعت مال قرار دیتی ہے۔ اور بعض حضرات نے یہ تعریف کی ہے۔ اَنَّ الْبَيْعَ مُبَادَلَةُ مَالٍ مُفِيْدٍ بِمَالٍ مُفِيْدٍ بِرِضًا (حاشیہ شرح الوقایہ ج ۳ ص ۱۰) کہ مفید مال کا مفید مال سے تبادلہ باہمی رضا سے کرنے کو بیع کہتے ہیں۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ بیع کی تعریف کرتے ہیں وَالْبَيْعُ نَقْلُ مِلْكٍ اِلَى الْغَيْرِ بِثَمَنٍ وَالشِّرَاءُ قَبُوْلُهٗ (بذل المجہود ج ۵ ص ۲۳۶) یعنی اپنی ملکیت کو کسی دوسرے کی ملکیت میں ثمن کے بدلہ میں منتقل کرنے کا نام بیع ہے اور اس کے قبول کرنے کا نام شراء ہے۔ مگر کبھی بیع اور شراء کا اطلاق ایک دوسرے پر ہوتا ہے یعنی بیع کا شراء پر اور شراء کا بیع پر بھی اطلاق ہوتا ہے اور بیع کی شرائط میں سے ہے کہ متعاقدین اس کے اہل ہوں یعنی عاقل و بالغ ہوں اور بیع کا محل بھی ہو یعنی جس چیز کی بیع کی جا رہی ہے وہ بیع کے قابل ہو اور مال ہو۔ نیز بائع کو مبیعہ مشتری کے سپرد کرنے پر قدرت حاصل ہو۔

بیع میں باہمی رضا ضروری ہے

اور بیع میں بائع اور مشتری دونوں کی طرف سے رضا ضروری ہے۔ امیر یمانیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ (پارہ ۵ سورۃ النساء آیت ۲۹) اے ایمان والو! ایک دوسرے کا مال تم مت کھاؤ مگر یہ کہ تمہاری رضامندی سے بیع ہو تو یہ دونوں جانبوں سے رضا کے شرط ہونے کی دلیل ہے۔ اور چونکہ رضا امور خفیہ میں سے ہے اس لیے اس کا حکم ظاہری سبب کے ساتھ متعلق کر دیا کہ اگر بائع اور مشتری باہم مال کا تبادلہ کرتے ہیں تو یہ تراضی کے قائم مقام ہوگا اور اس کے ساتھ حکم متعلق ہوگا۔ (سُبُلَ السَّلَام ج ۳ ص ۸۷)

بیع کے ارکان اور اس کا حکم

بیع کے ارکان ایجاب اور قبول ہیں۔ اگر بائع کہتا ہے کہ میں یہ چیز تجھ پر اتنے کی بیچتا ہوں یا مشتری کہتا ہے کہ میں تجھ سے یہ چیز اتنے کی خریدتا ہوں تو یہ ایجاب ہے اور اس کے جواب میں خرید لینے یا بیع دینے کا قول قبول ہوگا۔ صاحب ہدایہؒ فرماتے ہیں کہ ایجاب و قبول کے الفاظ ماضی کے صیغہ سے ہونے چاہئیں جیسا کہ ایک کہے بِعْتُ کہ میں نے یہ چیز بیچ دی اور دوسرا کہے کہ اِشْتَرَیْتُ کہ میں نے یہ چیز خرید لی۔ (ہدایہ ج ۳ ص ۲)

بیع کا حکم یہ ہے کہ اس کی وجہ سے بائع ثمن کا اور مشتری مبیعہ کا مالک بن جاتا ہے۔

بیوع جمع لانے کی وجہ

بیع کی مختلف اور کئی اقسام ہیں اس لیے البیوع جمع لایا گیا جو کہ بیع کی جمع ہے۔ امیر یمانیؒ نے سبل السلام ج ۳ ص ۸۷ میں بیع کی آٹھ قسمیں بیان کی ہیں اور علامہ عینیؒ نے عینی شرح الہدایہ ج ۳ ص ۳ میں اس کی بعض اقسام کا ذکر کیا ہے مثلاً" بیع المقایضہ ' بیع صرف' بیع سلم' بیع مرابحہ' بیع تولیہ' بیع الوضیعہ اور بَیْعَ اَلِاسْتِصْنَاعِ وغیرہ۔ ان میں سے ہر ایک کی تعریف آگے بیان ہوگی۔ ان شاء اللہ العزیز۔

بَابُ مَا جَآءَ فِیْ تَرْکِ الشُّبُھَاتِ

(شبہ ڈالنے والی چیزیں چھوڑ دینے کا بیان)

قاضی شوکانیؒ نیل الاوطار ج ۵ ص ۲۲۱ اور علامہ ابن حجرؒ فتح الباری ج ۵ ص ۱۹۵ میں

اور ملا علی قاریؒ مرقات ج ۶ ص ۳۵ میں فرماتے ہیں کہ اَلْحَلَالُ بَیِّنٌ والی روایت میں احکام کو تین اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (۱) جس چیز کے استعمال کی شریعت نے صراحتاً اجازت دی اور اس چیز کی اباحت ہر ایک پر واضح ہو تو وہ حلال بین ہے (جیسا کہ درختوں کے پھل اور گندم مکئی وغیرہ) (۲) جس چیز سے شریعت نے صراحتاً منع کیا ہو اور ممانعت ہر ایک پر واضح ہو اور شریعت نے اس کے کرنے پر وعید سنائی ہو تو وہ حرام بین ہے (جیسا کہ شراب' خنزیر اور مردار وغیرہ) (۳) جس چیز کے بارہ میں شریعت سے اجازت یا ممانعت صراحتاً نہ ہو تو وہ مشتبہ ہے۔ جب تک اس کی حلت یا حرمت کا کوئی پہلو راجح نہ ہو جائے اس وقت تک اس کا ترک افضل ہے اس لیے کہ اگر وہ چیز حرام ہوگی تو یہ آدمی حرام کے ارتکاب سے بچ گیا اور اگر وہ جائز ہوگی تو تب بھی مشتبہ چیز سے بچنے کے حکم پر عمل کرنے کی وجہ سے اس کو اجر و ثواب ملے گا۔

اور حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ اَلْحَلَالُ بَیِّنٌ کا مطلب یہ ہے کہ اس کی حلت یا تو خود واضح ہو یعنی کتاب و سنت میں سے کسی ایک میں اس پر نص موجود ہو یا یہ کہ مجتہدین حضرات کے اجتہاد کے بعد اس کی حلت واضح ہو چکی ہو تو وہ حلال بین ہے اور اسی طرح اَلْحَرَامُ بَیِّنٌ کا مطلب ہے۔ اور مشتبہات سے ایسے امور مراد ہیں جن کی وضاحت ائمہ سے نہ ہو اور اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ امور ان کے دور میں پائے ہی نہ جاتے ہوں یا یہ ہے کہ ان سے وضاحت نہ ہو بلکہ خفاء ہو۔ (الکوکب الدری ج ۱ ص ۳۵۳) اور مبارکپوریؒ صاحب فرماتے ہیں کہ اَلْحَلَالُ بَیِّنٌ کا مطلب یہ ہے کہ اس کی حلت پر نص موجود ہو یا یہ کہ ایسا قاعدہ بیان کر دیا گیا ہو جس سے اس کا حکم نکالا جا سکے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۔ اس میں لکم میں لام نفع کا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ مضر اشیاء کے علاوہ باقی چیزیں حلال ہیں۔ اسی طرح اَلْحَرَامُ بَیِّنٌ میں ہے اور جیسا کہ حدیث میں ہے اَلْمُسْکِرُ حَرَامٌ تو اس سے ہر نشہ آور چیز کا حکم معلوم کیا جا سکتا ہے۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۲۲۵)

علامہ عینیؒ امام خطابیؒ کے حوالہ سے عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۱۴۶ میں اور مبارک پوریؒ تحفۃ الاحوذی میں لکھتے ہیں کہ جس چیز میں مِنْ وَجہِ حِلّتْ اور مِنْ وجہ حُرْمَتْ کا پہلو پایا جائے وہ مشتبہ ہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ جس میں حلت اور حرمت کے دلائل متعارض ہوں اور ان دلائل میں سے کسی کو ترجیح نہ دی جا سکتی ہو تو وہ چیز مشتبہ ہے۔

اور امام بخاریؒ نے ج ۱ ص ۲۷۶ میں اس باب کے تحت جو روایات بیان کی ہیں ان میں مشتبہات کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک عورت نے آکر حضرت عقبہؓ اور ان کی بیوی سے کہا کہ میں نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہوا ہے تو جب یہ معاملہ حضور علیہ السلام کے سامنے پیش ہوا تو آپؐ نے حضرت عقبہؓ کو اپنی اس بیوی سے جدا ہونے کا حکم فرمایا۔

اور دوسری روایت میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے حضرت سودہؓ کو اس لڑکے سے پردہ کرنے کا حکم فرمایا جو ان کے باپ کے فراش پر پیدا ہوا تھا مگر اس کے بارہ میں عتبہ بن ابی وقاص کا دعویٰ تھا کہ یہ میرے زنا کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر شکاری نے بسم اللہ پڑھ کر کتا شکار کے لیے چھوڑا اور اس آدمی کو شک ہو کہ ہو سکتا ہے کہ میرے اس کتے کے ساتھ شکار کرنے میں کوئی اور کتا بھی شریک ہوگیا ہو تو آپ ﷺ نے ایسا شکار کھانے سے منع فرما دیا۔

علامہ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ مشتبہات میں اِشْتِبَاہ فِیْ نَفْسِہٖ نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ اشتباہ ہر ایک کے لیے ہوتا ہے اور حدیث کے الفاظ لَا یَعْلَمُهَا كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ سے اس کی وضاحت ہوتی ہے اس لیے کہ بیان دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک بیان جلی جس کو اکثر لوگ جان سکتے ہیں اور دوسرا بیان خفی جس کو صرف خاص علماء ہی جان سکتے ہیں۔ (تہذیب سنن ابی داؤد ج ۵ ص ۶)

مشتبہ چیز سے بچنے والے کو ثواب ہوگا

جب تک آدمی کو کسی چیز کے بارہ میں اشتباہ ہو اس سے اجتناب بہتر ہے۔ اور ابن ماجہ ص ۳۱۱ میں یہ روایت موجود ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ حَتّٰى يَدَعَ مَالَا بَاْسَ بِهٖ حَذَرًا لِمَا بِهٖ بَاْسٌ کہ آدمی اس وقت تک متقی نہیں ہو سکتا جب تک کہ حرج میں ڈالنے والی چیزوں میں واقع ہونے سے بچنے کی خاطر ایسی چیزوں سے نہ بچے جو حرج میں نہیں ڈالتیں۔

قَوْلُہٗ اِسْتَبْرَاءَ لِدِيْنِهٖ وَعِرْضِهٖ کہ آدمی اپنے دین اور عزت و آبرو کو بچانے کے لیے اس چیز سے بچتا ہے تاکہ اس چیز کے ارتکاب پر نہ تو اس پر کوئی فتویٰ صادر ہو اور نہ ہی وہ لوگوں کے طعن کا شکار ہو۔

اشکال اور اس کا جواب

ترمذی شریف ج ۲ ص ۲۲۹ وغیرہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مشتبہات سے اجتناب کرنا چاہیے اور ابو داؤد ج ۲ ص ۱۸۳ میں حضرت ابن عباسؓ سے اور ابن ماجہ ص ۲۴۱ اور ترمذی ج ۱ ص ۳۰۳ میں حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت ہے اور یہاں الفاظ ابن ماجہ سے نقل کیے جا رہے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اَلْحَلَالُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ فِیْ کِتَابِهٖ وَالْحَرَامُ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فِیْ کِتَابِهٖ وَمَا سَکَتَ عَنْهُ فَهُوَ مِمَّا عَفٰی عَنْهُ اور مسند احمد کی روایت میں آگے فَلَا تَتَکَلَّفُوْهُ کے الفاظ ہیں۔ "جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال قرار دیا ہے وہ حلال ہے اور جس کو حرام قرار دیا ہے وہ حرام ہے اور جن چیزوں سے خاموشی اختیار کی ہے تو ان کو معاف کیا گیا ہے۔ پس تم ان کی مشقت نہ اٹھاؤ۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشتبہات کے ارتکاب پر کوئی گرفت نہیں تو بظاہر دونوں روایتوں میں تعارض ہے۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ جس روایت میں اجتناب کا ذکر ہے اس کا تعلق ورع اور پرہیزگاری سے ہے اور جس میں عفی عنہ ہے اس کا تعلق اس چیز کے حکم سے ہے کہ اس کے ارتکاب کی وجہ سے آدمی گنہگار نہ ہوگا مگر اس کا بچنا بہتر ہے اور دوسرا جواب یہ ہے کہ جس میں مَا عَفٰی عَنْهُ ہے اس میں بھی اجتناب کا ہی حکم ہے اس لیے کہ آگے الفاظ ہیں فَلَا تَتَکَلَّفُوْهُ یعنی جب تمہیں ان چیزوں کا مکلف نہیں بنایا گیا تو تم بھی خواہ مخواہ ان کی مشقت نہ اٹھاؤ بلکہ ان سے بچتے ہی رہو۔

بَابُ مَا جَاءَ فِیْ اَکْلِ الرِّبٰوا (سود کھانے کا بیان)

ربا کا لغوی اور اصطلاحی معنی

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ حافظ ابن حجرؒ سے نقل کرتے ہیں کہ اَصْلُ الرِّبٰو اَلزِّیَادَةُ کہ ربا کا لغوی معنی زیادتی ہے۔ خواہ یہ زیادتی کسی چیز میں خود بخود ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِهْتَزَّتْ وَرَبَتْ (پارہ ۲۴ سورۃ حم السجدہ آیت ۳۹) کہ زمین پر بارش نازل ہونے کی وجہ سے زمین تازہ ہوئی اور ابھری۔ یا وہ زیادتی مقابلہ میں ہو جیسا کہ ایک درہم کو دو درہموں کے بدلہ میں بیچنا۔ (اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۵۲۲) اور ربا کے اصطلاحی معنی کے بارہ میں علامہ عینیؒ فرماتے ہیں قَالَ اَصْحَابُنَا اَلرِّبٰوا فَضْلُ مَالٍ بِلَا عِوَضٍ فِیْ مُعَاوَضَةِ مَالٍ بِمَالٍ (عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۱۹۹) یعنی نقدی کا نقدی سے تبادلہ ہو تو بلا عوض مال کی زیادتی کا

نام ربا ہے۔ اور ربا کی یہی تعریف ہدایہ ج ۳ ص ۵۳ کے حاشیہ نمبر ۲۰ میں کی گئی ہے جیسا کہ کوئی آدمی ایک درہم کو دو درہموں کے بدلے بیچے تو جو زائد درہم ہے وہ ربا ہوگا۔ پھر ربا کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) رِبٰو نَسِیْئَۃً (۲) رِبٰو الْفَضْلِ ۔ ربا نسیئہ کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو ادھار دے کر مدت گزر جانے کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ کرتے جانا جیسا کہ جاہلیت کے دور میں تھا اور آج کل بینکاری نظام بھی اسی طرح ہے۔ یہاں تک کہ دس روپے قرض لیے ہوئے بڑھتے بڑھتے کئی سو گنا تک بڑھ جاتے ہیں۔ اور حضرت علیؓ کی روایت ہے کُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفِعَةً فَهُوَ رِبًا (الجامع الصغیر للسیوطی ص ۳۹۴ حدیث نمبر ۶۳۳۶) امام سیوطیؒ نے اگرچہ اس روایت کو ضعیف کہا ہے مگر اس کے مطابق بعض صحابہ اور تابعین کے عمل سے اس کی تائید ہوتی ہے اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اَلسِّرَاجُ الْمُنِیْر میں عزیزیؒ نے اس کے متعلق یہ الفاظ لکھے ہیں۔ قال الشیخ حَدِیْثٌ حَسَنٌ لِغَیْرِہٖ یعنی یہ حدیث حَسَن لِغَیْرِہٖ ہے کیونکہ دوسری روایات و آثار سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ بہرحال یہ روایت محدثین کے نزدیک صالح للعمل ہے۔ (مسئلہ سود ص ۱۰)

اور رِبَا الْفَضَل کا مطلب یہ ہے کہ درہم کو درہم کے بدلے اور دینار کو دینار کے بدلے کمی بیشی کے ساتھ بیچنا۔ اس کی ممانعت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَبِیْعُوا الدِّیْنَارَ بِالدِّیْنَارَیْنِ وَلَا الدِّرْهَمَ بِالدِّرْهَمَیْنِ (مسلم ج ۲ ص ۲۴) "بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم ایک دینار کو دو دیناروں کے بدلہ میں اور ایک درہم کو دو درہموں کے بدلہ میں نہ بیچو۔"

سود کی مختلف شکلیں

اور اسی طرح احناف کے نزدیک کیلی اور موزونی چیزوں میں جبکہ جنس ایک ہو تو ان میں کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ ربا ہوگا۔ اور اس میں اس کے اعلیٰ اور ادنیٰ ہونے کا اعتبار نہیں ہے۔ اگر ایسی صورت پیش آجائے کہ اعلیٰ گندم کو ادنیٰ گندم کے بدلہ میں فروخت کرنا ہو تو اعلیٰ گندم کی بیع الگ کر لی جائے اور جب اس کی بیع مکمل ہو جائے تو پھر ادنیٰ کی بیع علیحدہ کر لی جائے۔ اسی طرح صراف (زرگر) حضرات جو گاہک سے پرانا زیور لے کر اس سے کم مقدار میں اس کو زیور دیتے ہیں تو سونے کی سونے کے بدلے اور چاندی کی چاندی کے بدلے کمی بیشی سود ہوگی۔ ان کے لیے بھی یہی صورت ہے کہ گاہک کے زیور کو پہلے نقدی کے بدلہ میں خرید لیں اور پھر اپنا زیور ان کو نقدی کے بدلے میں علیحدہ بیچیں تا کہ سود سے بچ

جائیں۔ اور اس پر وہ روایات دلالت کرتی ہیں جن میں آتا ہے کہ حضرت بلالؓ نے دو صاع گھٹیا کھجوریں دے کر ایک صاع اعلیٰ کھجوریں خریدیں تو آپ ﷺ نے منع فرمایا اور فرمایا کہ اگر اعلیٰ اور ادنیٰ کے تبادلہ کی صورت پیش آجائے تو ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ بیع کر لیا کرو۔ پہلے اپنی چیز بیچو اور پھر دوسری خرید لو جیسا کہ مسلم ج ۲ ص ۲۹ میں ہے۔

لاٹری اور بیمہ کا حکم

لاٹری اور معمہ بازی بھی سود ہی کی شکلیں ہیں۔ اس لیے کہ لاٹری میں لاٹری جاری کرنے والے کو اور اس آدمی کو جس نے بازی جیتی ہو اس کو فائدہ پہنچتا ہے جبکہ باقی لوگوں کی رقم ضائع ہو جاتی ہے جنہوں نے فیس کی صورت میں رقم جمع کرائی ہوتی ہے اور بعض لوگ بظاہر بغیر فیس کے معمے شائع کرتے ہیں مگر وہ بھی معمہ فارم یا اخبارات کے ذریعہ سے اس کو بیچ کر ایک طریقہ سے فائدہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اسی طرح بیمہ جان کا ہو یا مال کا دونوں ناجائز ہیں۔ مال کے بیمہ میں یا تو سود پایا جاتا ہے یا جوا۔ اس لیے کہ بیمہ کرانے والے کو جو سالانہ رقم دی جاتی ہے وہ اس رقم کی وجہ سے دی جاتی ہے جو اس نے جمع کرائی حالانکہ وہ رقم بھی محفوظ بتائی جاتی ہے تو یہ رقم اس کو زائد ملی جو کہ سود ہے۔ اسی طرح اگر بیمہ کرانے والا پوری قسطیں ادا کرنے سے پہلے مرگیا یا اس کو نقصان ہوگیا تو اس کو جو رقم ملتی ہے تو وہ رقم کمپنی محض اپنی شرائط کی وجہ سے دیتی ہے حالانکہ اس کی رقم سے کمپنی نے اتنا فائدہ نہیں اٹھایا ہوتا اور یہی جوا ہے۔

اور اگر جان کا بیمہ ہو تو اس میں رشوت پائی جاتی ہے اس لیے کہ اسلام میں آزاد انسانی جان مَالِ مُتَقَوَّمْ نہیں ہے کہ اس کو عوض یا خرید و فروخت کے بدلے استعمال کیا جا سکے حالانکہ معاملات میں دونوں طرف سے ایسی چیزوں کا ہونا ضروری ہے جو عوض بن سکیں اور جو چیز کسی مال منتقوم کے عوض کے بغیر دی جائے اسی کو رشوت کہتے ہیں۔ اس لیے بیمہ خواہ جان کا ہو یا مال کا اس کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اور پرائز بانڈ بھی ناجائز ہیں۔ اس سلسلہ میں مولانا محمد تقی عثمانی دام مجدہم کے فقہی مقالات کا مطالعہ فرمائیں۔

سود کے بارے میں وعید

سود کی حرمت اور اس پر سخت تشدید کا اندازہ اس آیت سے کر لیں جس میں آتا ہے کہ اگر تم سود سے باز نہیں آتے تو فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ (سورۃ البقرہ آیت

۲۷۹) "اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔" اور حضور علیہ السلام نے سود لینے، دینے والے اور اس کے موکل اور اس کے شاہد اور کاتب پر لعنت فرمائی ہے۔ (اور یہ اس کی حرمت پر دلیل ہے۔ اور حضرات فقہاء کرامؒ نے فرمایا ہے کہ ہر ایک پر لعنت اس کے جرم کے لحاظ سے درجہ بدرجہ ہوگی۔ (الکوکب الدری ج ۱ ص ۳۰۱) اسی سے بینک یا دیگر سودی کاروبار کرنے والے اداروں کی ملازمت کا حکم معلوم کیا جا سکتا ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

امیر یمانیؒ نے سبل السلام ج ۳ ص ۸۴۳ میں ایک اشکال پیش کر کے اس کا جواب دیا ہے۔ اشکال یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے پروردگار سے دعا فرمائی کہ پروردگار میں جس کے بارہ میں بد دعا کروں یا اس پر لعنت کروں تو تو اس کو اس کے حق میں رحمت بنا دے تو سود والے پر بھی حضور علیہ السلام نے لعنت فرمائی ہے تو اس لعنت سے اس کی حرمت تو ثابت نہیں ہوتی تو اس کا جواب یہ دیا کہ یہ دعا آپؐ نے فرمائی کہ اگر میں غضب کی حالت میں کسی پر بد دعا کروں یا لعنت کروں تو اس کو رحمت بنا دینا۔ یہ ایسے آدمی کے بارہ میں نہیں ہے جو واضح حرام کا مرتکب ہو اور اس پر آپ نے لعنت فرمائی ہو۔ اور سود سے باز نہ آنے والوں کو تو اللہ تعالیٰ نے اپنے اور اپنے رسول کے ساتھ جنگ کا چیلنج دیا ہے۔ تو ایسی صورتیں اس دعا سے خارج ہوں گی۔

اَکَلِ رِبَا میں اَکَل کی قید اتفاقی ہے اس لیے کہ اکثر سود لے کر آدمی کھاتا ہے ورنہ اگر کوئی آدمی کھاتا نہیں صرف لیتا ہے تب بھی ممنوع ہے۔

اور سود کی حرمت اور اس کے بارہ میں تشدیدی حکم کا اندازہ اس حدیث کے الفاظ سے کر لیں جس میں آتا ہے اَلرِّبَا ثَلَاثَةٌ وَّسَبْعُوْنَ بَابًا اَيْسَرُهَا مِثْلُ اَنْ يَّنْكِحَ الرَّجُلُ اُمَّهٗ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ربا کے تہتر درجے ہیں۔ ان میں سے ادنیٰ درجہ کا گناہ اس کے برابر ہے کہ آدمی اپنی ماں سے نکاح کرے۔ امام ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت علیٰ شرط البخاری ومسلم ہے۔ (مستدرک ج ۲ ص ۳۷)

بَابُ مَا جَاءَ فِي التَّغْلِيْظِ فِي الْكِذْبِ وَالزُّوْرِ وَنَحْوِهٖ

(جھوٹ اور غلط بیانی کے بارے میں وعید کا بیان)

کذب اور زور عام حالات میں بھی ممنوع ہیں اور جب ان کے ذریعہ سے کسی

دوسرے کو نقصان پہنچتا ہو تو اس کی ممانعت اور بھی سخت ہو جاتی ہے۔ اس لیے بیع کے باب میں ان کو ذکر کیا جاتا ہے کیونکہ عام طور پر تاجر حضرات اپنا سودا بیچنے کے لیے بکثرت اس کا ارتکاب کرتے ہیں حالانکہ ان کی وجہ سے بیع میں سے برکت اٹھ جاتی ہے جیسا کہ بخاری ص ۲۷۹ ج ا کی روایت ہے وَاِنْ کَتَمَا وَکَذِبَا مُحِقَتْ بَرَکَۃُ بَیْنِھِمَا کہ اگر بائع اور مشتری میں سے کوئی سودے کا عیب چھپائے اور جھوٹ بولے تو ان کے درمیان برکت ختم کر دی جاتی ہے۔

بعض حضرات نے کہا کہ کذب اور زور دونوں مترادف ہیں اس لیے ان کے نزدیک والزور میں عطف تفسیری ہے اور بعض حضرات کے نزدیک کذب کا تعلق قول سے ہے اور زور عام ہے اس لیے کہ زور کہتے ہیں حق کے راستہ سے تجاوز کرنے کو اور یہ قول سے بھی ہو سکتا ہے اور عمل سے بھی۔ قَوْلُہٗ اَلْکَبَائِرُ اَلْاِشْرَاکُ بِاللّٰہِ الخ۔ کبائر صرف یہی نہیں ہیں جو اس روایت میں بیان کیے گئے ہیں بلکہ اور بھی ہیں۔ حضرت مولانا سید انور شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت میں کبائر کی سات سو تک کی تعداد بتائی گئی ہے۔ (العرف الشذی ج ا ص ۳۸۴)

بَابَ مَا جَاءَ فِي التُّجَّارِ وَتَسْمِيَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِيَّاهُمْ
(تاجروں نیز حضور علیہ السلام کی طرف سے ان کا نام رکھنے کا بیان)

عَنْ قَيْسِ بْنِ اَبِيْ غَرْزَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ الخ حضور نبی کریم ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ اگر کسی جگہ یا کسی فرد کا نام اچھا نہ سمجھتے تو اس کو تبدیل فرما دیتے تھے۔ تاجروں کو سِمْسار کہا جاتا تھا جس کی جمع سَمَاسِرَۃٌ آتی ہے سِمْسار کا معنی ہے دَلَّال۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۲۳۶) میں النہایہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سِمْسار اس کو کہتے ہیں جو بائع اور مشتری کے درمیان واسطہ بن کر بیع کو پورا کرتا ہے اور سمسرہ بیع اور شراء کو کہتے ہیں اس نام کی بہ نسبت تاجر اچھا نام تھا اس لیے آنحضرت ﷺ نے بیع اور شراء کرنے والے کو تاجر کا نام دیا اور تاجر صحابہ نے اس نام کو پسند کیا جیسا کہ ابوداؤد ج ۲ ص ۱۱۲ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں فَسَمَّانَا بِاسْمٍ هُوَ اَحْسَنُ مِنْهُ الخ صحابی فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے رائج نام کی بہ نسبت اچھے نام کے ساتھ ہمیں پکارا۔

اور حضرت مولانا علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دلالی

جائز ہے اور ہماری فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اگر عرف میں یہ رواج ہو تو دلائل بائع یا مشتری یا دونوں سے اجرت لے سکتا ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ اس میں اختلاف ہے کہ تجارت افضل ہے یا زراعت اور ہمارے نزدیک تجارت افضل ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ علامہ ابن حجرؒ کو لسان المیزان میں قیس بن ابی غرزہ صحابی کے نام میں غلطی لگی ہے انہوں نے عزرہ بن ابی قیس کہا ہے حالانکہ وہ تو صحابی نہیں ہے۔ (العرف الشذی ص ۳۸۴)

قَوْلَهٗ اِنَّ الشَّیْطَانَ وَالْاِثْمَ یَحْضُرَانِ الْبَیْعَ فَشُوْبُوْا بَیْعَکُمْ بِالصَّدَقَۃِ الخ

اس میں اَلْاِثْم سے مراد وہ اِثْمُ (گناہ) ہے جس میں کسی دوسرے کا حق ضائع نہ ہوا ہو یا اس سے مراد وہ اثم ہے جو بِالْقَصْدِ وَالْاِرَادَہ نہ ہو بلکہ غفلت وغیرہ سے ہو جائے اور اس کا پتہ بھی نہ چلے کیونکہ جان بوجھ کر ایسے اثم کا ارتکاب کرنے والا جس میں دوسرے کا حق دبانے والا ہو تو ایسے اثم کی تلافی صدقہ سے نہیں ہوگی بلکہ صدقہ اس اثم کی تلافی کرتا ہے جس میں ارادہ اور نیت کا دخل نہ ہو اور حدیث کا اطلاق اسی صورت پر ہے۔ اگر بیع کے بعد دوسرے کے حق کے ضیاع کا علم ہو جائے اور اس آدمی کا علم بھی ہو تو صاحب حق تک اس کا حق پہنچانا ضروری ہے۔ مثلاً بائع نے مشتری کو سودا دیا اور تولتے وقت اس نے پورے اعتماد اور یقین سے سودے کا وزن کیا مگر بعد میں اس کو علم ہوا کہ باٹ رکھنے میں غلطی ہوگئی ہے اور مشتری کو سودا کم گیا ہے تو اس کو باقی سودا پہنچانا ضروری ہے۔ اسی طرح اگر سودے کا بل بناتے وقت بائع نے پورے اعتماد اور یقین سے بل بنایا اور رقم مشتری سے وصول کرلی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ بل بنانے میں غلطی لگ گئی ہے اور مشتری سے رقم زیادہ وصول کرلی گئی ہے تو زائد رقم مشتری تک پہنچانا ضروری ہے۔ یہ اِثْم صدقہ کر دینے سے دور نہیں ہوگا۔ اگر مشتری معلوم نہ ہو تو انتظار کرے اگر کسی وقت مل جائے تو اس کو دے دے اور جب یقین ہو جائے کہ اب وہ مشتری نہیں ملے گا تو جتنی رقم زائد وصول کرلی گئی ہے اس رقم کا صدقہ کرے جیسا کہ گم شدہ چیز مل جانے پر ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر مشتری کو مبیعہ کی زائد وصولی یا طے شدہ ثمن کی کم ادائیگی کا علم ہو جائے تو اس کا بھی یہی حکم ہے اور حضرت گنگوہیؒ نے اسی جیسا مفہوم بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ تاجر کو صدقہ کا اس لیے فرمایا گیا ہے تا کہ اس کو عقود میں مسامحت کی علادت بن جائے اور اسی طرح جب وہ ہر سودے میں ایک مقدار صدقہ کی اپنے آپ پر مقرر کرلے گا تو اس کی بیع اور مال میں برکت ہوگی اور نیت و ارادہ کے بغیر اس کے ہاتھ سے جو کوتاہی جلد بازی وغیرہ کی وجہ سے

ہو گئی ہو تو اس صدقہ سے اس کی تلافی ہو جائے گی۔ (اَلْكَوْكَبُ الدَّرِيّ ص ۳۵۴)

امانت دار تاجر کا درجہ

قَوْلُهُ اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ الخ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ تجارت میں صدق اور امانت انبیاء کرام علیہم السلام کے افعال میں سے ہے تو جب کوئی آدمی انبیاء کرام علیہم السلام جیسے افعال کرتا ہے تو یہ اس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ یہ ان کے ساتھ ہو۔ (اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۲) اس سے صحیح طریقہ پر تجارت کرنے والے تاجر حضرات کا مقام واضح ہو جاتا ہے۔ نیز اس سے مومن تاجر مراد ہیں اس لیے کہ ایمان کے بغیر تو کوئی عمل قابل قبول ہی نہیں ہے۔ اسی لیے اس باب کی دوسری روایت جو حضرت رفاعہؓ سے ہے اس میں یہ الفاظ ہیں اِنَّ التُّجَّارَ يُبْعَثُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فُجَّارًا اِلَّا مَنِ اتَّقَى اللّٰهَ وَبَرَّ وَصَدَقَ کہ قیامت کے دن سارے کے سارے تاجر گنہگار اٹھائے جائیں گے سوائے ان کے جو اللہ سے ڈرتے رہے اور انہوں نے نیکی کی اور سچ بولتے رہے۔ ایمان کے بغیر تو تقویٰ ہو ہی نہیں سکتا اس لیے مع النبین والی بشارت صرف مومن تاجروں کے لیے ہی ہے کہ ایسے تاجروں کو انبیاء کرام علیہم السلام کی مَعِیَّت نصیب ہوگی۔ اگرچہ وہ ان کے مرتبہ میں نہ ہوں گے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْمَنْ حَلَفَ عَلٰى سِلْعَتِهٖ كَاذِبًا
(سودے پر جھوٹی قسم کھانے کا بیان)

قَوْلُهُ ثَلَاثَةٌ لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اس میں نظر شفقت مراد ہے ورنہ تو اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز بھی او جھل نہیں ہے۔

اَلْمَنَّانُ ۔ علامہ کشمیریؒ المنان کے دو معانی بیان کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ کسی کو کوئی چیز دے کر بعد میں احسان جتائے۔ اور دوسرا معنی یہ کہ کیل اور وزن میں کمی کرے اور فرماتے ہیں وَهٰذَا اَصَحُّ کہ اس مقام میں یہی معنی زیادہ صحیح ہے۔

اَلْمُسْبِلُ اِزَارَهٗ ۔ یعنی اپنی ازار کو ٹخنوں سے نیچے تک لٹکانے والا۔ یہی حکم ہے شلوار وغیرہ کا۔ احناف کے نزدیک ہر حالت میں اسبال ممنوع ہے اور شوافع حضرات کے نزدیک اس وقت ممنوع ہے جبکہ تکبر کی وجہ سے ہو اور وہ ان روایات سے دلیل پکڑتے ہیں جن میں الخیلاء کی قید ہے اور وہ اس قید کو احترازی مانتے ہیں کہ تکبر ہوگا تو منع ہے ورنہ اسبال

میں کوئی حرج نہیں اور احناف کے نزدیک یہ قید واقعی ہے اور ہر حال میں اسبال ممنوع ہے۔
اس پر شمائل ترمذی ص ۹ کی وہ روایت دلالت کرتی ہے جس میں حضور علیہ السلام نے حضرت عبید بن خالد المحاربیؓ کو آواز دے کر فرمایا' اِرْفَعْ اِزَارَکَ کہ اپنی تہہ بند کو اونچا کرو۔ تو جب انہوں نے عذر پیش کیا کہ اِنَّمَا هِیَ بُرْدَۃٌ مَلْحَاءُ ' یہ تو ملحاء چادر ہے یعنی اس چادر کے باندھنے کا طریقہ ہی یہ ہے۔ یا یہ کہ یہ تو معمولی چادر ہے اگر یہ زمین پر لگ کر خراب بھی ہو جائے تو کوئی بات نہیں ہے تو آپؐ نے فرمایا اَمَا لَکَ فِیَّ اُسْوَۃٌ کیا تیرے لیے میرے اندر نمونہ نہیں ہے یعنی تجھے چادر میری طرح باندھنی چاہیے۔ اس صحابیؓ نے وہ چادر تکبر سے تو نہیں باندھی تھی مگر پھر بھی آپ نے منع فرمایا۔ حضرت ابوبکرؓ کا پیٹ چونکہ کچھ بڑھا ہوا تھا بار بار چادر نیچے ہو جاتی تھی اس لیے آپ ﷺ نے ان کو اس عذر کی وجہ سے اجازت دے دی تھی۔

وَالْمُنَفِّقُ سِلْعَتَہٗ بِالْحَلْفِ الْکَاذِبِ۔ اور اپنے سودے کو جھوٹی قسم کے ساتھ بیچنے والا بھی اللہ تعالیٰ کی نظر شفقت سے محروم رہے گا۔

بَابُ مَا جَاءَ فِی التَّبْکِیْرِ بِالتِّجَارَۃِ
(تجارت کے لیے صبح جلدی نکلنے کا بیان)

جس طرح اللہ تعالیٰ نے بعض مقامات کو بعض پر اور بعض افراد کو بعض پر فضیلت دی ہے اسی طرح بعض اوقات کو بھی بعض پر فضیلت دی ہے۔ اور حضور علیہ السلام نے اپنی امت کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ پروردگار میری امت کے لیے دن کے اول حصہ میں برکت عطا فرما۔ حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ یہ وقت ہر چیز کے لیے برکت کا ہے خواہ دینی معاملہ ہو یا دنیاوی۔

اور بیہقی کی روایت میں ہے حضرت فاطمہؓ فرماتی ہیں کہ میں صبح کی نماز پڑھ کر سوئی ہوئی تھی کہ حضور علیہ السلام نے اپنے پاؤں مبارک کے ساتھ ٹھوکر لگا کر جگایا اور فرمایا اے بیٹی اللہ تعالیٰ طلوع فجر اور طلوع شمس کے درمیان لوگوں میں رزق تقسیم فرماتا ہے تو تو غافل نہ ہو اور اپنے رب کا رزق لینے کے لیے اٹھ حاضر ہو۔

بُکُوْرِهَا ۔ اس میں بکور کی اضافت ھا کی طرف ادنیٰ مناسبت کی وجہ سے ہے۔
قَوْلُہٗ فَاَثْرٰی وَکَثُرَ مَالُہٗ ۔ اس میں وَکَثُرَ مَالُہٗ میں واؤ عطف تفسیر کے لیے ہے اور

کَثُرَ مَالُہٗ تفسیر ہے اَثْرٰی کی۔ یعنی حضرت عروہؓ تاجر تھے اور وہ دن کے اول حصہ میں تجارت کرتے تھے تو آپ ﷺ کی دعاء کی برکت سے وہ صاحب ثروت ہوگئے یعنی ان کا مال بکثرت ہوگیا۔

بَابُ مَا جَآءَ فِی الرُّخْصَةِ فِی الشِّرَآءِ اِلٰی اَجَلٍ

(مقررہ مدت کے وعدہ پر ادھار سودا لینے کا بیان)

حضرت کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ بیع ثمن مُؤَجَّلْ (ادھار) کے ساتھ ہو یا ثمن مُعَجَّلْ (نقد) کے ساتھ دونوں طرح درست ہے۔ مگر یہ اس وقت ہے جبکہ صلب عقد میں غیر متعین تاخیر کو ثمن کے ساتھ شرط قرار نہ دیا ہو اور مبارک پوریؒ صاحب تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۲۲۸ میں فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے باب اس طرح قائم کیا ہے بَابُ شِرَاءِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلّم بِالنَّسِیْئَۃِ کہ حضور علیہ السلام نے ادھار بھی سودا خریدا ہے اور حافظ ابن حجرؒ فتح الباری ج ۴ ص ۳۰۲ میں فرماتے ہیں کہ شاید امام بخاریؒ نے یہ باب قائم کرکے اس خیال کو رفع کرنا چاہا ہے کہ حضور علیہ السلام ادھار سودا نہیں خریدتے تھے۔ یہ باب قائم کرکے انہوں نے ظاہر کیا کہ حضور علیہ السلام ادھار بھی سودا خریدتے تھے۔ اور ابن بطالؒ نے فرمایا کہ ادھار سودا خریدنا بالاجماع جائز ہے۔

حضرت گنگوہیؒ الکوکب الدری ص ۳۵۴ میں فرماتے ہیں کہ ایجاب و قبول کے بعد اگر مشتری نے کہا کہ ثمن بعد میں دوں گا تو خواہ اجل معلوم ہو یا مجہول ہو' ہر صورت میں بیع درست ہوگی۔ اور اگر اس نے انعقاد بیع سے پہلے ہی کہہ دیا کہ میں ثمن بعد میں دوں گا اور سودا فی الحال لیتا ہوں تو اگر اجل معلوم ہو تو بیع درست ہے یعنی کہتا ہے کہ دس دن بعد رقم دے دوں گا۔ ورنہ بیع فاسد ہے اس لیے کہ یہاں یہ اجل ثمن کا حصہ بن گئی ہے اور اجل مجہول ہونے کی وجہ سے ثمن کا مجہول ہونا لازم آیا۔ اور جب ثمن مجہول ہو تو بیع فاسد ہوتی ہے اور صاحب ہدایہ نے ج ۳ ص ۳۷ میں فرمایا کہ ہر ایسی شرط جس کا عقد تقاضہ نہ کرے یعنی عقد سے زائد ہو اور اس شرط کی وجہ سے بائع یا مشتری میں سے کسی ایک کو یا مبیعہ کو فائدہ پہنچتا ہو تو اس قسم کی شرط لگانا جائز نہیں ہے۔ مثلاً بائع کوئی غلام مشتری کے ہاتھ بیچتا ہے کہ میں اس شرط پر تجھے دیتا ہوں کہ تو آگے اس کو نہ بیچے تو اس میں غلام کا فائدہ ہے ر عقد اس کا تقاضہ نہیں کرتا تو ایسی شرط درست نہیں ہے۔ اسی کے پیش نظر حضرت مدنیؒ

کی تقریر ترمذی ص ۶۵۲ میں لکھا ہے کہ اگر یہ اجل صلب عقد میں ہو اور غیر معین ہو تو اس قسم کی بیع درست نہیں ہے۔

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۵ میں فرماتے ہیں کہ علامہ ابن حزمؒ وغیرہ اہل ظاہر کے نزدیک میسرہ (آسانی سے مشتری کو رقم مہیا ہو جانے) تک بیع جائز ہے خواہ بیع میں اجل مجہول ہو اور صلب عقد میں ہو۔ مولانا عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ علامہ ابن حزمؒ وغیرہ اس بات کو بھول گئے ہیں کہ اگر اجل مجہول کے باوجود بیع درست ہوتی تو بیع سلم میں بدرجہ اولیٰ درست ہوتی حالانکہ وہاں بالاتفاق اجل مجہول درست نہیں ہے۔ اور علامہ ابن حزمؒ وغیرہ ترمذی شریف ج ۱ ص ۱۴۶ کی اس روایت سے دلیل پکڑتے ہیں جس میں ام المومنین حضرت عائشہؓ نے حضور علیہ السلام سے درخواست کی تھی لَوْ بَعَثْتَ اِلَیْہِ فَاشْتَرَیْتَ مِنْہُ ثَوْبَیْنِ اِلَی الْمَیْسَرَۃِ کہ کاش آپ کسی کو اس یہودی کے پاس بھیج کر دو کپڑے منگوالیں اور ثمن کی ادائیگی میسرہ تک موخر کر دیں۔

مولانا عثمانیؒ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ یہ اَجَل عقد میں مشروط نہ تھی بلکہ بیع حالی کر کے اس سے ثمن کی ادائیگی مَیْسَرَہ تک مؤخر کرنا تھا اور یہ بالاتفاق جائز ہے۔

اور اس کا قرینہ روایت کے الفاظ میں موجود ہے کہ یہودی نے یہ کہا اِنَّمَا یُرِیْدُ اَنْ یَذْھَبَ بِمَالِیْ اَوْ دَرَاھِمِیْ کہ (معاذ اللہ) محمد (ﷺ) یہ چاہتا ہے کہ میرا مال اور میرے دراہم لے جائے۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ جب اس کا تعلق ثمن کے ساتھ ہو جاتا اور اسی کے ضیاع کے بارہ میں اس نے یہ کہا۔ اور علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ اس یہودی کا نام ابو الشحم تھا (عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۱۸۲) اور بیہقی ص ۳۷ ج ۶ کی روایت میں الفاظ ہیں رَھَنَ دِرْعًا لَہٗ عِنْدَ اَبِی الشَّحْمِ الْیَھُوْدِیِّ کہ حضور ﷺ نے اپنی درع ابو الشحم یہودی کے پاس بطور رہن رکھی۔ امام بخاریؒ نے جس طرح باب باندھا ہے اس سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ اجل صلب عقد میں نہ تھی بلکہ عقد کے بعد میسرہ تک اس رقم کی ادائیگی کو موخر کرنا تھا۔ یہودی کے ساتھ بیع کے معاملہ سے یہ مسئلہ بھی واضح ہوگیا کہ غیر مسلموں کے ساتھ بیع و شراء جائز ہے۔

قَوْلُہٗ قِطْرِیَّیْنِ ۔ مبارکپوریؒ تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۲۲۸ میں النہایہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ قطری قاف کے کسرہ کے ساتھ ہے اور یہ ایسی چادر کو کہتے ہیں جس میں سرخ رنگ اور بیل بوٹے ہوں اور اس میں کچھ کھردرا پن ہو یعنی ملائم نہ ہو۔

قَوْلُہٗ فَقَالَ لَسْتُ اُحَدِّثُکُمْ حَتّٰی تَقُوْمُوْا اِلٰی حَرَمِیِّ بْنِ عُمَارَۃَ ۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ جب حضرت شعبہؒ سے اس روایت کے بیان کرنے کا مطالبہ کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ جب تک میرے استاذ زادے حرمی بن عمارہ کے سر کو بوسہ دے کر اس کے ساتھ عقیدت کا اظہار نہیں کرتے اس وقت تک میں تمہارے سامنے یہ روایت بیان نہیں کروں گا اور حرمی اس محفل میں موجود تھے۔

قَوْلُہٗ اِھَالَۃٌ سَنِخَۃٌ ۔ سَنِخَۃٌ سے مراد بدبودار نہیں ہے کیونکہ اس کو تو کوئی سلیم الفطرت پسند نہیں کرتا حالانکہ حضور علیہ السلام تمام مخلوق میں زیادہ سلیم الفطرت تھے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ کچھ عرصہ پڑے رہنے کی وجہ سے اپنی پہلی حالت پر نہ رہتی اس لیے کہ تازہ چیز کا ذائقہ اور ہوتا ہے اور کچھ دیر پڑے رہنے والی چیز کا ذائقہ تازہ چیز جیسا نہیں ہوتا مگر آپؐ اس کا خیال نہیں کرتے تھے بلکہ بلا تکلف اس کا استعمال فرمالیتے تھے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِیْ کِتَابَۃِ الشُّرُوْطِ (شرائط نامہ لکھنے کا بیان)

حضرت مدنیؒ کی تقریر ترمذی ص ۶۵۴ میں ہے کہ اگر ایسی شرط ہو جس کا عقد تقاضہ کرتا ہے تو اس شرط کا لکھنا جائز ہے مثلاً" اگر بائع کو خطرہ ہو کہ مشتری ثمن نقد نہیں دے گا تو یہ شرط کرنا کہ ثمن نقد ہو یا مشتری کو خطرہ ہو کہ بائع مبیعہ کا قبضہ نہیں دے گا یا یہ خطرہ ہو کہ مبیعہ میں کچھ نقص ہوگا تو یہ شرط کرنا جائز ہے اور اس کا لکھنا جائز ہے کہ مبیعہ میں کوئی نقص نہیں ہے اور اگر ایسی شرط ہو جس کا عقد تقاضہ نہیں کرتا تو ایسی شرط لگانا اور لکھنا جائز نہیں ہے۔ جمہور فقہاء کے نزدیک جائز شروط کا لکھنا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے اور امام ابراہیم نخعیؒ اور عطاء بن ابی رباحؒ وغیرہ کے نزدیک ان کا لکھنا واجب ہے۔ جمہور یہ کہتے ہیں کہ جیسے عقد کے وقت گواہ مقرر کرنا واجب نہیں اسی طرح یہ لکھنا بھی واجب نہیں اور امام ابراہیم نخعیؒ وغیرہ کے نزدیک وَاَشْھِدُوْا اِذَا تَبَایَعْتُمْ کی وجہ سے گواہ مقرر کرنا بھی واجب ہے۔ جمہور یہ کہتے ہیں کہ واشھدوا میں امر استحباب کے لیے ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کی موجودگی میں حضرات صحابہ کرامؓ بغیر گواہ مقرر کیے بیع کرتے تھے اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ گواہ اور کتابت کو واجب قرار دینے کی صورت میں حرج واقع ہوتا ہے اور حرج شرعاً" مدفوع ہے اس لیے یہ واجب نہیں ہیں۔

قَوْلُہٗ اَلَا اُقْرِئُکَ کِتَابًا کَتَبَہٗ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام بائع تھے اور حضرت عداءؓ مشتری تھے۔ اور بخاری

شریف ج ۱ ص ۲۷۹ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام مشتری اور حضرت عداءؓ بائع تھے۔ اس کے بارہ میں حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ الفاظ اور مفہوم کے پیش نظر میرے نزدیک اولیٰ یہ ہے کہ آپ ﷺ بائع تھے اس لیے کہ شروط کی کتابت بائع کی جانب سے ہوتی ہے اور یہاں بھی کتابت آپ ﷺ کی جانب سے ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ آپ بائع تھے۔ (العرف الشذی ص ۳۸۵)

ایک اشکال اور اس کا جواب

حضرت گنگوہیؒ نے ایک اشکال ذکر کر کے اس کا جواب دیا ہے۔ اشکال یہ ہے کہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضور علیہ السلام نے ہجرت کے بعد کوئی چیز نہیں بیچی یعنی ایسی بیع نہیں کی جس میں نقدی وصول کی ہو تو یہاں آپ کو بائع کیسے قرار دیا جا سکتا ہے تو اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ یہ بیع مقایضہ ہو جس میں کسی جانب سے بھی نقدی نہیں ہوتی بلکہ دونوں جانب سے عروض ہوتے ہیں تو اس صورت میں ہر ایک کو بائع اور مشتری کہا جا سکتا ہے۔ اس بیع سے بیع مقایضہ مراد لینے سے یہ اشکال بھی رفع ہو جاتا ہے کہ آپ بائع کیسے تھے؟ اور یہ اشکال بھی رفع ہو جاتا ہے کہ ترمذی شریف کی روایت میں آپؐ کا بائع اور بخاری شریف کی روایت میں آپؐ کا مشتری ہونا ثابت ہوتا ہے تو جب بیع مقایضہ میں ہر ایک کو بائع اور مشتری دونوں کہا جا سکتا ہے تو پھر کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔ (الکوکب الدری ج ۱ ص ۳۵۵)

بیع مقایضہ کی تعریف

حضرات فقہاء کرام نقدی کو دین اور نقدی کے علاوہ باقی چیزوں کو عین سے تعبیر کرتے ہیں۔ جیسے اگر ایک جانب نقدی اور دوسری جانب سے سامان ہو تو اس کو بَیْعُ الْعَیْنِ بِالدَّیْنِ سے تعبیر کرتے ہیں اور اگر دونوں جانب سے نقدی ہو تو اس کو بَیْعُ الدَّیْنِ بِالدَّیْنِ سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی کو بیع صرف کہتے ہیں اور اگر ایک جانب سے بھی سامان ہو اور دوسری جانب سے بھی سامان ہو نقدی کسی جانب سے نہ ہو تو اس کو بَیْعُ الْعَیْنِ بِالْعَیْنِ سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی کو بیع مقایضہ کہتے ہیں۔

قَوْلُہٗ لَا دَاءَ وَلَا غَائِلَةَ وَلَا خِبْثَةَ ۔ دَاءَ سے مراد جسمانی بیماری اور غائلہ سے مراد کوئی ایسا حیلہ جس کے ذریعہ سے دوسرے کا مال سلب کرنا ہو اور خبثہ سے مراد اخلاقی کمزوری ہے

جیسا کہ غلام کا بھاگ جانا وغیرہ۔

بَابُ مَا جَآءَ فِی الْمِکْیَالِ وَالْمِیزَانِ (ناپ تول کا بیان)

قَوْلُہٗ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم لِاَصْحَابِ الْکَیْلِ وَالْمِیْزَانِ
اگر ایک آدمی اپنے مال کا خود وزن یا کیل کر کے دیتا ہے تو اس کے لیے مستحب ہے کہ وہ وزن یا کیل میں کچھ زیادتی کرے تا کہ مشتری کو مال کم نہ جائے اس صورت میں لاصحاب الکیل والمیزان میں بلا واسطہ عاقد مراد ہے اور اس کے لیے زِنْ وَارْجَحْ کا حکم بطور استحباب کے ہوگا جیسا کہ ابو داؤد شریف ص ۱۱۸ ج ۲ کی روایت میں ہے۔ اور اگر کیل یا وزن کرنے والا اس چیز کا مالک نہیں بلکہ اس کی ذمہ داری صرف کیل یا وزن کرنے کی ہے تو پھر اگر مالک کی اجازت ہو تو وہ کچھ اضافہ کر سکتا ہے ورنہ بالکل برابر اور صحیح وزن اور کیل اس کی ذمہ داری ہوگی تا کہ نہ بائع کو نقصان ہو اور نہ مشتری کو۔ اور حضور علیہ السلام نے جو وزن کرنے والے کو زِنْ وَارْجَحْ فرمایا تھا تو اس کے بارہ میں حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے جو ثمن ادا کرنا تھا تو وہ شخص اس ثمن کا وزن کر رہا تھا تو آپؐ نے وزن کرنے والے سے فرمایا کہ ثمن کا وزن کرتے وقت اس کا پلڑا کچھ جھکا یعنی مقدار سے کچھ زائد دے دو تا کہ میرے ذمہ بائع کا کوئی حق نہ رہے تو آپؐ نے خود وزن کرنے والے کو اجازت دی تھی اور عاقد اپنے حق میں دوسرے کو زیادہ دے دے تو یہ درست ہے۔ (بذل المجہود ج ۴ ص ۲۴۰)

قَوْلُہٗ اَلْاُمَمُ السَّابِقَۃَ۔ حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کی مختلف برادریوں اور قبائل کا لحاظ رکھ کر امم جمع لایا گیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے علاوہ اور اقوام کو بھی اس جرم کی وجہ سے عذاب دیا گیا ہو جن کی تفصیل ہمیں نہیں بتائی گئی۔ (الکوکب الدری ج ۱ ص ۳۵۶)

بَابُ مَا جَآءَ فِیْ بَیْعِ مَنْ یَّزِیْدَ (نیلامی کی صورت میں بیع کا بیان)

دو روایتوں میں بظاہر تعارض اور اس کا جواب

بیع من یزید سے مراد بیع بصورت نیلامی ہے۔ مسلم شریف ج ۲ ص ۳ کی روایت میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا لَا یَسُمِ الْمُسْلِمُ عَلٰی سَوْمِ الْمُسْلِمِ کہ کوئی مسلمان اپنے بھائی کے سودے پر سودا نہ کرے یعنی اگر وہ سودا کر رہا ہو تو دوسرا آدمی اس کے سودے میں

دخل اندازی نہ کرے۔ اور بیع من یزید کی صورت میں بظاہر اس کے خلاف نظر آتا ہے اس لیے کہ جب ایک آدمی مثلاً ایک درہم کہتا ہے تو دوسرا دو درہم کہہ دیتا ہے تو بظاہر ان دونوں قسم کی روایتوں میں تعارض نظر آتا ہے۔ مگر درحقیقت ان میں کوئی تعارض نہیں ہے اس لیے کہ لَا یَسُمِ الْمُسْلِمَ والی روایت میں یہ ہے کہ بائع اور مشتری جب سودا کر رہے ہوں یعنی ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے ہوں تو دوسرا دخل اندازی نہ کرے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ دونوں ایک بات پر راضی ہو جائیں اور بیع من یزید میں بائع ایک آدمی کے بتائے ہوئے ثمن کو پسند نہ کرتے ہوئے دوسرے کو اس کا ثمن بتانے کی دعوت دیتا ہے۔ اس لیے دونوں قسم کی روایتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے اور پھر لَا یَسُمِ الْمُسْلِمَ کے الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب سودا طے ہو چکا ہو تو دوسرا دخل اندازی نہ کرے اور بیع من یزید میں سودا طے ہی نہیں ہوا ہوتا اس لیے کہ بائع راضی نہیں اور جب تک بائع اور مشتری دونوں راضی نہ ہوں اس وقت تک بیع کا انعقاد ہی نہیں ہوتا لہٰذا دونوں قسم کی روایتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

بیع مَن یزید کا حکم

مبارکپوری صاحبؒ تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۲۳۰ اور علامہ ابن حجرؒ فتح الباری ج ۵ ص ۲۵۸ میں فرماتے ہیں کہ حضرت امام ابراہیم نخعیؒ سے یہ روایت ہے کہ وہ بیع من یزید (نیلامی کی بیع) کو مکروہ قرار دیتے ہیں اور امام اوزاعیؒ اور اسحاق بن راہویہؒ فرماتے ہیں کہ غنیمت کے مال اور وراثت کے مال میں نیلامی کی بیع جائز ہے اس کے علاوہ جائز نہیں ہے اس لیے کہ دار قطنی ج ۳ ص ۱۱ کی روایت حضرت ابن عمرؓ سے اس طرح ہے۔ نَهٰی رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّبِيْعَ اَحَدُكُمْ عَلٰى بَيْعِ اَخِيْهِ حَتّٰى يَذَرَ اِلَّا الْغَنَائِمَ وَالْمَوَارِيْثَ تو جب غنائم اور مواریث نہی سے خارج ہیں تو ان میں یہ بیع درست ہوگی مگر یہ روایت ضعیف ہے۔

اور جمہور یہ فرماتے ہیں کہ بیع من یزید جائز ہے اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ نے جو یہ بیع کی تھی وہ نہ تو غنیمت کا مال تھا اور نہ ہی وراثت کا۔ اس سے علی الاطلاق بیع من یزید کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

اور پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ صرف مشتری کی جانب سے ثمن بتانے کو بیع نہیں کہتے اور یہ ہو سکتا ہے کہ کئی آدمی اس چیز کے ثمن الگ الگ بتائیں اور بائع جس کو پسند کرے

اور اس پر راضی ہو جائے جیسا کہ مسلم شریف ج ۲ ص ۳ کی اس روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں وَلَا يَخْطُبَ عَلٰى خِطْبَةِ اَخِيْهِ کہ کوئی آدمی اپنے بھائی کی منگنی پر منگنی نہ کرے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ منگنی طے ہو جانے کے بعد مداخلت نہ کرے اور اگر طے ہونے سے پہلے کئی آدمی کسی ایک عورت کو پیغام بھیجیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح یہاں بھی بائع کی رضا سے پہلے پہلے کئی حضرات ثمن بتا سکتے ہیں پھر بائع کی مرضی کہ جس پر راضی ہو جائے۔

قَوْلُهٗ بَاعَ حِلْسًا ۔ حضرت علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی ٹاٹ نہیں ہے بلکہ حلس اس کو کہتے ہیں جو بکری کے بالوں سے بٹی ہوئی رسیوں سے بنا ہوا (کمبل) ہو۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي بَيْعِ الْمُدَبَّرِ (مدبر غلام کو بیچنے کا بیان)

تدبیر کا لغوی معنی ہے اَلنَّظَرُ اِلٰى عَاقِبَةِ الْاَمُوْرِ یعنی کاموں کے نتیجہ پر غور کرنا اور اصطلاح میں مدبر اس غلام کو کہتے ہیں جس کو مالک نے یہ کہا ہو کہ تو میرے مرنے کے بعد آزاد ہے یا کہہ دے کہ میں نے تجھے مدبر کیا یا کہہ دے کہ تو مدبر ہے۔ (فتح القدیر ج ۳ ص ۴۱۶)

مدبر کی اقسام اور ان کو بیچنے کے متعلق ائمہ کرام کے اقوال

پھر مدبر کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) مدبر مطلق (۲) مدبر مقید۔ مدبر مطلق وہ ہوتا ہے کہ جس کو مالک نے یہ کہا ہو کہ میرے مرنے کے بعد آزاد ہے۔ اور مدبر مقید وہ ہوتا ہے جس کو مالک نے یہ کہا کہ اگر میں اپنے اسی سفر میں جس سفر پر جا رہا ہوں یا اپنی اسی بیماری میں جس بیماری میں مبتلا ہوں مر گیا تو تو آزاد ہے۔ مدبر مقید کو شرط پائے جانے سے قبل بیچنا بالاتفاق جائز ہے اور مدبر مطلق کے بیچنے میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مدبر مطلق بالکل نہیں بیچا جا سکتا۔ نہ مالک کے مرنے سے پہلے اور نہ اس کی موت کے بعد۔ اور اسی قسم کی ایک روایت امام مالکؒ سے بھی ہے۔ (اوجز المسالک ج ۱۱ ص ۲۱) اور ان سے ایک روایت یہ ہے کہ اگر مالک پر قرض اتنا ہو جو اس غلام کی قیمت سے زائد ہو اور اس آدمی کا اس کے علاوہ کوئی مال نہ ہو تو پھر اس کو بیچا جا سکتا ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس غلام کو مدبر کرنے سے پہلے مالک مقروض تھا تو ایسی حالت میں اس مدبر کو بیچنا جائز ہے ورنہ نہیں۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ خواہ مالک اس غلام کو مدبر قرار دینے سے پہلے مقروض ہو یا

نہ ہو ہر صورت میں اس کو بیچنا جائز ہے۔

امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ جو آدمی اس غلام کو خرید کر آزاد کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو ایسی صورت میں اس غلام کو بیچنا جائز ہے ورنہ نہیں۔

امام ابو حنیفہؒ کی دلیل

امام ابوحنیفہؒ کی دلیل وہ روایت ہے جو دار قطنی ج ۴ ص ۱۳۸ میں حضرت ابن عمرؓ سے ہے کہ اَلْمُدَبَّرُ لَا يُبَاعُ وَلَا يُوهَبُ وَهُوَ حُرٌّ مِنْ ثُلُثِ الْمَالِ ۔ مدبر کو نہ بیچا جا سکتا ہے اور نہ وہ کسی کو ہبہ کیا جا سکتا ہے اور وہ ثلث مال سے آزاد ہوگا۔ اس روایت کی دو سندیں ہیں ایک سند مرفوع ہے مگر وہ کمزور ہے کیونکہ اس میں ایک راوی علی بن ظبیان ضعیف ہے اور دوسری سند حضرت ابن عمرؓ پر موقوف ہے اور یہ سند صحیح ہے۔ اور البدائع ص ۱۲۰ ج ۴ میں ہے کہ مدبر کی بیع کے ناجائز ہونے کے قائلین میں حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ حضرت زید بن ثابتؓ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اور تابعین میں قاضی شریحؒ، مسروقؒ، سعید بن المسیبؒ، عمر بن عبد العزیزؒ اور حسن بصریؒ جیسے حضرات ہیں اسی لیے امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ اگر ان بزرگ ہستیوں کا قول نہ ہوتا تو میں مدبر کی بیع کو جائز قرار دیتا۔

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مالک کی زندگی میں تو اس کو بالکل نہیں بیچا جا سکتا اور مالک کے مرنے کے بعد اگر وہ ثلث مال تک پہنچتا ہو تب بھی وہ آزاد ہو جائے گا اور اگر ثلث مال سے زائد ہو یا مالک کا مال اس غلام کے علاوہ اور کوئی نہ ہو تو ایسی صورت میں یہ غلام سعی کرے گا اور جتنا حق وارثوں کا بنتا ہے ان کو دے گا اور آزاد ہو جائے گا اس کو بیچا نہیں جا سکتا۔

امام شافعیؒ کا استدلال

اور امام شافعیؒ بخاری ص ۲۸۷ ج ۱، ابن ماجہ ص ۱۸۱ اور مسلم ج ۲ ص ۵۴ وغیرہ کی ان روایات سے استدلال کرتے ہیں جن میں ثابت ہوتا ہے کہ ایک آدمی نے غلام کو مدبر کیا اور اس کے سوا اس کا کوئی مال نہ تھا تو حضور علیہ السلام نے اس مدبر کو بیچ دیا۔

اس کا پہلا جواب

ان روایات سے شوافع کا استدلال صحیح نہیں ہے اس لیے کہ ترمذی ص ۲۳۲ ج ا کی

روایت میں فَمَاتَ وَلَمْ یَتْرُکْ مَالًا غَیْرَہٗ کے الفاظ ہیں اور شوافع حضرات کہتے ہیں کہ یہ معاملہ مالک کی زندگی میں پیش آیا اور فمات کے الفاظ اس روایت میں سفیان بن عیینہ کا وہم ہے۔ چونکہ مالک کے مرنے کے بعد کی حالت میں تو شوافع بھی اس غلام کو بیچنے کے قائل نہیں ہیں اس لیے کہ مالک کے مرنے کے بعد وہ مدبر نہیں رہتا بلکہ آزاد ہو جاتا ہے۔ اور بخاری شریف کی روایت میں ہے فَدَفَعَہٗ اِلَیْہِ کہ حضور علیہ السلام نے اس غلام کا ثمن وصول کر کے مالک کو دے دیا اور ابوداؤد شریف ص ۱۹۵ ج ۲ کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا اَنْتَ اَحَقُّ بِثَمَنِہٖ کہ تو اس کے ثمن کا زیادہ حقدار ہے۔

دوسرا جواب

حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ اگر یہ واقعہ مالک کی زندگی میں پیش آیا تو پھر وہ مدبر مقید ہوگا اور اس کا بیچنا احناف کے نزدیک بھی جائز ہے اور اگر مالک کے مرنے کے بعد پیش آیا تو پھر نبی کریم ﷺ نے اس سے سعی کروائی ہوگی اور نعیم بن نحام اس کے ضامن بنے ہوں گے اور راوی نے مجازاً" اس کو بیع و شراء سے تعبیر کر دیا۔ اس لیے کہ غلام کو مدبر کرنا وصیت کی طرح ہے اور وصیت صرف ثلث میں ہی ہو سکتی ہے تو جب مرنے والا مقروض ہو تو اس کے قرضے کی ادائیگی وصیت پر مقدم ہوتی ہے اس لیے اس سے سعی کروا کر اس کے قرض کی ادائیگی کی جائے گی۔ یا یہ مطلب ہے کہ مدبر مطلق کی بیع پہلے جائز تھی بعد میں اس کو منسوخ کر دیا گیا۔ (الکوکب الدری ص ۳۵۶ ج ۱)

تیسرا جواب

اور باقی روایات جن میں مدبر کے بیچنے کا ذکر آتا ہے' وہ روایات بھی مفہوم میں محتمل ہیں اور ان میں کئی احتمالات ہیں۔

۱۔ ہو سکتا ہے کہ وہ آدمی سَفِیْہ یعنی کمزور عقل ہو اور اس نے یہ تصرف کیا ہو اور آپ ﷺ نے اس کے تصرف کو باطل کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے اس کو بیچنے کی اجازت نہ دی بلکہ خود اس کو بیچا اور قاضی کو ایسے حالات میں تصرف باطل کرنے کا حق حاصل ہے۔

۲۔ نبی کریم ﷺ کو عَلَی الاِطْلَاق تصرف باطل کرنے اور دوسروں کی اشیاء میں تصرف کرنے کی اجازت تھی حتی کہ آپ کو یہ بھی حق حاصل تھا کہ کسی آزاد کو بیچ دیتے تو مدبر کا

بیچنا بھی آپ ﷺ کی خصوصیت تھی۔

۳۔ ہو سکتا ہے کہ بیع سے مراد اجارہ ہو اس لیے کہ اہل عرب اجارہ پر بیع کا اطلاق کرتے ہیں اور حضور علیہ السلام نے وہ غلام اجارہ پر دیا ہو تاکہ وہ مال لا کر مالک کو دے کیونکہ وہ محتاج ہے۔ اور دار قطنی ج ۴ ص ۱۳۸ کی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے ایک مدبرہ کی خدمت کو بیچا اور ایک روایت میں ہے کہ فرمایا لَا بَأسَ بِبَیعِ خِدمَةِ المُدَبَّرِ کی مدبر کی خدمت بیچنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۴۔ پہلے آزاد مقروض کو قرض کے بدلے بیچنا جائز تھا اور پھر فَنَظِرَةٌ اِلٰی مَیسَرَةٍ (الآیۃ) کے نزول پر اس کی ممانعت ہو گئی تو ہو سکتا ہے کہ مالک پر قرضہ اسی غلام کی وجہ سے آیا ہو اور اس قرض کے بدلہ میں اس کو بیچا گیا ہو اور یہ بیچنا ممانعت سے پہلے کا واقعہ ہو۔

۵۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مدبر مقید ہو تب ہی مالک کی زندگی میں یہ واقعہ پیش آیا اور مدبر مقید کو تو احناف کے نزدیک بھی بیچا جا سکتا ہے۔

۶۔ دار قطنی ج ۴ ص ۱۳۸ کی راویت میں اَلمُدَبَّرُ لَا یُبَاعُ میں قاعدہ بیان کیا گیا ہے اور باقی روایات میں جزئیات کا ذکر ہے اسی طرح یہ روایت مُحَرِّم ہے اور باقی روایات مبیح ہیں تو اصول حدیث کے مطابق جس روایت میں قاعدہ بیان کیا گیا ہو' اس کو دوسرے روایت پر اور مُحَرِّمْ روایت کو مُبِیح پر ترجیح ہوتی ہے۔ ان جوابات کے ضمن میں دیگر حضرات کے جوابات بھی ہو جاتے ہیں۔

قَولُہٗ اَنَّ رَجُلًا مِنَ الاَنصَارِ علامہ عینیؒ عمدۃ القاری ص ۴۹ ج ۱۲ اور امیر یمانی سبل السلام ص ۷۹۵ ج ۳ اور مبارکپوری صاحبؒ تحفۃ الاحوذی ص ۲۳۰ ج ۲ میں فرماتے ہیں کہ اس آدمی کا نام ابو مذکور تھا اور اس غلام کا نام یعقوب تھا علامہ عینیؒ اور امیر یمانیؒ فرماتے ہیں کہ اس کا ثمن آٹھ سو درہم مقرر ہوا تھا۔

قَولُہٗ فَاشتَرَاہُ نُعَیمُ بنُ النَّحَّامِ بعض روایات میں نعیم بن عبد اللہ آتا ہے اور بعض روایات میں نعیم بن عبد اللہ النحام آتا ہے۔ یہ النحام نَحمَةٌ سے ہے جس کا معنی ہے کھانسنا۔ یہ بھی بکثرت کھانستے تھے اس لیے ان کو نحام کہا جانے لگا۔ تو یہ نحام صفت ہے عبد اللہ کی۔ اور یہ ایک ہی شخصیت ہیں کہیں ان کو مغالطہ سے دو شخصیتیں نہ سمجھ لیا جائے۔

وَهُوَ قَوْلُ الشَّافِعِيِّ کہنے پر امام ترمذیؒ پر اعتراض

حضرت مولانا اصغر حسین صاحبؒ فرماتے ہیں کہ امام ترمذیؒ کا یہ کہنا کہ اس حدیث پر شوافع کا عمل ہے درست نہیں ہے اس لیے کہ شوافع کے نزدیک مدبر کی بیع درست ہے اور مالک کے مرنے کے بعد وہ مدبر نہیں رہتا بلکہ آزاد ہو جاتا ہے اس لیے اس روایت کی تاویل شوافع حضرات کو بھی کرنا پڑتی ہے اور احناف کہتے ہیں کہ یہ حضور علیہ السلام کی خصوصیت تھی۔ (الورد الشذی ص ۲۰۳)

بَابُ مَا جَآءَ فِيْ كَرَاهِيَةِ تَلَقِّي الْبُيُوْعِ

(تجارتی قافلہ کو شہر سے باہر ہی مل کر ان سے مال خرید لینے کی کراہیت کا بیان)

روایات میں الفاظ مختلف ہیں کسی میں ہے لَا تَلَقَّوا الرُّكْبَانَ کسی میں ہے لَا تَلَقَّوا السِّلَعَ کسی میں ہے لَا تَلَقَّوا الْجَلَبَ مگر ان تمام کا مفہوم ایک ہی ہے کہ باہر سے کوئی قافلہ سامان لے کر آرہا ہو اور کوئی آدمی شہر سے باہر ہی قافلہ والوں سے مل کر ان سے سامان خرید لے۔ تلقی البیوع میں البیوع سے یا تو اصحاب البیوع مراد ہیں یا بیوع بمعنی مبیعات ہیں اس لیے کہ آدمی بیع کی ملاقات نہیں کرتا بلکہ اصحاب البیوع کو یا مبیعہ کو جا کر ملتا ہے۔

یہاں تین ابحاث ہیں۔

البحث الاول

کتنی مسافت سے تلقی کی ممانعت ہے۔ اہل ظاہر کے نزدیک علی الاطلاق ممنوع ہے۔ امام بخاریؒ اور ایک روایت امام مالکؒ سے یہ ہے کہ اعلی سوق تک پہنچنے تک ممنوع ہے اور بازار میں قافلہ داخل ہو جائے تو پھر ممنوع نہیں ہے اور امام مالکؒ سے ایک روایت یہ ہے کہ اگر تلقی قریب سے ہو تو بازار میں اس قافلہ کے داخل ہونے تک ممنوع ہے اور اگر تلقی بعید ہو تو پھر ممنوع نہیں ہے اور اس کی مسافت متعین کرنے میں ان کی روایات مختلف ہیں۔ علامہ ابن رشدؒ بدایۃ المجتہد ص ۱۴۴ ج ۲ میں فرماتے ہیں کہ قرب کی حد چھ میل ہے یعنی اگر چھ میل سے زائد کی مسافت ہو تو ان کے نزدیک یہ ممنوع نہیں ہے۔ بعض مالکیہ

نے دو میل اور بعض نے ایک میل کی مسافت کو حدِ قرب قرار دیا ہے۔ اور امام سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ جتنی مسافت میں نماز کے قصر کا حکم آتا ہے اتنی مسافت قرب کی ہے اور اس سے زائد حدِ بُعد ہے۔ اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

امام بخاریؒ اس سلسلہ میں روایات ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں قَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰہِ هٰذَا فِیْ اَعْلَی السُّوْقِ کہ ممانعت کا حکم اعلی سوق یعنی بازار میں داخل ہونے سے پہلے تک ہے (بخاری ج ۱ ص ۲۸۹) اس کے جواب میں امام طحاویؒ نے فرمایا کہ ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں اَنَّہٗ نَھٰی اَنْ یَّتَلَقَّی السِّلَعَ حَتّٰی یَھْبِطَ بِھَا الْاَسْوَاقَ یعنی اس وقت تک تلقی سے منع فرمایا جب تک قافلہ بازار میں اتر نہ جائے تو اس روایت سے اعلیٰ سوق میں تلقی کی ممانعت ہے۔ (طحاوی ج ۲ ص ۱۴۲)

اہل ظاہر ان مطلق روایات سے استدلال کرتے ہیں جن میں کسی قید کا ذکر نہیں ہے۔ اور مالکیہ نے کہا کہ اس میں مقصد اہل سوق کے ساتھ خیر خواہی ہے اس لیے قریب میں اس کا لحاظ رکھا جائے گا اور بعید میں اس کا کوئی لحاظ نہیں ہے۔

البحث الثانی

اگر کوئی آدمی تلقی الرکبان کر کے سودا خرید لیتا ہے تو اس کا حکم کیا ہے؟ اہل ظاہر کے نزدیک اس کی بیع ہی منعقد نہیں ہوتی۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ اس کی بیع مردود ہے امام شافعیؒ کے نزدیک بیع تو ہو جائے گی مگر اس قافلہ کے بازار میں آنے کے بعد بائع کو اختیار ہوگا کہ وہ بیع کو باقی رکھے یا کالعدم قرار دے دے خواہ اس نے بیع کے وقت خیار رکھا ہو یا نہ رکھا ہو۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر شہر والوں کو یا بائع کو اس تلقی کی وجہ سے نقصان ہو تو یہ تلقی مکروہ ہے مگر اس کے باوجود بیع ہو جائے گی اگر بائع نے خیار رکھا ہو تو اس کو خیار ہوگا ورنہ کوئی خیار نہ ہوگا اس لیے کہ وہ بیع کرنے میں خود مختار تھا۔

امام شافعیؒ کی دلیل ۔ امام شافعیؒ اپنے اس نظریہ پر دلیل یہ دیتے ہیں کہ روایت میں ہے فَاِذَا اَتٰی سَیِّدُہُ السُّوْقَ فَھُوَ بِالْخِیَارِ (مسلم شریف ص ۴ ج ۲)

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر خیار نہیں رکھا تو کوئی خیار نہ ہوگا زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ مشتری نے بائع سے دھوکہ کیا ہے تو اس کی وجہ سے خیار تو لازم نہیں آتا۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس خیار سے مراد خِیَارٌ فِی الْاِسْتِرْدَادِ ہے اور اس سے یہ

ثابت ہوتا ہے کہ یہ بیع صحیح ہے اس لیے کہ بیع فاسد کی صورت میں تو خیار ہوتا ہی نہیں۔ (مرقات ص ۶۷ ج ۶) اور علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ اگر تلقی کرنے والے نے قولاً بائع سے دھوکا کیا (یعنی اس کو بھاؤ غلط بتایا) تو بائع کو فسخ کا اختیار ہے اور فعل سے دھوکہ دیا تو دیانتاً اقالہ اور فسخ ہوگا (اس پر جبر نہیں ہو سکتا) (العرف الشذی ص ۳۸۶)

قاضی شوکانی نیل الاوطار ۱۷۷ ج ۵ میں فرماتے ہیں کہ فَهُوَ بِالْخَيَارِ والی روایت تو بیع کے انعقاد پر دلالت کرتی ہے اور امام مزنیؒ بھی مختصر المزنی ص ۵۱۸ میں فرماتے ہیں کہ اس سے بیع کا انعقاد ثابت ہوتا ہے۔ اور علامہ عینیؒ عمدۃ القاری ص ۲۸۴ ج ۱۲ میں امام طحاویؒ کے حوالہ سے ذکر کرتے ہیں کہ یہ حصہ بیع کے انعقاد پر دلالت کرتا ہے اگر بیع فاسد ہوتی تو بائع اور مشتری کو اس کے فسخ پر مجبور کیا جاتا۔

اور امام طحاویؒ امام شافعیؒ کو جواب دیتے ہیں کہ حدیث میں ہے کہ اَلْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَالَمْ يَتَفَرَّقَا اور آپ کے نزدیک تفرق سے مراد تفرق بالابدان ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تفرق تک خیار ہے اس کے بعد نہیں تو جب تلقی کرنے والا اور قافلہ والے جدا جدا ہو جائیں تو خیار کیسے رہے گا؟

احناف حضرت ابن عمرؓ کی ان روایات سے استدلال کرتے ہیں جن میں آتا ہے کہ ہم حضور علیہ السلام کے زمانہ میں تلقی رکبان کرتے تھے اور ایک جگہ سے خرید کو اسی جگہ بیچ دیتے تھے تو آپؐ نے منع فرمایا کہ جب تک تم اس سامان کو خریدی ہوئی جگہ سے منتقل نہ کر لو' اس وقت تک اس کو مت بیچو تو ان روایات سے تلقی کی اباحت ثابت ہوتی ہے اسی لیے بعض حضرات نے کہا ہے کہ تلقی میں ممانعت کراہت تنزیہی پر محمول ہے اور یہ جواز کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے۔ یہ روایات علامہ ابن حزمؒ نے المحلی میں نقل کی ہیں مگر ان روایات کے جواب دیتے ہوئے علامہ ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ سے تلقی کا ترک ثابت ہے اس لیے تلقی کا جواز ان کے نزدیک بھی نہیں ہے (اَلْمُحَلّٰی ص ۵۲۳ ج ۵)

علامہ ابن حزمؒ کی اس بات کا جواب مولانا ظفر احمد عثمانیؒ دیتے ہیں کہ جن روایات سے حضرت ابن عمرؓ سے تلقی کا ترک ابن حزمؒ ثابت کرتے ہیں ان روایات میں لیث بن ابی سلیم راوی ہے جس کو محلی میں خود کئی جگہ ضعیف کہہ چکے ہیں اور پھر ابو جعفر الرازی بھی متکلم فیہ راوی ہے (اعلاء السنن ص ۱۹۱ - ۱۹۲ ج ۱۴)

البحث الثالث۔ تَلَقِّیْ الرُکْبَان کی ممانعت کی وجہ کیا ہے؟

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اس میں بازار والوں کے ساتھ خیر خواہی مقصود ہے اسی لیے وہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے تلقی کی اور بازار میں سامان لے آیا تو بازار والے اس کے ساتھ بیع میں شریک ہوں گے وہ اکیلا اس سامان کو نہیں رکھ سکتا۔ علامہ ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ کے نزدیک تلقی رکبان کی ممانعت اس وقت ہے جبکہ تجارت کی نیت ہو اور اگر اپنے لیے طعام یا قربانی کا جانور خرید کر لے آیا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے (محلی ص ۵۴۲ ج ۵) امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس میں مقصد بائع کو نقصان سے بچانا ہے تاکہ مشتری اس سے شہر کا بھاؤ چھپا کر اس کو دھوکا نہ دے اسی لیے بائع کو خیار دیا گیا ہے۔

اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اس میں بائع اور اہل شہر دونوں کو ضرر سے بچانا مقصود ہے اگر ان دونوں میں سے کسی کا ضرر ہو تو تلقی رکبان مکروہ ہے ورنہ جائز ہے اور اگر وہ قافلہ والوں پر شہر کا بھاؤ چھپاتا ہے تب بھی تلقی مکروہ ہے (ہدایہ ص ۴۵ ج ۳) تلقی الرکبان کے جواز اور ممانعت دونوں قسم کی روایات موجود ہیں اسی لیے تو امام بخاریؒ کا نظریہ علامہ ابن حجرؒ یہ بیان کرتے ہیں کہ امام بخاریؒ کے نزدیک جواز کی روایات میں مراد اَعلَیٰ السّوق میں تلقی ہے اس طرح انہوں نے دونوں قسم کی روایات کو جمع کیا ہے اور علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ کا یہ جمع کرنا راجح ہے (فتح الباری ص ۳۷۶ ج ۴) اس سے معلوم ہوا کہ دونوں قسم کی روایات کو امام بخاریؒ وغیرہ بھی تسلیم کرتے ہیں تو احناف نے دونوں قسم کی روایات میں تطبیق کے لیے ضرر کا لحاظ رکھا ہے کہ ضرر ہو تو منع ہے ورنہ جائز ہے۔

بَابُ مَاجَاءَ لَا يَبِيعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ

(شہری کو دیہاتی کا سودا بیچنے کی ممانعت کا بیان)

بادی سے مراد ساکن البادیہ دیہات کا رہنے والا اور حاضر سے مراد ساکن الحضر شہر کا رہنے والا ہے۔

لَا يَبِيعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ کا مطلب

علامہ کشمیری فرماتے ہیں کہ لَا يَبِيعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ کا مطلب یہ ہے کہ دیہاتی آدمی

کوئی سامان بیچنے کے لیے لاتا ہے اور شہری اس کو کہتا ہے کہ ابھی اس کو نہ بیچو بلکہ یہ مال میرے پاس رکھ دو، میں اس کو آہستہ آہستہ بیچوں گا تاکہ تیرا سودا مہنگا بک جائے (العرف الشذی ص ۳۸۶)

حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ سے اس کی یہ تفسیر منقول ہے کہ لَا یَکُوْنَ لَہٗ سِمْسَارًا کہ یہ شہری دیہاتی کے لیے بیع میں دلال نہ بنے (بذل المجهود ص ۳۶۸ ج ۴) اور حضرت ابن عباسؓ سے یہ تفسیر سنن الکبریٰ للبیهقی ص ۳۴۶ ج ۵ میں منقول ہے۔

اور امام بخاریؒ نے ج ۱ ص ۲۸۹ میں فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے لَا یَکُوْنَ لَہٗ سِمْسَارًا کہ شہری آدمی دیہاتی کا مال بیچنے میں اس کا دلال نہ بنے اور حاشیہ میں لکھا ہے کہ ابن بطالؒ نے کہا کہ امام بخاریؒ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ شہری آدمی دیہاتی سے اجرت لے کر اس کے مال کو نہ بیچے اور اگر وہ بغیر اجرت کے ہو تو جائز ہے۔ (بخاری حاشیہ نمبر ۸ ج ۱ ص ۲۸۹)

اور صاحب ہدایہ ص ۴۵ ج ۳ میں فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس مال کی شہریوں کو ضرورت ہو وہ مال دیہات والوں پر نہ بیچے تاکہ شہریوں کو ضرر نہ ہو۔ مثلاً ایک آدمی کسی ایسی چیز کی ایجنسی دیہاتی کو دے دیتا ہے جس چیز کی شہر والوں کو ضرورت ہے تو یہ درست نہیں ہے کیونکہ ایسی صورت میں شہر والوں کو اس چیز کے حاصل کرنے کے لیے دیہات میں جانا پڑے گا اور ان کو ضرر ہوگا۔

ایسی بیع کا حکم

مبارکپوری صاحبؒ تحفۃ الاحوذی ص ۲۳۱ ج ۲ میں فرماتے ہیں کہ علامہ نوویؒ نے فرمایا ہے کہ ان احادیث سے بیع الحاضر للبادی کی حرمت ثابت ہوتی ہے وَبِہٖ قَالَ الشَّافِعِیُّ وَالْاَکْثَرُوْنَ مگر فرماتے ہیں کہ اس تحریم کے باوجود بیع ہو جاتی ہے۔

امیر یمانیؒ سبل السلام ص ۸۱۸ ج ۳ میں فرماتے ہیں کہ علماء نے یہ کہا ہے کہ نہی ہر صورت میں ہے خواہ بالاجرۃ ہو یا بلا اجرت ہو۔

احناف کا نظریہ

احناف کے نزدیک اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ کے پیش نظر یہ بیع جائز ہے اور امام بخاریؒ نے

بھی یہی دلیل پیش کی ہے جس سے ان کا نظریہ بھی احناف جیسا ثابت ہوتا ہے۔ اور اس بیع میں ممانعت کسی خرابی کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف تادیب اور اہل بلد کے ساتھ نرمی کرنا ہے اور اس کا قرینہ اسی روایت کے ساتھ یہ الفاظ ہیں ذَرُوا النَّاسَ یَرْزُقَ اللّٰہُ بَعْضَهُمْ مِنْ بَعْضٍ (ابوداؤد ج ۲ ص ۱۳۲) یعنی لوگوں کو معاملات میں چھوڑ دو اللہ تعالیٰ بعض کے ذریعے بعض کو رزق دیتا ہے۔ اور مسلم ص ۴ ج ۲ کی روایت میں دَعُوا النَّاسَ کے الفاظ ہیں۔

شوافع کی پہلی دلیل اور اس کا جواب

شوافع حضرات اپنے نظریہ پر لا یبیع حاضر لباد والی روایات سے استدلال کرتے ہیں اس کا جواب احناف یہ دیتے ہیں کہ یہ نہی کراہت تنزیہی پر محمول ہے جیسا کہ علامہ ابن حجرؒ نے فتح الباری ص ۲۷۵ ج ۵ میں ایک قول پیش کیا ہے اور اس میں ممانعت اہل بلد کے ساتھ شفقت کی وجہ سے ہے۔

اور علامہ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ وَذَهَبَ بَعْضُهُمْ اِلٰی اَنَّ النَّهْیَ فِیْهِ بِمَعْنَی الْاِرْشَادِ دُوْنَ الْاِیْجَابِ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ (تہذیب سنن ابی داؤد ص ۸۴ ج ۵) یعنی ممانعت تادیب کی وجہ سے ہے ایجاب کے لیے نہیں ہے اور بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ یہ حکم الدین النصیحۃ والی حدیث کی وجہ سے منسوخ ہو چکا ہے۔ مگر مبارکپوریؒ صاحب تحفۃ الاحوذی ص ۲۳۱ ج ۲ میں امیر یمانیؒ سے نقل کرتے ہیں کہ نسخ کا دعوی درست نہیں اس لیے کہ ان کی تاریخ کا علم نہیں ہے کہ کونسا حکم پہلے اور کون سا بعد میں ہے۔

شوافع کی دوسری دلیل اور اس کا جواب

اور شوافع حضرات ابوداؤد ج ۱ ص ۱۳۱ کی اس روایت سے بھی استدلال کرتے ہیں جس میں ہے کہ حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ کے پاس ایک دیہاتی اونٹنی لے کر آیا کہ آپ اس کو بیچ دیں تو انہوں نے فرمایا کہ تم خود جا کر بیچو میں تمہاری طرف سے نہیں بیچ سکتا۔ ہاں مشورہ دے سکتا ہوں اگر کوئی تمہارے ساتھ سودا طے کرے تو مجھ سے مشورہ کر لینا۔ اگر ثمن درست ہوا تو میں تمہیں بتا دوں گا اور اگر ثمن مثل نہ ہوا تو تمہیں روک دوں گا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت طلحہؓ نے احتیاط کے طور پر ایسا کیا۔ اور پھر اس روایت کے بارہ میں امام خطابیؒ معالم السنن ص ۸۳ ج ۵ میں فرماتے ہیں وَفِیْ اِسْنَادِهٖ مُحَمَّدُ بْنُ اِسْحَاقَ وَفِیْهِ اَیْضًا رَجُلٌ مَجْهُوْلٌ کہ اس کی سند میں محمد بن اسحاق ہونے کے ساتھ ایک

راوی مجہول بھی ہے یعنی انہوں نے اس کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے۔
اور مولانا سہارنپوریؒ فرماتے ہیں کہ اس دیہاتی کا نام تو معلوم نہیں ہو سکا مگر وہ صحابی تھے (بذل المجہود ص ۲۶۹ ج ۴) اس لیے یہ جہالت روایت پر کوئی اثر انداز نہیں ہوتی۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي النَّهْيِ عَنِ الْمُحَاقَلَةِ وَالْمُزَابَنَةِ

(بیع محاقلہ اور مزابنہ کی ممانعت کا بیان)

علامہ کشمیریؒ العرف الشذی ص ۳۸۷ میں محاقلہ کے دو معانی بیان کرتے ہیں۔ ا۔ بَيْعُ الْحِنْطَةِ بِالزَّرْعِ یعنی کھڑی فصل کو تیار گندم کے بدلہ میں بیچنا۔ ۲۔ محاقلہ بمعنی مزارعت۔ یعنی زمین سے پیدا ہونے والی فصل کے کچھ حصہ کے بدلہ میں زمین کرایہ پر لینا۔
امیر یمانیؒ سبل السلام ص ۸۱۵ ج ۲ میں ان کے علاوہ تیسرا معنی بھی بیان کرتے ہیں بَيْعُ الطَّعَامِ فِي سُنْبُلِهٖ کہ طعام کو اس کے خوشوں میں ہوتے ہوئے بیچنا۔ مگر ان میں سے پہلے معنی کو راجح قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ حضرت جابرؓ صحابی کی تفسیر ہے۔
اور صاحب ہدایہ نے ص ۳۱ ج ۳ میں بیع محاقلہ کی یہ تعریف کی ہے بَيْعُ الْحِنْطَةِ فِي سُنْبُلِهَا بِحِنْطَةٍ مِثْلَ كَيْلِهَا خَرْصًا کہ خوشوں کے اندر جو گندم ہے اس کو تیار گندم کے بدلہ میں اس کے کیل کے برابر تخمینہ سے بیچنا۔
اور مبارکپوری صاحب تحفۃ الاحوذی ۲۳۲ ج ۲ میں النہایہ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ محاقلہ کے کئی معانی ہیں ا۔ گندم کے بدلہ میں زمین کرایہ پر لینا ۲۔ مزارعت ۳۔ بَيْعُ الطَّعَامِ فِي سُنْبُلِهٖ بِالْبُرِّ ۴۔ بَيْعُ الزَّرْعِ قَبْلَ إِدْرَاكِهٖ یعنی کھیتی پکنے سے پہلے ہی اس کو بیچ دینا۔
اگر محاقلہ مزارعت کے معنی میں لیں تو یہ امام ابو حنیفہؒ کی دلیل بنتی ہے جو مزارعت کو درست قرار نہیں دیتے۔ اور اگر محاقلہ کو بَيْعُ الْحِنْطَةِ بِالزَّرْعِ کے معنی میں لیں تو ممانعت کی وجہ یہ ہوگی کہ جنس کو جنس کے بدلہ میں بیچنے کی صورت میں مساوات شرط ہے اور یہاں مساوات نہیں ہے۔
اور اگر محاقلہ کا معنی إِكْرَاءُ الْأَرْضِ بِالْحِنْطَةِ ہو تو ممانعت کی وجہ وہ روایات ہوں گی جن میں زمین کرایہ پر دینے کی ممانعت ہے جیسا کہ مسلم ص ۱۱ ج ۲ میں حضرت جابرؓ وغیرہ کی روایات ہیں اور امام نوویؒ شرح مسلم ص ۱۲ ج ۲ میں فرماتے ہیں کہ امام طاؤسؒ اور حسن بصریؒ کے نزدیک زمین کو کرایہ پر دینا ہر حال میں ممنوع ہے۔ خواہ نقدی کے بدلہ میں ہو یا

طعام کے بدلہ میں۔ اور امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ فصل جو اس زمین سے حاصل کی جا رہی ہے اسی میں سے حصہ کو کرایہ نہ بنایا جائے تو جائز ہے خواہ نقدی کے بدلہ میں ہو یا طعام کے بدلہ میں۔ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ نقدی کے بدلہ میں زمین کرایہ پر لینا درست ہے اور طعام کے بدلہ میں درست نہیں ہے۔

اور مبارکپوریؒ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ بیع محاقلہ میں ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ یہ کیلی ہے اور کیلی چیزوں میں جبکہ جنس ایک ہو تو اس کے تبادلہ کی صورت میں مُساوات اور یدا بید دونوں باتیں ضروری ہیں۔ اور یہاں چونکہ مساوات بھی نہیں اور یَدًابِیَدٍ بھی نہیں اس لیے ممنوع ہے۔ محاقلہ اور مزابنہ کی تفسیر خود امام ترمذیؒ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ محاقلہ کہتے ہیں بَیْعَ الزَّرْعِ بِالْحِنْطَةِ کھڑی فصل کو تیار گندم کے بدلہ میں بیچنا۔ اور مزابنہ کہتے ہیں بَیْعَ الثَّمَرِ عَلٰی رُؤُسِ النَّخْلِ بِالتَّمَرِ۔ درخت پر لگے ہوئے پھل کو اتارے ہوئے پھل کے بدلہ میں بیچنا

قَوْلُهٗ اَنَّ زَیْدًا اَبَا عَیَّاشٍ سَاَلَ سَعْدًا عَنِ الْبَیْضَاءِ بِالسُّلْتِ

بیضاء سے مراد گندم اور سلت سے مراد وہ ہے جس کو لوگ پیغمبری جو کہتے ہیں۔

حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ سلت اور عام جو میں فرق یہ ہے کہ اس کے کنارے عام جو کی طرح نہیں ہوتے اور یہ عام جو سے اعلیٰ ہوتا ہے اس لیے کہ اس کا چھلکا کم ہوتا ہے اور اس کو پیغمبری جو کہنا نام رکھنے والوں کی نادانی ہے (الکوکب الدری ص ۳۵۷)

اور مبارکپوریؒ صاحب تحفۃ الاحوذی ص ۲۳۲ ج ۲ میں لکھتے ہیں کہ موطا امام مالک (ص ۵۷۷ حاشیہ ۱) کے حاشیہ میں ہے کہ اَلسُّلْتَ نَوْعٌ مِنَ الشَّعِیْرِ لَا قِشْرَ لَهٗ کہ سلت جو کی ایک قسم ہے جس پر چھلکا نہیں ہوتا۔ جمہور کے نزدیک بیضاء اور سلت مختلف انواع ہیں اس لیے ان کی بیع کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے اور امام مالکؒ کے نزدیک یہ ایک ہی نوع ہیں اس لیے ان کی بیع کمی بیشی کے ساتھ درست نہیں ہے اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے بھی بَیْعَ التَّمَرِ بِالرُّطَبِ پر قیاس کرکے بیع البیضاء بالسلت کو ممنوع قرار دیا ہے۔

تر کھجور کو خشک کھجور کے بدلے بیچنے کے بارے میں ائمہ کرام کے اقوال

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تمر کو رطب کے بدلہ میں اور انگور کو زبیب کے بدلہ میں مطلقاً بیچنا جائز ہے اور امام شافعیؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک مطلقاً ناجائز ہے۔ صرف رطب کو رطب کے بدلہ میں انگور کو انگور کے بدلے میں بیچنا جائز ہے۔ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک

سب جائز ہیں سوائے بیع التمر بالرطب کے کیونکہ اس کی ممانعت پر نص موجود ہے۔

امام ابو حنیفہؒ بیع کے وقت مساوات کے لحاظ رکھتے ہیں اور امام محمدؒ مآل کا اعتبار کرتے ہیں اور ترمذی شریف کی یہ روایت ان کی دلیل ہے اس لیے کہ اس میں الفاظ ہیں کہ حضور علیہ السلام نے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے پوچھا اینقص الرطب اذا یبس کیا رطب خشک ہو کر کم ہو جاتی ہے تو انہوں نے کہا کہ نعم تو آپؐ نے اس سے منع فرمایا۔

امام ابو حنیفہؒ کی جانب سے دلیل یہ دی گئی ہے کہ بخاری شریف ج ۱ ص ۲۹۰ میں التمر بالتمر کو جائز قرار دیا گیا ہے اور حضور علیہ السلام نے رطب کو بھی تمر قرار دیا ہے جیسا کہ روایات میں موجود ہے جبکہ آپؐ کے پاس خیبر کی کھجوریں لائی گئیں تو آپؐ نے فرمایا اوکل تمر خیبر ھکذا کیا خیبر کی ساری کھجوریں ایسی ہوتی ہیں تو ان روایات کے مجموعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بیع التمر بالرطب جائز اور درست ہے۔

امام ابو حنیفہؒ جب بغداد تشریف لائے تو ان سے اس بارہ میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ تمر اور رطب ایک جنس ہیں یا علیحدہ علیحدہ جنس ہیں؟ اگر ایک جنس نہیں تو ان کی بیع مساوات اور یدا بید کی شرط کے ساتھ درست ہے اور اگر علیحدہ علیحدہ جنس ہیں تو واذا اختلف النوعان فبیعوا کیف شئتم (جب دو مختلف انواع ہوں تو ان کی بیع جیسے چاہو کمی بیشی سے کرو) والی حدیث کے پیش نظر جائز ہے اور یہ روایت میں موجود ہے۔ جب امام صاحبؒ کے سامنے حضرت سعدؓ والی روایت پیش کی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ اس میں ابو عیاش راوی مجہول ہے اور یہ روایت صرف اسی کی سند سے منقول ہے۔

تحفہ الاحوذی ص ۲۳۳ ج ۲ میں ہے کہ جب امام ابو حنیفہؒ پر اعتراض کیا گیا کہ ابالی ہوئی یا بھیگی گندم کو عام گندم کے بدلے بیچا جا سکتا ہے یا نہیں تو انہوں نے فرمایا کہ نہیں بیچا جا سکتا تو اعتراض کرنے والوں نے کہا کہ یہی صورت تو عنب اور زبیب اور رطب اور تمر میں پائی جاتی ہے کہ ایک میں رس زیادہ اور دوسرے میں خشک ہو جانے کی وجہ سے کم ہوتا ہے تو اس بیع کو کیوں جائز قرار دیتے ہو تو امام صاحبؒ نے فرمایا کہ رطب میں تری امر خلقی سے ہے جبکہ مقلیہ یعنی ابالی ہوئی گندم میں تری امر خلقی سے نہیں بلکہ عارضی ہے اس لیے ان دونوں مسئلوں کی صورت علیحدہ علیحدہ ہوگی۔

علامہ ابن حزمؒ نے المحلی میں اور اسی طرح مبارکپوری صاحبؒ نے تحفہ الاحوذی ج ۲ ص ۲۳۳ میں امام ابو حنیفہؒ کی اس بات کا رد کرتے ہوئے کہا کہ ابو عیاش راوی مجہول نہیں

ہے۔

اس کے جواب میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اعلاء السنن ص ۳۲۱ ج ۱۴ میں فرماتے ہیں کہ ابو عیاش کو مجہول قرار دینے میں ابو حنیفہؒ اکیلے نہیں ہیں بلکہ محدثین کرامؒ کا ایک طبقہ ان کا ہم نوا ہے۔ امام حاکمؒ نے مستدرک میں فرمایا کہ اس روایت کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے ابو عیاش کے مجہول ہونے کی وجہ سے اپنی کتابوں میں نقل نہیں کیا اور ابن عبد اللہؒ نے فرمایا وَاَمَّا زَيْدٌ فَقِيْلَ اَنَّهٗ مَجْهُوْلٌ (رہا زید تو اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ مجہول ہے)

ترمذی شریف کی یہ روایت (جس میں ہے کہ حضرت سعدؓ سے بیضاء بالسلت کے بارے میں پوچھا گیا) بظاہر امام ابو حنیفہؒ کے نظریہ کے خلاف ہے اس کا جواب دیتے ہوئے امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ یہ ممانعت حالت نسیئہ پر محمول ہے (طحاوی ج ۲ ص ۱۶۱) اور ابوداؤد شریف ص ۱۲۱ ج ۲ اور دار قطنی ج ۳ ص ۴۹ کی روایت میں نسیئہ کے الفاظ موجود ہیں اور وہ روایت بھی زید ابو عیاش سے مروی ہے اور نسیئہ کی صورت میں امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بھی بیع جائز نہیں ہے تو ترمذی شریف کی یہ روایت ابو عیاش کے مجہول ہونے کی وجہ سے اس قابل نہیں کہ اس کی وجہ سے دوسری روایات کو ترک کر دیا جائے۔

بعض حضرات نے کہا کہ یہ ابو عیاش زرقی ہیں مگر امام طحاویؒ نے فرمایا کہ یہ درست نہیں ہے اس لیے کہ وہ صحابی ہیں اور عبد اللہ بن یزید نے ان کا زمانہ نہیں پایا احادیث کے مجموعہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے امام ابو حنیفہؒ کا نظریہ ہی راجح ہے۔

قَوْلُهٗ فَقَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗ اَيَنْقُصُ الرُّطَبُ اِذَا يَبِسَ قَالُوْا نَعَمْ فَنَهٰى عَنْ ذَالِكَ

علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ جب ممانعت کی علت نسیئہ ہے تو پھر آپؐ کے اس سوال کا مقصد کیا ہے؟ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ فاضل بہاؤالدین المرجانی نے تلویح کے حاشیہ میں فرمایا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سوال تبرعا تھا یعنی ضرورت سے زائد تھا اور آپؐ نے یہ سوال کر کے مخاطبین کے ذہن میں یہ بات بٹھائی کہ جب رطب خشک ہو جانے پر کم ہو جاتی ہیں تو پھر اس بیع کا فائدہ ہی کیا ہے؟ ورنہ یہ بات تو بدیہی ہے کہ رطب خشک ہو جانے پر کم ہو جاتی ہیں اور بدیہی بات کے بارہ میں سوال کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اور جن حضرات نے یہ کہا کہ اس میں استفہام تقریری ہے ان کی بات بھی دل کو نہیں لگتی (العرف الشذی ص ۳۸۷) حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ یہ سوال کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہی کی علت کی صراحت فرمائی ہے کہ نہی کی وجہ یہ ہے کہ رطب خشک ہونے

پر کم ہو جاتی ہے تو نسیئہ کی صورت میں بیع کا کوئی فائدہ نہیں ہے (الکوکب الدری ص ۳۸۷)

اگر یہ روایت نَسِیئَہ کی صورت پر محمول ہو تو نہی واضح ہے اور اگر نسیئہ کی صورت نہ ہو بلکہ یَدًا بِیَدٍ کی صورت ہو تو پھر حضرت مدنیؒ کی تقریر ترمذی ص ۲۶۱ میں اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ نہی نظر شفقت کی وجہ سے ہے تحریم کے لیے نہیں ہے تاکہ جن روایات میں جواز ثابت ہوتا ہے ان کے ساتھ تعارض نہ رہے۔ مگر شوافع حضرات اس نہی کو تحریم کے لیے ہی لیتے ہیں اور اس بیع کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي كَرَاهِيَةِ بَيْعِ الثَّمَرَةِ قَبْلَ اَنْ يَبْدُوَ صَلَاحُهَا

(درخت پر لگے ہوئے پھل کو بدو صلاح سے پہلے بیچنے کی ممانعت کا بیان)

بدو صلاح کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں۔ ۱۔ کہ پھل ایسی حالت میں ہو جائے کہ یَاْمَنَ الْعَاهَةَ کہ آفات سے محفوظ ہو جائے۔ یہ معنی احناف کے نزدیک راجح ہے۔ امام ترمذیؒ نے حضرت ابن عمرؓ کی جو روایت نقل کی ہے اس میں بھی يَاْمَنَ الْعَاهَةَ کے الفاظ ہیں اور مسند احمد ج ۶ ص ۱۰۶ میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے نَهٰى عَنْ بَيْعِ الثِّمَارِ حَتّٰى يَبْدُوَ صَلَاحُهَا وَتَاْمَنَ مِنَ الْعَاهَةِ (کہ نبی کریم ﷺ نے بدو صلاح سے پہلے اور پھل کے آفات سے امن پا لینے سے پہلے تک ان کی بیع سے منع فرمایا ہے) اور یہ حالت پھل میں اس وقت آتی ہے جبکہ اس میں رنگت آ جائے کیونکہ اس سے پہلے اس پر آفات عام آتی ہیں اسی لیے بعض روایات میں حَتّٰى تَزْهُوَ کے الفاظ ہیں جس کا معنی ہیں تَصْفَرَّ اور تَحْمَرَّ کہ زرد ہو جائے یا سرخ ہو جائے۔

۲۔ بدو صلاح کا دوسرا معنی یہ ہے کہ اس میں کچھ مٹھاس آجائے اور اس پھل کا پکنا ظاہر ہو جائے یہ معنی امام شافعیؒ کے نزدیک راجح ہے۔

۳۔ بدو صلاح کا تیسرا معنی یہ ہے کہ پھل کھائے جانے کے قابل ہو جائے اور دار قطنی ج ۳ ص ۱۴ میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں الفاظ ہیں نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ تُبَاعَ ثَمَرَةٌ حَتّٰى تُطْعَمَ یہ معنی عطاء بن ابی رباحؒ کے نزدیک راجح ہے۔

درخت پر لگے ہوئے پھل کی بیع کی چھ صورتیں اور ان کا حکم

علامہ کشمیریؒ العرف الشذی ص ۳۸۷ میں علامہ ابن حجرؒ کی فتح الباری (ص) کے حوالہ

سے فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ کی چھ صورتیں ہیں۔
۱۔ بَدْوِ صَلاح سے پہلے کاٹ لینے کی شرط کے ساتھ بیع ہو تو یہ صورت احناف کے نزدیک جائز ہے اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ مشتری کو پھل کی بجائے کسی اور وجہ سے اس کی ضرورت ہو اور یہ مَالِ مُتَقَوَّم ہے اور مال متقوم کی بیع درست ہے۔ اور علامہ عینیؒ عمدۃ القاری ص ۴ ج ۱۲ میں حضرت زید بن ثابتؓ کی روایت پیش کرتے ہیں قَالَ کَانَ النَّاسُ یَتَبَایَعُوْنَ الثِّمَارَ قَبْلَ اَنْ یَبْدُوَ صَلَاحُهَا کہ لوگ بدو صلاح سے پہلے بھی پھل کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ تو اس سے جواز ثابت ہوتا ہے تو نہی والی روایت کا جواب یہ ہے کہ نہی کراہت تنزیہی پر محمول ہے یا نہی شفقت پر محمول ہے جیسا کہ حضرت زید بن ثابتؓ کی روایت جو بخاری ج ۱ ص ۲۹۲ میں ہے اس میں الفاظ ہیں کَالْمَشُوْرَةِ یُشِیْرُ بِهَا لِکَثْرَةِ خُصُوْمَتِهِمْ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورۃً ان کو بَدْوِ صَلَاح سے پہلے ان کے بکثرت جھگڑوں کی وجہ سے بیع سے روک دیا۔ یا نہی والی روایت اس پر محمول کہ پھل کی حیثیت سے ان کو اس وقت نہ بیچو۔ اور یہاں پھل کی حیثیت سے ان کا بیچنا نہیں ہے۔ اور اسی کو حضرت گنگوہیؒ نے الکوکب الدری ص ۳۵۸ میں فرمایا ہے۔ اور شوافع حضرات کے نزدیک بدو صلاح سے پہلے بیع درست نہیں ہے۔
۲۔ اس مسئلہ میں دوسری صورت یہ ہے کہ بدو صلاح سے پہلے بیع ہو اور پھل پکنے تک نہ کاٹنے کی شرط ہو تو یہ بالاتفاق درست نہیں ہے۔ احناف کے نزدیک اس لیے کہ اس میں شرط فاسد پائی گئی ہے اور شوافع کے نزدیک اس لیے کہ یہ بیع بدو صلاح سے پہلے ہے۔
۳۔ اس مسئلہ میں تیسری صورت یہ ہے کہ بیع بدو صلاح سے پہلے ہو اور پھل کو درخت پر باقی رکھنے یا نہ رکھنے کی کوئی شرط نہ ہو تو ایسی صورت میں اگر مشتری اس کو فی الفور اتار لیتا ہے یا بائع اس کو پکنے تک باقی رکھنے کی اجازت دے دیتا ہے تو احناف کے نزدیک یہ درست ہے ورنہ درست نہیں ہے۔ اور شوافع کے نزدیک تو بدو صلاح سے پہلے بیع درست ہی نہیں۔
۴۔ اس مسئلہ میں چوتھی صورت یہ ہے کہ بیع بدو صلاح کے بعد ہو اور فی الفور اتار لینے کی شرط ہو تو یہ بالاتفاق جائز ہے۔
۵۔ پانچویں صورت یہ ہے کہ بیع بدو صلاح کے بعد ہو اور پھل کو درخت پر پکنے تک کی شرط کے ساتھ ہو تو یہ بالاتفاق جائز نہیں ہے اس لیے کہ پھل کو درخت پر باقی رکھنے کی شرط

فاسد ہے۔
۶۔ چھٹی صورت یہ ہے کہ بیع بدو صلاح کے بعد ہو اور پھل کو درخت پر رکھنے یا نہ رکھنے کی شرط نہ ہو تو یہ صورت مختلف فیہ ہے۔ ائمہ ثلاثہؒ اور امام اسحاق بن راہویہؒ کے نزدیک یہ بیع درست نہیں ہے اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اگر مشتری فی الفور اتار لے یا بائع اپنی مرضی سے اجازت دے دے تو بیع درست ہوگی اس لیے کہ عموما لوگ اجازت دے دیتے ہیں اور اس کی مدت بھی معلوم ہوتی ہے اور اگر بائع پھل کو درخت پر باقی رکھنے کی اجازت نہ دے اور مشتری اس پھل کو پکنے تک درخت پر باقی رکھنے کا اصرار کرے تو یہ بیع درست نہ ہوگی۔ اور اس میں ممانعت کی وجہ حدیث کے یہ الفاظ ہوں گے۔ بِمَ تَسْتَحِلُّ مَالَ اَخِیْکَ (بخاری ج ۱ ص ۲۹۳) کہ تو اپنے بھائی کے مال کو کس وجہ سے حلال سمجھتا ہے (جبکہ اس کی اجازت نہیں ہے) اور ترمذی شریف کی روایات میں اگرچہ یہ الفاظ نہیں ہیں مگر ان میں بھی علت اسی کو سمجھا جائے گا اس لیے کہ نہی کو عموم کے لیے شوافع بھی نہیں مانتے اس لیے کہ وہ بھی بیع بشرط القطع کو جائز سمجھتے ہیں اگر نہی عام ہوتی تو کوئی صورت بھی جائز نہ ہوتی۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي النَّهْيِ عَنْ بَيْعِ حَبَلِ الْحَبَلَةِ
(حمل کو بیچنے یا اس کو ادائیگی ثمن کے لیے مدت مقرر کرنے کی ممانعت کا بیان)

امام نوویؒ شرح مسلم ص ۲ ج ۲ میں قاضی عیاضؒ سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حبل الحبلۃ میں بعض لوگوں نے حبل کو حاء کے فتحہ اور باء کے سکون سے پڑھا ہے مگر یہ غلط ہے کیونکہ اصل میں حبل حاء اور باء دونوں کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ اور اَلْحَبَلَة جمع ہے حَابِلٌ کی جیساکہ ظَلَمَةٌ جمع ہے ظَالِمٌ کی۔

بیع حبل الحبلۃ کی تفسیر

علامہ کشمیریؒ العرف الشذی ص ۳۸۸ میں اور حضرت گنگوہیؒ الکوکب الدری ص ۳۵۸ میں فرماتے ہیں کہ حبل الحبلہ کے اندر دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ مادہ جانور کے پیٹ میں جو بچہ ہے اس کی بیع کی جائے۔ اس صورت میں معدوم چیز کی بیع ہونے کی وجہ سے بیع باطل ہوگی۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ بیع تو کسی اور چیز کی ہو مگر اس مادہ کے پیٹ

میں جو بچہ ہے اس کے پیدا ہونے کے وقت کو ثمن کی ادائیگی کے لیے اجل مقرر کیا جائے تو اس صورت میں شرط فاسد کی وجہ سے بیع فاسد ہوگی۔

بیع باطل اور بیع فاسد میں فرق

بیع باطل اس کو کہتے ہیں کہ جو اپنے اصل اور وصف کے ساتھ بالکل غیر مشروع ہو جیسا کہ معدوم چیز کی بیع اور بیع فاسد وہ ہوتی ہے جو اپنے اصل کے لحاظ سے مشروع ہو مگر وصف کی وجہ سے غیر مشروع ہو۔

بَیعَ المَلَاقِیحِ

علامہ ابن رشدؒ بدایۃ المجتہد ص ۱۱۱ ج ۲ میں فرماتے ہیں بَیعُ حَبَلِ الحَبَلَۃِ مَا بَیعَ اَلمَضَامِینَ یعنی مادہ جانوروں کے پیٹ میں جو بچہ ہے اس کی بیع کو بیع حبل الحبلہ کہتے ہیں۔ اور نر جانوروں کی پشتوں میں جو نطفہ ہے اس کی بیع کو بیع الملاقیح کہتے ہیں۔ یہ جاہلیت کے دور کی بیوع تھیں ان کے حرام ہونے پر اتفاق ہے۔

حَبَلَ الحَبَلَۃِ کی تعریف میں فقہاء کرام کے اقوال

مبارکپوری صاحبؒ تحفۃ الاحوذی ص ۲۳۴ ج ۲ میں ابن التینؒ کے حوالہ سے اور امیر یمانیؒ سبل السلام ص ۸۰۶ ج ۳ میں لکھتے ہیں کہ حبل الحبلہ کی تعریف میں فقہاء کے اختلاف کی صورت میں چار اقوال بنتے ہیں۔

۱۔ مادہ جانور کے پیٹ میں جو بچہ ہے اس کو بیچنا۔ احناف کے نزدیک یہ معنی راجح ہے۔ امام نوویؒ شرح مسلم میں فرماتے ہیں کہ یہی نظریہ ہے امام احمدؒ اور اسحاق بن راہویہؒ کا۔ اور یہ معنی لغت کے زیادہ قریب ہے۔ اور امیر یمانیؒ سبل السلام میں فرماتے ہیں کہ امام ترمذیؒ کا نظریہ بھی یہی ہے اور امام بخاریؒ نے بھی اس بیع کو بیع الغرر میں بیان کر کے اس کی جانب اشارہ کیا ہے۔

۲۔ مادہ جانور کے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ بچہ مادہ ہو اور وہ بڑا ہو کر حاملہ ہو تو اس کے پیٹ میں جو بچہ ہو گا اس کی بیع کرنا۔ یہ بیع بھی معدوم چیز کی بیع ہے اس لیے ناجائز ہے۔

۳۔ بائع اور مشتری کسی چیز کی بیع کرتے ہیں اور ثمن کی ادائیگی کے لیے اجل یہ طے کرتے ہیں کہ جب اس مادہ جانور کے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ پیدا ہوگا تو ثمن کی ادائیگی ہوگی۔ یہ معنی امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک راجح ہے اور اس کی وجہ امام نوویؒ یہ فرماتے ہیں کہ

یہ معنی روایت کے راوی حضرت ابن عمرؓ نے تفسیر کرتے ہوئے بیان کیے ہیں اس لیے یہ معنی راجح ہے۔

۴۔ بائع اور مشتری آپس میں کسی چیز کی بیع کرتے ہیں اور ثمن کی ادائیگی کے لیے اجل مقرر کرتے ہیں کہ جب اس مادہ جانور کے پیٹ میں جو بچہ ہے، وہ بچہ مادہ ہو اور وہ بڑا ہو کر حاملہ ہو اور جب اس کا بچہ پیدا ہوگا تو اس وقت ثمن ادا کرنا ہو گا تو اس صورت میں چونکہ اجل مجہول کو شرط قرار دیا گیا ہے اس لیے بیع فاسد ہوگی۔

الغرض احناف کے نزدیک بیع حبل الحبلہ کی ممانعت کی وجہ اور علت بیع المعدوم ہوگی اور شوافع حضرات کے نزدیک علت یہ ہوگی کہ اجل مجہول تک تاخیر ثمن کو شرط رکھا گیا ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي كَرَاهِيَةِ الْغَرَرِ (دھوکہ والی بیع کی ممانعت کا بیان)

مولانا سہارنپوریؒ بذل المجہود ص ۲۵۱ ج ۵ میں فرماتے ہیں کہ جس بیع میں بائع یا مشتری کو غرر یعنی دھوکہ ہو وہ بیع الغرر ہے۔ اور امام نووی شرح مسلم ص ۲ ج ۲ میں فرماتے ہیں کہ معدوم یا مجہول چیز کی بیع یا ایسی چیز کی بیع جس کو مشتری کے حوالہ کرنے پر قادر نہ ہو یا ایسی چیز کی بیع جس میں بائع کی ملکیت تام نہ ہو یہ سب بیع غرر میں داخل ہیں جیسا کہ فضا میں اڑنے والے پرندوں کی بیع یا دریا میں موجود مچھلیوں کی بیع یا بھاگے ہوئے غلام کی بیع وغیرہ۔ علامہ کشمیریؒ العرف الشذی ص ۳۸۸ میں فرماتے ہیں کہ اگر پانی میں موجود مچھلیوں کا پکڑنا آسان ہو تو بیع جائز ہوگی ورنہ نہیں۔ جیسا کہ آج کل مچھلی فارم بنے ہوئے ہیں مالک مچھلی کا سودا کرتا ہے تو اس کے لیے اس مچھلی کو مشتری کے حوالے کرنا کوئی دشوار نہیں ہے اس لیے بیع جائز ہوگی۔ یہی حکم فضا میں اڑنے والے پرندوں کا ہے جو کسی کی ملکیت میں ہوں اور مالک کے پاس آجاتے ہوں اور مالک ان کو مشتری کے حوالے کرنے پر قادر ہو تو اس کی بیع جائز ہوگی۔

غرر والی بیع کا حکم

علامہ کشمیریؒ العرف الشذی ص ۳۸۸ میں فرماتے ہیں کہ غرر قولی ہو تو فسخ قضاءً واجب ہے، کہ جس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے وہ قاضی کے ذریعہ سے اس بیع کو فسخ کرائے۔ اور اگر غرر فعلی ہو تو فسخ دیانتاً واجب ہے کہ جس نے دھوکا کیا ہے وہ دیانت کا مظاہرہ کرتے

ہوئے اس بیع کو فسخ کرے۔

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اعلاء السنن ص ۱۱۹ ج ۱۴ میں فرماتے ہیں کہ العین الغائبہ یعنی ایسی چیز جو مالک کی ملکیت میں ہو مگر بیع کے وقت بائع اور مشتری کے پاس موجود نہیں تو امام شافعیؒ ایسی بیع کو بیع الغرر میں داخل کرتے ہیں اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ایسی بیع جائز ہے اور مشتری کو خیار ہوگا جبکہ وہ اس کو دیکھے اور اس پر حضرات صحابہ کرامؓ کے آثار موجود ہیں کہ وہ ایسی بیع کر لیتے تھے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ جس میں حقیر غرر ہو یعنی جس کو عام طور پر لوگ محسوس نہ کرتے ہوں تو وہ بیع جائز ہے مثلاً ایسا کوٹ خریدنا جس کا استر چھپا ہوا ہے تو کوٹ کے تابع اس کی بیع جائز ہے۔ اسی طرح ایک ماہ کے لیے مکان کرایہ پر لیا حالانکہ ماہ کبھی تیس کا ہوتا ہے اور کبھی انتیس کا۔ یا حمام میں اجرت دے کر داخل ہونا تو کیا معلوم یہ آدمی کتنا پانی صرف کرے گا تو ان چیزوں میں غرر معمولی ہے اس لیے یہ تمام بیوع جائز ہیں۔

غرر کی صورتوں میں سے ایک صورت یہ ہے کہ مبیع یا ثمن مجہول ہو۔ مثلاً ریوڑ بکریوں کا ہو اور کوئی آدمی ریوڑ والے سے کہے کہ ان میں سے ایک بکری چار سو روپے کی دے دے تو اس صورت میں مبیع مجہول ہے۔ اسی طرح ایک بکری کو پکڑ کر کہتا ہے کہ یہ چند روپوں کی مجھے دے دے تو یہ ثمن مجہول ہے۔

غرر کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ بائع کو مبیع مشتری کے حوالہ کرنے پر قدرت نہ ہو مثلاً بھاگا ہوا غلام ہو یا بائع کے ساتھ دوسرا آدمی اس مبیع کے اندر شریک ہو وغیرہ۔

اور غرر کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ مبیع مشتری کے حوالہ کرنے کو ایسے مواقع کے ساتھ معلق کرنا جس کے وجود میں آنے یا نہ آنے دونوں کا احتمال ہو مثلاً ثمن وصول کرے اور کہے کہ مبیع اس وقت حوالے کروں گا جب فلاں واقعہ پیش آئے گا اس کو تَعْلِیْقَ التَّمْلِیْکِ عَلَی الْخَطَرِ سے تعبیر کرتے ہیں۔

قَوْلُہٗ وَبَیْعِ الْحَصَاۃِ

امام نوویؒ شرح مسلم میں اور مبارکپوریؒ صاحب تحفۃ الاحوذی ص ۲۳۵ ج ۲ میں فرماتے ہیں کہ اس میں تین تاویلات ہیں یعنی اس کے تین معانی بیان کیے جاتے ہیں۔

۱۔ کوئی آدمی کہتا ہے کہ میں کنکری پھینکتا ہوں جہاں تک کنکری پہنچے گی اتنی زمین یا اگر کپڑے پر پھینکتا ہے تو اتنا کپڑا اتنے ثمن میں بیچتا ہوں۔ چونکہ اس میں مبیع مجہول ہے اس لیے یہ بیع

ناجائز ہے۔

۲۔ کوئی آدمی کہتا ہے کہ میں یہ چیز اتنے کی تجھ پر بیچتا ہوں اور تجھے اس وقت تک خیار ہے جب تک میں کنکری نہ پھینکوں اور جب میں کنکری پھینک دوں تو تیرا خیار ختم اور بیع لازم تو ایسی بیع کے بارے میں علامہ ابن رشد بدایۃ المجتہد ص ۱۱۱ ج ۲ میں فرماتے ہیں وَهٰذَا قِمَارٌ کہ یہ جواء ہے اس لیے ناجائز ہے کیونکہ اس میں ایجاب تو ہے مگر دوسری جانب سے قبول نہیں پایا جا رہا حالانکہ ایجاب اور قبول دونوں بیع کے رکن ہیں۔

۳۔ کوئی آدمی کہتا ہے کہ میں کنکری پھینکتا ہوں تو جس چیز یا کپڑے کو وہ کنکری لگے، وہ اتنے ثمن کے بدلے میں میری ہوگی تو اس میں مبیعہ مجہول ہے اور یہ قمار کی ایک صورت ہے اس لیے یہ بھی ناجائز ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي النَّهْيِ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ

(ایک سودے میں دو سودے کرنے کی ممانعت کا بیان)

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَؓ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ

کہ نبی کریم ﷺ نے ایک سودے میں دو سودے کرنے سے منع فرمایا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی اس روایت میں بیعتین فی بیعۃ کے الفاظ ہیں اور حضرت ابن مسعودؓ کی روایت جو مسند احمد ج ۱ ص ۳۹۸ میں ہے اس میں صَفْقَتَيْنِ فِي صَفْقَةٍ کے الفاظ ہیں۔

اسی لیے محدثین کرامؒ نے فرمایا ہے کہ دونوں روایتوں کا مفہوم ایک ہی ہے جس طرح ایک بیع میں دو بیع ممنوع ہیں اسی طرح ایک بیع میں دو عقد ممنوع ہیں خواہ وہ عقد بیع کی صورت میں ہوں یا اجارہ اور اعارہ کی صورت میں ہو۔

حضرت گنگوہیؒ الکوکب الدری ص ۳۵۹ میں فرماتے ہیں کہ بیعتین فی بیعۃ میں بیع سے مراد مطلق صفقہ بھی لیا جا سکتا ہے اور اس صورت میں ہر قسم کا عقد اس میں داخل ہوگا۔ اور اگر بیع سے حقیقتاً بیع مراد لی جائے تو پھر اس سے مراد یہ ہوگی کہ بیع کا وقوع چونکہ بکثرت پایا جاتا ہے اور اس کی شان باقی عقود سے اہم ہے اس لیے اس کا ذکر کر دیا، حالانکہ ایسی صورت میں دیگر عقود بھی داخل ہیں۔

بَیعَتَیَن فِیَ بَیعَۃٍ کی پہلی تفسیر

قاضیؒ شوکانیؒ نیل الاوطار ص ۱۶۱ ج ۵ میں بَیعَتَیَن فِیَ بَیعَۃٍ کی دو تفسیریں بیان کرتے ہیں ایک تفسیر یہ ہے کہ آدمی دوسرے کو کہتا ہے کہ یہ چیز اگر تو مجھ سے ادہار لے تو میں اتنے کی دوں گا اور اگر نقد لے تو اتنے کی دوں گا۔ اب تیری مرضی جیسے چاہے لے لے۔ یہ تفسیر امام احمدؒ کے نزدیک راجح ہے۔ علامہ زیلعیؒ نصب الرایہ ص ۲۰ ج ۴ میں فرماتے ہیں کہ اگر مشتری ان دو میں سے کسی ایک کو متعین کر کے جدا ہوا تو اس بیع میں کوئی حرج نہیں اسی کے مطابق امام ترمذیؒ نے فرمایا فَاِذَا فَارَقَہٗ عَلٰی اَحَدِھِمَا فَلَا بَاْسَ کہ جب ان دونوں صورتوں میں سے کسی ایک کو متعین کر کے جدا ہو تو اس بیع میں کوئی حرج نہیں ہے۔

علامہ ابن رشدؒ بدایۃ المجتہد ۱۱۵ ج ۲ میں فرماتے ہیں کہ اگر وہ کسی ایک صورت کو متعین کیے بغیر جدا ہوگیا تو امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک اب بیع درست نہ ہو گی کیونکہ وہ دونوں غیر معلوم ثمن پر جدا ہوئے ہیں اور یہ بیع جہالت ثمن کی وجہ سے ممنوع ہوگی۔ اور امام مالکؒ نے اس کو باب الخیار سے قرار دے کر جائز قرار دیا ہے کہ وہ جدا ہونے کے بعد بھی ان دونوں میں سے کسی ایک صورت کو اختیار کر سکتا ہے۔

مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ اعلاء السنن ص ۱۷۳ ج ۱۴ میں فرماتے ہیں کہ اس صورت میں امام اوزاعیؒ کا نظریہ یہ ہے کہ مشتری کسی ایک پہلو کو متعین کیے بغیر جدا نہ ہو اور اگر وہ جدا ہو جاتا ہے تو اس کو دو ثمنوں میں سے جو کم ہے وہ لازم ہوگا۔ اور مہلت میں سے جو مہلت لمبی ہوگی وہ اس کو حاصل ہوگی۔

دوسری تفسیر

بَیعَتَیَن فِیَ بَیعَۃٍ کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے سے کہے کہ میں تجھ پر یہ مکان اتنے درہم کا بیچتا ہوں بشرطیکہ تو فلاں سودا مجھ کو اتنے درہم کا دے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ معنی امام شافعیؒ نے کیا ہے۔ اور علامہ کشمیریؒ العرف الشذی ص ۳۸۸ میں فرماتے ہیں کہ یہی تفسیر امام ابو حنیفہؒ سے کتاب الآثار ص ۱۴۱ میں منقول ہے۔ اس صورت میں بھی چونکہ جہالت ثمن لازم آتی ہے اس لیے ممنوع ہے کیونکہ معلوم نہیں کہ علی الانفراد ان میں سے ہر ایک کا ثمن کیا ہے۔ اور یہ بات بھی ہے کہ اس میں ایسی شرط رکھی گئی ہے جس کا عقد تقاضا نہیں کرتا۔ امیر یمانیؒ سبل السلام ۸۰۹ ج ۳ میں فرماتے ہیں کہ اس صورت میں استقرار ثمن نہیں اس لیے یہ بیع درست نہیں اور پھر یہ بات بھی ہے کہ جن حضرات

کے نزدیک اس دن کے ثمن سے زیادتی صرف ادہار کی وجہ سے ربا ہوتی ہے تو ان کے نزدیک اس میں ربا پایا جاتا ہے اس لیے ناجائز ہے۔

تیسری تفسیر

علامہ ابن رشدؒ بدایۃ المجتہد ص ۱۱۵ ج ۲ میں بَیعَتَینِ فِی بَیعَۃٍ کی ایک اور تفسیر کرتے ہیں کہ بائع یہ کہتا ہے کہ میں یہ چیز یا یہ چیز تجھ پر اتنے درہم کی بیچتا ہوں تو اس صورت میں چونکہ مبیع مجہول ہے اس لیے یہ بھی ممنوع ہے۔

دو روایتوں میں تعارض اور اس کا جواب

حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک روایت ابو داؤد ج ۲ ص ۱۳۴ میں اس طرح آتی ہے مَنۡ بَاعَ بَیعَتَینِ فِی بَیعَۃٍ فَلَہٗ اَوۡکَسُھُمَا اَوِ الرِّبَا کہ جس آدمی نے ایک بیع میں دو بیع کیں تو اس کے لیے ان دو ثمنوں میں سے جو کم ہے وہ ہو گا یا وہ ربوا کا مرتکب ہوگا۔ اس روایت سے بَیعَتَینِ فِی بَیعَۃٍ کا جواز ثابت ہوتا ہے لہٰذا اس کا ترمذی شریف کی روایت سے تعارض ہے۔

تو اس کے جواب میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اعلاء السنن ص ۱۷۳ ج ۱۴ میں فرماتے ہیں کہ اس روایت میں ایک راوی محمد بن عمرو بن علقمہ متکلم فیہ ہے۔ اور وہ فَلَہٗ اَوۡکَسُھُمَا اَوِ الرِّبَا کی زیادتی نقل کرنے میں متفرد ہے اس لیے اس کا اعتبار نہیں۔ اور پھر یہ روایت ان مشہور روایات کے بھی خلاف ہے جن میں بَیعَتَینِ فِی بَیعَۃٍ کی ممانعت پائی جاتی ہے۔ اور اگر اس روایت کو قابل تسلیم مان بھی لیا جائے تو اس کی تفسیر واضح نہیں اس لیے کہ اس کی تفسیر مختلف لحاظ سے کی گئی ہے۔ سماکؒ اس کی تفسیریوں کرتے ہیں کہ مثلاً ایک آدمی دوسرے سے کہتا ہے کہ میں یہ چیز تجھ کو نقد اتنے کی اور ادہار اتنے کی بیچتا ہوں۔ اور ابن رسلانؒ نے اس کی تفسیریوں کی ہے کہ ایک آدمی ایک ماہ کے ادہار پر ایک بوری گندم ایک دینار کی خریدتا ہے اور جب ثمن کی ادائیگی کا وقت آتا ہے تو کہتا ہے کہ ایک بوری کی قیمت جو مجھ پر لازم تھی اب مجھ پر دو بوری کی قیمت لازم اور مجھے ایک ماہ کی مہلت مزید دے دے تو اس صورت میں اس کے ذمہ چونکہ وہی ثمن رہتا ہے جو پہلے اس کے ذمہ تھا اور وہ دوسرے ثمن کی بہ نسبت کم ہے تو اس کو فَلَہٗ اَوۡکَسُھُمَا فرمایا۔ اور اگر وہ اپنی دوسری بیع پر قائم رہتے ہوئے زائد ثمن دیتا ہے تو یہ ربا ہے۔ اس تفسیر کے پیش نظر یہ

روایت مشہور روایات کے مفہوم کے مطابق ہو جائے گی۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي كَرَاهِيَةِ بَيْعِ مَا لَيْسَ عِنْدَهُ

(غیر موجود چیز کی بیع کی ممانعت کا بیان)

قَوْلُهُ لَا تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ

مَا لَيْسَ عِنْدَكَ کی پہلی تفسیر

قاضی شوکانیؒ نیل الاوطار ص ۱۶۴ ج ۵ میں مَا لَيْسَ عِنْدَكَ کا معنی کرتے ہیں مَا لَيْسَ فِي مِلْكِكَ وَقُدْرَتِكَ یعنی جو تیری ملکیت اور دسترس میں نہ ہو جیسا کہ بھگوڑے غلام کی بیع جس کا ٹھکانہ معلوم نہ ہو یا وہ ایسے آدمی کے قبضہ میں ہو جس سے لے کر مشتری کے حوالہ کرنے کی بائع کو ہمت نہ ہو اسی طرح بھاگا ہوا پرندہ جس کے لوٹ آنے کا احتمال نہ ہو اس کی بیع کرنا وغیرہ۔

دوسری تفسیر

مَا لَيْسَ عِنْدَكَ کی دوسری تفسیر وہ ہے جو ترمذی شریف میں حضرت حکیم بن حزامؓ کی روایت سے ثابت ہے کہ انہوں نے حضور علیہ السلام سے پوچھا کہ میرے پاس کوئی آدمی آتا ہے اور کسی چیز کا سودا کرتا ہے اور وہ چیز میرے پاس موجود نہیں تو کیا میں بازار سے وہ چیز خرید کر اس کو دے دوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ

امیر یمانیؒ سبل السلام ص ۸۱۰ ج ۳ میں فرماتے ہیں کہ اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ کسی چیز کا مالک بننے سے پہلے اس چیز کی بیع درست نہیں۔

اس ممانعت سے استثناء

قاضی شوکانیؒ نیل الاوطار ص ۱۶۵ ج ۵ میں فرماتے ہیں کہ اس سے دو قسم کی بیع مستثنیٰ ہے ایک بیع سلم اور اس کے استثناء کی وجہ یہ ہے کہ صحیح روایات سے اس بیع کا صحیح ہونا ثابت ہے۔

اور دوسری اس چیز کی بیع مستثنیٰ ہے جو چیز مشتری کے ذمہ میں ہو کیونکہ وہ چیز حاضر مقبوض کی طرح سمجھی جاتی ہے۔ (مثلاً سودا دوکان میں موجود ہے اور یہ آدمی دکان کے علاوہ کسی اور جگہ بیٹھ کر کسی سے سودا کرے۔ اسی طرح بَيْعُ الْاِسْتِصْنَاعِ بھی مستثنیٰ ہے)

بیع فضولی کا حکم

ایک آدمی کسی دوسرے کا مال اس کے وکیل یا اس کا نمائندہ ہونے کی حیثیت کے بغیر ہی بیچ دے تو یہ فضولی ہے اور اس کی جانب سے کی گئی بیع کو بیع فضولی کہتے ہیں۔

مبارکپوریؒ تحفۃ الاحوذی ص ۲۳۷ ج ۲ میں فرماتے ہیں کہ کسی دوسرے کا مال اس کی اجازت کے بغیر بیچنا بھی مَا لَیْسَ عِنْدَکَ میں داخل ہے اور امام شافعیؒ یہی معنی لے کر بیع فضولی کو ناجائز قرار دیتے ہیں اور احناف کے نزدیک بیع فضولی موقوف ہوتی ہے مالک اجازت دے دے تو ٹھیک ورنہ درست نہ ہوگی۔

اور حضرت مدنیؒ کی تقریر ترمذی ص ۲۶۴ میں ہے کہ اس نہی سے بیع سَلَم اور بیع فضولی مستثنیٰ ہیں اور بیع فضولی کی استثناء کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو وہ روایت ہے جس میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے حضرت حکیم بن حزامؓ کو ایک دینار دے کر دنبہ خریدنے کے لیے بھیجا وہ دنبہ خرید کرلا رہے تھے کہ راستہ میں ہی اس کو دو دینار کا بیچ دیا اور پھر ایک دینار کا اور خرید کر لائے اور حضور علیہ السلام کو دینار بھی اور دنبہ بھی پیش کیا۔ اور اس واقعہ پر حضرت حکیم بن حزامؓ دنبہ بیچنے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وکیل نہ تھے اور آپؐ نے اس بیع کو رد بھی نہ فرمایا جو اس کے جواز کی دلیل ہے۔ مگر اس روایت پر اشکال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو وہ دینار صدقہ کر دیا تھا خود نہیں لیا تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس مال کی قربانی کرنے کا ارادہ فرمایا تھا اس میں سے کچھ باقی بچانا مناسب نہ سمجھا اسی لیے تو صدقہ کیا۔ اگر وہ بیع جائز نہ ہوتی تو اس دینار کا صدقہ کرنا ہی جائز نہ ہوتا۔

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اعلاء السنن ص ۱۵۱ ج ۱۴ میں فرماتے ہیں کہ لَا تَبِعْ مَالَیْسَ عِنْدَکَ والی روایت سے بیع فضولی کی نفی نہیں ہوتی اس لیے کہ مشتری کے حوالے کرنے کی قدرت بیع کے مطابق ہوگی۔ اگر بیع بات یعنی فی الفور نافذ ہونے والی ہوگی تو قدرت بھی بات ضروری ہے اور اگر بیع موقوف ہوگی تو قُدْرَت عَلَی التَّسْلِیْم بھی موقوف ہوگی اور یہاں قدرت موقوف موجود ہے اس لیے بیع موقوف درست ہوگی اگر مالک نے اجازت دے دی تو نافذ ہو جائے گی ورنہ کالعدم ہو جائے گی۔

تحفۃ الاحوذی ص ۲۳۷ ج ۲ میں اور حضرت مدنیؒ کی تقریر ترمذی ص ۲۶۴ میں ہے کہ جس چیز پر ابھی تک مشتری نے قبضہ نہیں کیا تو اگر اس کو بیچے گا تو وہ بھی اسی طرح مَالَیْسَ

عِندَکَ میں داخل ہے۔

مبیع پر قبضہ کرنے سے پہلے اس میں تصرف کے بارے میں ائمہ کرام کے اقوال

حضرت گنگوہیؒ الکوکب الداری ص ۳۶۱ میں فرماتے ہیں کہ فقہاء کرامؒ کا اس میں اختلاف ہے کہ مشتری مبیع پر قبضہ کرنے سے پہلے اس میں تصرف کر سکتا ہے یا کہ نہیں۔ امام محمدؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ خواہ مبیع منقولی چیز ہو یا غیر منقولی ہو مثلاً دار وغیرہ تو قبضہ سے پہلے مشتری اس میں تصرف نہیں کر سکتا۔ اور امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ منقولی چیز میں تصرف درست اور غیر منقولی میں درست نہیں ہے لیکن الکوکب الدری کے حاشیہ میں اس پر گرفت کی گئی ہے کہ یہ کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ ہدایہ میں ہے کہ امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک غیر منقولی میں تصرف درست اور منقولی میں درست نہیں ہے اور صاحب ہدایہ نے اس کی دلیل میں یہ بھی فرمایا ہے کہ چونکہ عقار یعنی غیر منقولی چیز میں ضائع ہونا نادر ہے اس لیے تصرف درست ہے اور منقولی چیز میں ہلاک اور ضائع ہونا عام پایا جاتا ہے اس لیے اس میں قبضہ سے پہلے تصرف درست نہیں رکھا گیا اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ صحیح سالم مشتری تک نہ پہنچے اور اس سے قبل ہی ہلاک ہو جائے۔ اس لیے منقولی اور غیر منقولی میں فرق رکھا گیا ہے اور امام احمدؒ کا نظریہ امام ترمذیؒ نے یہ فرمایا ہے کہ صرف طعام میں قبضہ ضروری ہے باقی چیزوں میں مشتری قبضہ سے پہلے بھی تصرف کر سکتا ہے۔ اور امام نوویؒ شرح مسلم ص ۵ ج ۲ میں یہی نظریہ امام مالکؒ کا نقل کرتے ہیں۔

اور امام اسحاق بن راہویہؒ کا نظریہ یہ بیان کیا کہ ان کے نزدیک کیلی اور موزونی چیزوں میں مشتری قبضہ سے پہلے تصرف نہیں کر سکتا باقی چیزوں میں کر سکتا ہے۔

جن حضرات کے نزدیک صرف طعام میں قبضہ سے پہلے بیع ممنوع ہے وہ ان روایات سے استدلال کرتے ہیں جن میں طعام کے الفاظ آتے ہیں جیسا کہ مسلم ص ۵ ج ۲ میں حضرت ابن عباسؓ حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایات ہیں جن میں یہ الفاظ ہیں مَنِ ابْتَاعَ طَعَامًا فَلَا یَبِعْهُ حَتّٰی یَسْتَوْفِیَهٗ۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طعام پر قبضہ کرنے سے پہلے اس کی بیع سے منع فرمایا ہے اور ایک روایت میں ہے مَنِ ابْتَاعَ

طَعَامًا فَلَا يَبِعْهُ حَتّٰى يَقْبِضَهُ جو شخص طعام خریدے تو وہ اس پر قبضہ سے پہلے اس کو نہ بیچے۔ ان روایات کا جواب ایک تو یہ ہے کہ روایت کے راوی حضرت ابن عباسؓ خود فرماتے ہیں وَاَحْسَبُ كُلَّ شَيْئٍ بِمَنْزِلَةِ الطَّعَامِ (مسلم ص ۵ ج ۲) یعنی میں ہر چیز کو طعام کی طرح خیال کرتا ہوں۔ تو صرف طعام پر اس کو دلیل بنانا کیسے درست ہوگا۔

اور ترمذی شریف کی یہ روایت لَا تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ بھی ان کے خلاف دلیل ہے۔

اور امام اسحاق بن راہویہؒ حَتّٰى يَسْتَوْفِيَهُ۔ حَتّٰى يَكْتَالَهُ والی روایات سے استدلال کرتے ہیں کہ ان میں وزن اور کیل کی جانب اشارہ ہے تو اس لیے کیلی اور موزونی چیز میں قبضہ سے پہلے تصرف درست نہیں باقی چیزوں میں جائز ہے۔ ان کا جواب بھی وہی ہے جو طعام کی قید لگانے والوں کو دیا گیا ہے۔

قَوْلُهُ لَا يَحِلُّ سَلَفٌ وَبَيْعٌ

حضرت گنگوہیؒ الکوکب الدری ص ۳۶۰ میں اس کا معنی یہ کرتے ہیں کہ کوئی آدمی کسی سے کوئی چیز اس شرط پر خریدتا ہے کہ بائع اس کو قرضہ دے۔ اور اسی طرح اس کے عکس صورت کہ بائع مشتری سے کہتا ہے کہ میں تجھ پر یہ چیز بیچتا ہوں بشرطیکہ تو مجھے قرضہ دے۔

اور امیر یمانیؒ سبل السلام ص ۸۱۰ ج ۳ میں اس کا معنی یہ کرتے ہیں کہ کوئی آدمی کسی سے صرف ادہار کرنے کی وجہ سے مہنگا سودا خریدتا ہے اور پھر اس خیال سے کہ یہ تو درست نہیں کہ صرف ادہار کی وجہ سے ثمن میں زیادتی کی جائے تو حیلہ یہ کرتا ہے کہ بائع سے رقم قرض لے کر اس کو ثمن کی جگہ دے دیتا ہے تو یہ صورت سلف وبیع کی ہے۔

مبارکپوری صاحبؒ تحفۃ الاحوذی ص ۲۳۷ ج ۲ میں فرماتے ہیں کہ اس صورت میں چونکہ قرض کی وجہ سے قرض دینے والا نفع حاصل کر رہا ہے اور كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ نَفْعًا فَهُوَ حَرَامٌ یعنی جس قرض کی وجہ سے قرض دینے والا نفع حاصل کرے تو وہ نفع حرام ہے تو اس وجہ سے یہ بیع حلال نہیں ہے۔

قَوْلُهُ وَلَا شَرْطَانِ فِيْ بَيْعٍ

جمہور ائمہؒ فرماتے ہیں کہ شرطان (دو شرطوں) کی قید اتفاقی ہے اس لیے کہ اگر بیع میں ایک بھی شرط ایسی ہو جس کا عقد تقاضہ نہیں کرتا تو وہ شرط فاسد ہے اور اسکی وجہ سے بیع

فاسد ہوگی۔

امام احمدؒ کا نظریہ

امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اگر دو شرطیں ہوں تو بیع فاسد ہے اور اگر ایک شرط ہو تو بیع درست ہوگی جیسا کہ کوئی آدمی کسی سے کہتا ہے کہ میں تجھ سے یہ کپڑا خریدتا ہوں بشرطیکہ تو اس کو رنگ بھی دے اور کپڑے مجھ کو سی کر بھی دے تو دو شرطوں کی وجہ سے یہ بیع ناجائز ہے اور اگر ایک شرط ہو جیسا کہ کہتا ہے کہ میں تجھ سے یہ کپڑا خریدتا ہوں بشرطیکہ تو مجھے یہ کپڑا رنگ کر دے یا کہتا ہے کہ مجھے سی کر دے تو جمہور فقہاء کے نزدیک یہ شرط بھی فاسد ہے اور اس کی وجہ سے بیع فاسد ہوگی اور امام احمدؒ کے نزدیک صرف ایک شرط ہونے کی وجہ سے یہ بیع درست ہوگی۔

امام احمدؒ کے دلائل اور ان کے جوابات

امام احمدؒ کی دلیل ایک تو ترمذی شریف کی یہ روایت ہے جس میں وَلَا شَرطَانِ فِیْ بَیْعٍ کے الفاظ ہیں اس کا جواب جمہور کی جانب سے یہ ہے کہ یہ قید اتفاقی ہے۔ اور جمہور کی جانب سے یہ جواب بھی ہے کہ آگے روایت آرہی ہے جس میں نَھٰی عَنْ بَیْعٍ وَ شَرْطٍ کے الفاظ ہیں۔ اور تیسرا جواب حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کی روایت ہے جس میں حضرت بریرہؓ کے خریدنے کا ذکر ہے اور حضرت بریرہؓ کے مالکوں نے ولاء کی شرط لگا دی تھی کہ ولاء ہماری ہوگی تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایسی شرطیں لگاتے ہیں جس کی اللہ اور اس کا رسول اجازت نہیں دیتا۔ اور اس میں ان لوگوں نے صرف ایک ہی شرط لگائی تھی اور یہ روایت ابو داؤد ص ۱۹۲ ج ۲ وغیرہ میں ہے۔

حضرت امام احمدؒ کی طرف سے یہ دلیل بھی پیش کی گئی ہے کہ حضور علیہ السلام نے حضرت جابرؓ سے اونٹ خریدا اور انہوں نے مدینہ پہنچنے تک اس پر سواری کی شرط لگائی۔ اگر ایک شرط لگانا بھی جائز نہ ہوتا تو ایسا نہ ہوتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ امام ابن دقیق العیدؒ احکام الاحکام میں فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اضطراب ہے۔

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ شرط صلب عقد میں نہ تھی بلکہ بیع مکمل ہو جانے کے بعد یہ سواری کی اجازت عاریتاً تھی۔ یہ جواب امام طحاویؒ نے ج ۲ ص ۱۷۹ میں دیا ہے اور

اس کا قرینہ بخاری ج ۱ ص ۳۷۵ کی روایت کے الفاظ میں اَفْقَرَنِیْ ظَهْرَهٗ اِلَى الْمَدِيْنَةِ اور افقار کا معنی اعارہ ہے یعنی حضرت جابرؓ نے فرمایا کہ میں نے وہ اونٹ مدینہ تک سواری کے لیے آپ سے عاریتاً لیا۔

اور تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ صورۃً بیع تھی اور حقیقتاً ہبہ تھا اسی لیے تو حضور علیہ السلام نے اونٹ اور ثمن دونوں چیزیں حضرت جابرؓ کو دے دی تھیں۔

اور چوتھا جواب یہ ہے کہ بیع میں پہلے شرط لگانے کی گنجائش تھی بعد میں یہ منسوخ ہوگئی اور نَهْى عَنْ بَيْعٍ وَ شَرْطٍ اس کے لیے ناسخ ہے۔

قَوْلُهٗ وَلَا رِبْحَ مَا لَمْ يَضْمَنْ

امیر یمانیؒ سبل السلام میں اس کا یہ معنی کرتے ہیں کہ آدمی جس چیز کا مالک نہ ہو اور اس چیز کے ذریعہ سے اگر اس نے نفع حاصل کیا تو وہ نفع اس کے لیے جائز نہیں مثلاً کسی کا غلام غصب کیا اور اس غلام سے کام لیا اور اس کے ذریعہ سے نفع (اس کے ذریعے سے کمایا ہوا مال) حاصل کیا اور پھر مالک کو وہ غلام واپس کر دیا تو غصب کی مدت میں اس غلام کے ذریعہ سے جو نفع اس نے حاصل کیا ہے یہ رِبْحَ مَا لَمْ يُضْمَنْ ہے اور یہ جائز نہیں ہے۔

امیر یمانیؒ اس کا دوسرا معنی یہ کرتے ہیں کہ مَا لَمْ يُضْمَنْ اَیْ مَا لَمْ يُقْبَضْ یعنی جس پر قبضہ نہیں کیا اس کا نفع لینا درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ جب تک مشتری نے قبضہ نہیں کیا، اس وقت تک وہ چیز بائع کی ضمان میں ہے اگر وہ چیز ضائع ہو جائے تو بائع کا مال ضائع ہوگا۔ اور نفع کا حقدار وہی ہوتا ہے جس پر ضمان ہو۔

قَوْلُهٗ قَالَ اِسْحَاقُ بْنُ مَنْصُوْرٍ قُلْتُ لِاَحْمَدَ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اسحاق بن منصور نے فرمایا کہ میں نے امام احمدؒ سے نَهْى عَنْ بَيْعٍ وَّ سَلَفٍ کا معنی دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ کسی سے قرض لے اور پھر اس کی قیمت سے زائد پر اسی آدمی پر بیچے جس سے قرض لیا ہو۔

اور فرماتے ہیں کہ یہ احتمال بھی ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ کسی کو قرض دے کر اس سے کوئی چیز لی ہو اور کہے اگر تو نے مقررہ مدت میں رقم واپس نہ کی تو یہ چیز جو میں نے تجھ سے لی ہے یہ تیری جانب سے مبیعہ بن جائے گا اس رقم کے بدلے جو تو نے مجھ سے لی ہے۔

قَوْلُهٗ قَالَ اِسْحَاقُ كَمَا قَالَ ۔ قَالَ کا فاعل اسحاق بن راہویہؒ ہیں اور یہ پہلے قال

اسحاق بن منصور کے تحت ہے یعنی اسحاق بن منصور نے امام احمدؒ سے بیع و سلف کی تفسیر نقل کر کے کہا کہ اسحاق بن راھویہؒ نے وہی قول کیا ہے جو قول امام احمدؒ کا ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي كَرَاهِيَةِ بَيْعِ الْوَلَاءِ وَهِبَتِهِ

(ولاء کو بیچنے اور ہبہ کرنے کی ممانعت کا بیان)

ولاء واؤ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

وَلاء کی دو قسمیں ہیں۔ ۱۔ وَلَاءُ الْعِتَاقَة ۲۔ وَلَاءُ الْمَوَالَاة۔

وَلَاءُ الْعِتَاقه کا مطلب یہ ہے کہ مالک نے غلام آزاد کیا اور غلام کے مرنے کے وقت اس کا کوئی نسبی یا ذوی الارحام میں سے کوئی شرعی وارث نہ ہو تو اس کے مال کو ولاء کہتے ہیں اور اس کا مستحق اس غلام کو آزاد کرنے والا ہوتا ہے اور اگر وہ پہلے مر چکا ہو تو درجہ بہ درجہ اس آزاد کرنے والے کے عصبات اس کے مستحق ہوں گے۔

اور وَلَاءُ الْمَوَالَاة کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی کسی کے ہاتھ پر مسلمان ہوتا ہے اور اس کے ساتھ معاہدہ کرتا ہے کہ اگر میں تیری زندگی میں مر گیا تو میرا مال تیرا ہوگا اور اگر میں نے کوئی جنایت کی تو اس کی دیت تجھ پر ہوگی۔

حضرت مولانا سید انور شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جب تک دوسرے نے اس کی جنایت کوئی ارش برداشت نہیں کی اس وقت تک اس معاہدہ کو فسخ کیا جا سکتا ہے اور اگر اس نے اس کے کسی جرم کی ارش (تاوان) ادا کر دی تو پھر اس معاہدہ کو فسخ نہیں کیا جا سکتا۔ (العرف الشذی ص ۳۸۹)

اور یہ موالات اس صورت میں درست ہے جبکہ اس کا کوئی شرعی وارث نہ ہو یا اس کے وارثوں کا علم نہ ہو تو احناف کے نزدیک اس کا مال اس آدمی کو دیا جائے گا جس کے ساتھ اس نے موالاۃ قائم کی ہے اور شوافع حضرات کے نزدیک اس موالاۃ کی کوئی حیثیت نہیں ہے ایسی صورت میں ان کے نزدیک وہ مال بیت المال میں جمع کیا جائے گا۔

احناف کے نزدیک بَيْعُ الْوَلَاءِ وَهِبَتِهِ میں وَلَاءُ الْعِتَاقه اور وَلَاءُ الْمَوَالَاة دونوں طرح کی ولاء مراد ہے اور شوافع کے نزدیک صرف ولاء العتاقہ مراد ہے۔ اس لیے کہ وہ ولاء الموالاۃ کے قائل نہیں ہیں۔

ولاء کا معنی

ولاء کس کو کہتے ہیں اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ ولاء سے مراد وہ قرابت داری ہے جو ان دونوں کے درمیان قائم ہوئی ہے تو اس کو بھی نہیں بیچا جا سکتا کیونکہ یہ تو مِنَ الْاَعْیَان (یعنی چیزوں میں سے) نہیں ہے بلکہ مِنَ الْاَعْرَاض ہے اسی احتمال کے پیش نظر امام نووی نے شرح مسلم میں اور حضرت گنگوہی نے الکوکب الدری ص ۳۲۹ میں فرمایا ہے کہ یہ ولاء مال نہیں ہے بلکہ یہ ایسے ہے جیسا کہ کوئی آدمی ابوت (باپ بیٹے کا درمیانی رشتہ) یا اخوت (دو بھائیوں کا درمیانی رشتہ) کو بیچے اور ولاء میں دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد وہ مال ہو جو ولاء کی صورت میں مالک کو ملتا ہے تو وہ معدوم ہے اس لیے اس کی بیع بھی صحیح نہیں ہے۔ اور پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ ولاء اس شخص کو حاصل ہوتی بھی ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مولیٰ اس آزاد کردہ غلام سے پہلے مرجائے تو پھر یہ بیع کس چیز کی کر رہا ہے۔

بعض حضرات سے ولاء کی بیع اور ہبہ کی روایات موجود ہیں جیسا کہ مولانا ظفر احمد عثمانی نے ابن بطال وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ اور حضرت ابن عباسؓ اور عروہؒ ولاء کی بیع کے جواز کے قائل تھے اور حضرت میمونہؓ سے بھی ولاء کے ہبہ کے جواز کی روایت ہے۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ان حضرات کو ولاء کی بیع اور ہبہ سے نہی کی روایات نہ پہنچی ہوں۔ اور امام ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ علماء کا اتفاق ہے کہ ولاء کو نہ بیچا جا سکتا ہے اور نہ ہی ہبہ کیا جا سکتا ہے اور ان کا اس حدیث کے مطابق عمل پر اتفاق ہے۔ صرف حضرت میمونہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے جب سلیمان بن یسار کو آزاد کیا تو اس کی ولاء حضرت ابن عباسؓ کو ہبہ کر دی تھی۔ (اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۱۳۳)

قَوْلَهٗ وَهِمَ فِيْهِ يَحْيَى بْنَ سَلَيْم یحیی بن سلیم جب یہ روایت کرتے ہیں تو عبید اللہ بن عمرؓ اور حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے درمیان نافعؒ کا واسطہ ذکر کرتے ہیں جبکہ دوسرے حضرات نافع کا واسطہ ذکر نہیں کرتے۔ بلکہ عبد اللہ بن دینار کا واسطہ ذکر کرتے ہیں۔ دوسرے حضرات جو یحیی بن سلیم کے اس روایت میں مقابل ہیں وہ ثقات ہیں اس لیے ان کی روایات درست ہیں اور نافع کا واسطہ ذکر کرنے میں یحیی بن سلیم کو وہم ہوا ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ كَرَاهِيَةِ بَيْعِ الْحَيَوَانِ بِالْحَيَوَانِ نَسِيْئَةً

(ادھار کی صورت میں جاندار کی جاندار کے بدلے میں بیع کی ممانعت کا بیان)

علامہ عینیؒ عمدۃ القاری ص ۴۴ ج ۱۲ میں اور قاضی شوکانیؒ نیل الاوطار ص ۲۱۷ ج ۵

میں فرماتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک بَیْعَ الْحَیَوَانِ بِالْحَیَوَان ہر حالت میں جائز ہے خواہ جنس ایک ہو یا مختلف ہو اسی طرح خواہ متفاضلاً (کمی بیشی کے ساتھ) ہو یا نسیئۃ ہو۔ (یہی نظریہ امام شافعیؒ کا ہے)

بَیْعَ الْحَیَوَانِ بِالْحَیَوَانِ کے بارے میں امام مالکؒ کا نظریہ

اور امام مالکؒ کے نزدیک اگر جنس مختلف ہو تو ان کی بیع نسیئہ جائز ہے ورنہ نہیں۔ مثلاً گائے کے بدلے اونٹ وغیرہ کی بیع۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کا نظریہ

اور امام احمدؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک خواہ جنس ایک ہو یا مختلف ہو نسیئۃ کی صورت میں بیع درست نہیں ہے۔

حضرت گنگوہیؒ الکوکب الدری ص ۳۶۱ میں فرماتے ہیں بَیْعَ الْحَیَوَانِ بِالْحَیَوَان نَسِیْئَۃً اس صورت میں ممنوع ہے جبکہ جنس متحد ہو اور اگر جنس مختلف ہو تو پھر کوئی کراہت نہیں ہے۔ اس پر الکوکب الدری کے حاشیہ میں گرفت کی گئی ہے کہ قاعدہ کے مطابق تو یہ درست ہے اس لیے کہ جب قدر اور جنس ایک نہ ہو تو پھر بیع متفاضلاً اور نَسِیْئَۃً ہر طرح جائز ہے۔ اور علامہ ابن رشدؒ نے بھی بدایۃ المجتہد ص ۱۰۰ ج ۲ میں امام ابو حنیفہؒ کا یہی نظریہ لکھا ہے جو حضرت گنگوہیؒ نے لکھا ہے مگر عام طور پر امام ابو حنیفہؒ کا نظریہ وہی بیان کیا گیا ہے جو علامہ عینیؒ اور قاضی شوکانیؒ نے بیان کیا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کی پہلی دلیل

امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کی پہلی دلیل یہی ترمذی شریف کی روایت ہے جو حضرت سمرہؓ سے ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بَیْعَ الْحَیَوَانِ بِالْحَیَوَانِ نَسِیْئَۃً سے منع فرمایا ہے۔

اس روایت پر اعتراض کیا گیا ہے کہ امام بیہقیؒ نے کہا ہے کہ حسنؒ کا حضرت سمرہؓ سے سماع ثابت نہیں ہے اس لیے یہ روایت متصل نہیں۔ مگر اس کی تردید خود امام ترمذیؒ نے کر دی اور فرمایا کہ سِمَاعُ الْحَسَنِ مِنْ سَمُرَۃَ صَحِیْحٌ کہ حسن کا حضرت سمرہؓ سے سماع صحیح ہے۔

دوسری دلیل

اور امام ابو حنیفہؒ کی دوسری دلیل حضرت جابرؓ کی روایت ہے جو امام ترمذیؒ نے ذکر کی ہے جس میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ایک کے بدلہ میں دو جانور کی بیع نسیئہ کی صورت میں درست نہیں۔ اور جب ہاتھ بہ ہاتھ ہوں تو لَا بَأسَ بِہٖ تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

تیسری دلیل

اور امام ابو حنیفہؒ کی تیسری دلیل حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے جو طحاوی ج ۲ ص ۱۸۹ میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ادھار کی صورت میں بیع الحیوان بالحیوان سے منع فرمایا ہے اور یہ روایت اور دار قطنی میں بھی ہے اور امام حنیفہؒ کی چوتھی دلیل حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے جو طحاوی اور طبرانی میں ہے جن کی طرف امام ترمذیؒ نے وفی الباب عن ابن عباسؓ و جابرؓ و ابن عمرؓ کہہ کر اشارہ کیا ہے قاضی شوکانیؒ نیل الاوطار ص ۲۱۸ ج ۵ میں فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ ان روایات میں جو نسیئہ کا ذکر ہے اس سے مراد نَسِیئَہ مِنَ الجَانِبَینِ ہے اور اس صورت کو بَیعَ الکَالِیَ بِالکَالِیَ کہتے ہیں جو بالاتفاق درست نہیں ہے۔

حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ اوجز المسالک ص ۲۵۶ ج ۱۱ میں علامہ ابن حزمؒ سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہاں نسیئہ کو طرفین سے قرار دے کر بَیعَ الکَالِی بالکالی پر اس کو محمول کرنا درست نہیں ہے اس لیے کہ وہ عام ہے اور یہ خاص ہے۔

اور امیر یمانیؒ بھی سبل السلام ص ۸۵۱ ج ۳ میں فرماتے ہیں وَھُوَ لَا یَصِحُ کہ اس کو بَیعَ الکَالِی بالکالی پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے۔ نیز حضرت جابرؓ کی روایت میں وَلَا بَاْسَ بِہٖ یَدًا بِیَدٍ کے الفاظ ہیں جو نَسِیئَہ مِنَ الجَانِبَینِ کی نفی کرتے ہیں اس لیے کہ یَدًا بِیَدٍ کا مقابل مطلق نَسِیئَہ ہے نہ کہ نَسِیئَہ مِنَ الجَانِبَینِ۔

اعتراض اور اس کا جواب

حضرت ابن عمرؓ کی روایت پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کا خود اس پر عمل نہیں تھا جیسا کہ موطا امام مالک ص ۵۹۱ میں روایت ہے کہ انہوں نے اِشتَرٰی رَاحِلَۃً بِاَربَعَۃِ اَبعِرَۃٍ مَضمُونَۃٍ عَلَیہِ یعنی انہوں نے چار اونٹوں کے بدلے سواری کے قابل ایک طاقتور اونٹنی خریدی۔ تو جب راوی کا عمل اپنی مروی روایت کے خلاف ہو تو وہ روایت

موول یا منسوخ ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مصنف عبد الرزاق میں روایت ہے کہ طاؤسؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے ایک اونٹ کے بدلہ دو اونٹ کی نسیئہ کی صورت میں بیع کے بارہ میں پوچھا تو انہوں نے کَرِھَہٗ اس کو اچھا نہ سمجھا۔ اور اسی طرح کی روایت ابن ابی شیبہ میں ہے کہ ابن سیرینؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے پوچھا اَلْبَعِیْرَ بِالْبَعِیْرَیْنِ اِلٰی اَجَلٍ فَکَرِھَہٗ تو قولی روایت اور فتوی سے کراہت معلوم ہو رہی ہے اس لیے اس کو ترجیح ہوگی۔ اور ان دونوں قسم کی قولی اور فعلی روایات کو تطبیق بھی دی جاتی سکتی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نہی کو تنزیہ پر محمول کرتے ہوں جو کہ جواز کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے۔ (اوجز المسالک ص ۲۵۶ ج ۱۱)

حضرت امام شافعیؒ کی پہلی دلیل۔ امام شافعیؒ اپنے نظریہ پر حضرت عبد اللہ بن عمروؓ کی روایت پیش کرتے ہیں جو مسند احمد ص ابوداؤد ج ۲ ص ۱۲۱ اور دار قطنی ص میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے مجھے حکم فرمایا (اور یہ بیت المال کے جانوروں کی دیکھ بھال پر مامور تھے) کہ میرے پاس جو اونٹ ہیں ان پر مجاہدین کو سوار کر کے لشکر بھیجوں۔ میں لوگوں کو سوار کرتا رہا یہاں تک کہ سواریاں ختم ہوگئیں اور لوگ باقی تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا کہ صدقہ کی اونٹنیوں کے بدلے اونٹ خرید لے تو میں دو دو اور تین تین اونٹنیوں کے بدلہ میں ایک ایک اونٹ خریدتا رہا حالانکہ اس وقت اونٹنیاں بیت المال میں موجود نہ تھیں پھر جب صدقہ کا مال آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ اونٹنیاں ان لوگوں کو ادا کیں جن سے اونٹ لیے تھے اس روایت سے بَیْعُ الْحَیَوَانِ بِالْحَیَوَانِ نَسِیْئَۃً کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

اس کا جواب

مبارکپوری صاحبؒ تحفۃ الاحوذی ص ۲۳۹ ج ۲ میں قاضی شوکانیؒ کی نیل الاوطار ص ۲۱۷ ج ۵ سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فِیْ اِسْنَادِہٖ مُحَمَّدُ بْنُ اِسْحَاقَ وَفِیْہِ مَقَالٌ مَعْرُوْفٌ کہ اس روایت کی سند میں محمد بن اسحاق ہے جس کے بارہ میں محدثین کا کلام معروف ہے۔

اور قاضی شوکانیؒ فرماتے ہیں وَقَالَ الْخَطَّابِیُّ فِیْ اِسْنَادِہٖ مَقَالٌ (نیل الاوطار ص ۲۱۷ ج ۵) کہ امام خطابیؒ نے کہا ہے کہ اس کی سند میں کلام ہے۔

امام شافعیؒ کی دوسری دلیل۔ موطا امام مالک ص ۵۹۱ میں حضرت علیؓ کا اثر موجود ہے کہ انہوں نے ایک میعاد تک ایک اونٹ بیس اونٹوں کے بدلہ میں بیچا۔

اس کا پہلا جواب

قاضی شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت منقطع ہے اس لیے کہ اس میں حسن بن علی اور حضرت علیؓ کے درمیان اِنقطاع ہے۔

دوسرا جواب

حضرت علیؓ سے اس کے خلاف ثابت ہے جو مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ انہوں نے ایک اونٹ کی بیع دو اونٹوں کے بدلہ میں نسیئہ کی صورت میں مکروہ قرار دی۔

الغرض قاضی شوکانی نیل الاوطار ص ۲۱۸ ج ۵ میں فرماتے ہیں کہ نہی کی احادیث ایک دوسری کے لیے تقویت کا باعث بن کر راجح ہیں اس روایت پر جس پر جرح بھی موجود ہے۔ نیز امام ترمذیؒ نے نہی کی روایت کو حَسَنٌ صَحِیْح قرار دیا ہے (ترمذی ج ۱ ص ۲۴۳)

اور اصول حدیث کا قاعدہ ہے کہ جب مُحَرِّم اور مُبیح روایات میں تعارض ہو تو محرم کو ترجیح ہوتی ہے اور یہاں نہی کی روایات محرم ہیں اور حضرت عبد اللہ بن عمروؓ کی روایت مبیح ہے اس لیے محرم کو مبیح پر ترجیح ہوگی اور آثار صحابہ خود مختلف ہیں اس لیے ان میں کوئی حجت نہیں ہے۔

امام مالکؒ کی دلیل اور اس کا جواب

امام مالکؒ کا نظریہ اس بارہ میں یہ ہے کہ اگر جنس ایک ہو تو بیع نسیئۃ (ادہار) درست نہیں ہے اور ایک جنس کے تعین میں مالکیہ کا آپس میں اختلاف ہے۔

علامہ ابن رشدؒ فرماتے ہیں کہ اگر مبیعہ غیر مطعومہ یعنی خوراک اور طعام کی مد سے نہ ہو تو امام مالکؒ کے نزدیک اگر جانبین (بائع اور مشتری) سے دی جانے والی اشیاء کا منافع ایک جیسا ہو تو تفاضل (زیادتی) جائز ہے اور نسیئہ (ادہار) جائز نہیں ہے (بدایۃ المجتہد ص ۱۰۰ ج ۲ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منافع ایک جیسا ہو تو ایک جنس قرار پائے گی بعض مالکیہ نے کہا ہے کہ منافع ایک ہونے کے ساتھ ساتھ اسماء (نام) میں بھی اتفاق ہو تو وہ ایک جنس ہوگی۔ بعض مالکیہ نے کہا کہ بے شک جانبین سے دی جانے والی اشیاء کے نام ایک ہوں مگر منافع مختلف ہوں تو وہ الگ الگ جنس شمار ہوں گی۔ جیسا کہ دونوں جانب سے دودھ دینے والی بکریاں ہوں تو ان کی بیع نسیئۃً ناجائز ہوگی اور اگر ایک جانب دودھ دینے والی اور دوسری جانب ماکولہ یعنی وہ بکری جو دودھ دینے والی نہ ہو بلکہ اس کو صرف کھایا جا سکتا ہو تو

ان کا منافع مختلف ہے اس لیے بعض مالکیہ کے نزدیک ان کی آپس میں بیع نسیئۃ جائز ہے اور بعض کے نزدیک جائز نہیں ہے مالکیہ کے پاس اپنے اس نظریہ پر کوئی روایت نہیں ہے۔ علامہ ابن رشد فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ نسیئہ کی ممانعت میں مدار سَدًا لِلذَّرِیعَہ کو رکھتے ہیں (بدایۃ المجتہد ص ۱۰۱ ج ۲) یعنی ربا سے بچنے کے لیے یہ صورت اختیار کی ہے۔ امام مالکؒ کے جواب میں اتنا ہی کافی ہے کہ روایات کی موجودگی میں اس قسم کے قیاس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي شِرَاءِ الْعَبْدِ بِالْعَبْدَيْنِ

(ایک غلام کے بدلے دو غلام خریدنے کا بیان)

اگر جاندار کی جاندار کے بدلے بیع نقد ہو تو بالاتفاق جائز ہے بے شک ظاہرا یا حکما متفاضل ہو۔ ظاہرا" متفاضل کا مطلب یہ ہے کہ ایک بڑا اور دوسرا چھوٹا ہو یا ایک کے بدلہ میں دو ہوں۔ اور حکما متفاضل کا مطلب یہ ہے کہ ایک کی قیمت زیادہ ہو اور دوسرے جاندار کی قیمت کم ہو۔ تو اگر بیع نقد کی صورت میں ہو تو جائز ہے اور یہ شِرَاءُ الْعَبْدِ بِالْعَبْدَيْنِ کی صورت نقد تھی اس لیے یہ روایت ائمہ میں سے کسی کے خلاف نہیں ہے اور حیوان اشیاء ربویہ میں سے نہیں ہے اس لیے ان کی بیع متفاضلا جائز ہے یعنی ان میں ربوا کی علت نہیں پائی جاتی۔ اور ادھار کی صورت میں ائمہ کا جو اختلاف ہے وہ بَيْعُ الْحَيَوَانِ بِالْحَيَوَانِ نَسِيئَةً کے باب میں گزر چکا ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ اَنَّ الْحِنْطَةَ بِالْحِنْطَةِ مِثْلًا بِمِثْلٍ وَكَرَاهِيَةِ التَّفَاضُلِ فِيهِ

گندم کے بدلے گندم کی بیع برابری کی صورت میں درست اور کمی بیشی کی صورت میں ممنوع ہونے کا بیان)

امام ترمذیؒ نے اس باب کے تحت حضرت عبادۃ بن الصامتؓ کی روایت بیان کی ہے جس میں حضور علیہ السلام نے چھ اشیاء کا ذکر فرمایا ہے اَلذَّهَبُ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ وَالتَّمْرَ بِالتَّمْرِ وَالْبُرَّ بِالْبُرِّ وَالْمِلْحَ بِالْمِلْحِ وَالشَّعِيْرَ بِالشَّعِيْرِ اور فرمایا کہ ان کی بیع مِثْلًا بِمِثْلٍ (برابر) يَدًا بِيَدٍ (نقد) کی صورت میں جائز ہے ان میں تفاضل (کمی بیشی) بھی

درست نہیں اور نہ ہی نسیئہ (ادھار) درست ہے۔

اہل ظاہر کے نزدیک تفاضل کی ممانعت ان ہی چھ اشیاء میں ہے باقی کسی چیز میں ممانعت نہیں ہے۔ اور باقی حضرات نے ان اشیاء میں ممانعت کی علت تلاش کر کے حکم کا مدار اس علت پر رکھا ہے۔

عِلّت کیا ہے؟

اس علت میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ علت طَعَمِیَۃ وَثَمَنِیَۃ ہے یعنی وہ چیز خوراک کے زمرہ سے ہو یا ثمن ہو۔ سونے اور چاندی میں حکم ثمنیت کی وجہ سے اور باقی چیزوں میں طعمیت کی وجہ سے ہے۔ اسی طرح اگر یہ علت کسی اور چیز میں پائی جائے تو اس میں بھی حکم ثابت ہوگا امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ان میں علت اَلطَّعَمَ وَالاِدِّخَارَ ہے یعنی وہ چیز خوراک کے زمرہ سے ہو اور ایسی ہو جس کو ذخیرہ بنا کر رکھا جا سکے جلد خراب ہو جانے والی چیز میں یہ حکم نہ ہوگا۔ امام احمدؒ کے نزدیک ربوا کی علت الطعم ہے یعنی وہ چیز خوراک کے زمرہ سے ہو۔ احناف کے نزدیک علت قدر اور جنس ہے اگر قدر اور جنس ایک ہو تو تفاضل اور نسیئہ دونوں ممنوع ہوں گے اور اگر جنس مختلف ہو تو تفاضل جائز اور نسیئہ ممنوع ہوگا جیسا کہ سونے کو چاندی کے بدلے یا گندم کو جو یا چاول کے بدلہ میں بیچنا۔ اگر جانبین (بائع اور مشتری) سے دی جانے والی اشیاء ایک جنس کی ہوں تو مساوات یعنی ان کا برابر ہونا ضروری ہے اور اس میں اس کا اعلی یا گھٹیا ہونے کا لحاظ نہیں ہوگا اور اگر جنس مختلف ہو تو تفاضل جائز ہے جیسا کہ ایک من گندم کے بدلہ میں دو من چاول وغیرہ بیچنا۔

جمہور کے نزدیک گندم اور جو دو الگ الگ نوع ہیں اس لیے ان میں تفاضل جائز ہے اور امام مالکؒ کا قول یہ نقل کیا گیا ہے کہ ان کے نزدیک گندم اور جو ایک ہی نوع ہیں اس لیے ان میں تفاضل درست نہیں ہے اور امام ترمذیؒ نے بھی امام مالک کا یہ قول نقل کیا ہے۔

امام مالکؒ کے نظریہ کا جواب یہ ہے کہ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں وَالقَوْلَ الاَوَّلَ اَصَحّ یعنی جو حضرات گندم اور جو کو الگ الگ نوع بتاتے ہیں ان کا قول زیادہ صحیح ہے۔ نیز امام مالک کے نظریہ کا جواب اس روایت میں بھی موجود ہے جو امام ترمذی نے ذکر کی ہے جس میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بِیعُوا الشَّعِیرَ بِالبُرِّ کَیفَ شِئتُم یَدًا بِیَدٍ

(ترمذی ج ۱ ص ۲۳۵)

اگر ایسی صورت ہو کہ جانبین سے ایک ہی جنس کی بیع ہو مگر ایک جانب اعلیٰ اور دوسری قسم گھٹیا ہو تو اس میں ایسا کرنا چاہئے کہ ان میں سے ایک بیع نقدی میں پہلے کر کے دوسری چیز کی بیع بعد میں علیحدہ کر لی جائے اور جتنی قیمت پہلی چیز کی مقرر ہوئی اس کے بدلے میں وہ چیز دے کر ساتھ وہ اضافہ دے دیا جائے جو دوسری چیز کی بیع میں تھا تا کہ کسی جانب کو نقصان بھی نہ ہو اور ربوا (سود) سے بھی بچ جائیں اور اس قسم کا حیلہ جائز ہے چنانچہ بخاری ج ۱ ص ۲۱۱ اور مسلم ص ۲۶ ج ۲ میں حضرت بلالؓ کی اور بخاری ص ۲۹۳ ج ۱ مسلم ص ۲۶ ج ۲ کی حضرت ابو سعید الخدریؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایات میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلیٰ اور گھٹیا ایک ہی جنس کی بیع کی صورت میں یہ طریق بتایا بِعِ التَّمَرَ بِبَيْعٍ اٰخَرَ ثُمَّ اشْتَرِ بِهٖ پہلے اپنی کھجوروں کو بیچ پھر دوسری کھجوروں کو الگ بیع کے ساتھ خرید لے۔

حیلوں کی مختلف اقسام ہیں بعض جائز ہیں اور بعض ناجائز ہیں۔

فتح الباری ص ۲۶۹ ج ۱۲ میں ہے کہ حیلہ دو قسم پر ہے۔ ا۔ مباح حیلہ ۲۔ مذموم حیلہ۔

مباح حیلہ کی تعریف یہ ہے مَا يُتَوَصَّلُ بِهٖ اِلَى مَقْصُوْدٍ بِطَرِيْقٍ خَفِيٍّ مُبَاحٍ یعنی مباح مخفی طریق سے مقصود تک جس کے ذریعہ سے پہنچا جائے وہ مباح حیلہ ہے۔

علامہ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ جس سے اللہ تعالیٰ کے کسی حق کو ساقط کیا جائے' وہ حرام حیلہ ہے۔

حضرت ملا علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ (سورۃ یوسف آیت ۷۶) اور وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ (سورۃ ص آیت ۴۴) جیسی آیات میں جو حیلہ ہے اور اسی طرح احادیث میں اعلیٰ کھجوروں کو ردی کھجوروں کی الگ الگ بیع کا جو طریق بتایا گیا ہے یہ مباح حیلہ ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ حق تک پہنچنے اور نقصان سے بچنے کا جو حیلہ ہے وہ جائز ہے اور جو حق ثابت ہو جانے کے بعد حق کو باطل کرنے کے لیے کیا جائے وہ حیلہ باطل ہے اور اسی کے مثل علامہ ابن حجرؒ نے فتح الباری ج ۱۲ ص ۲۶۹ میں امام محمد بن الحسنؒ سے نقل کیا ہے۔

علماء احناف صرف ایسے ہی حیلوں کو جائز قرار دیتے ہیں جو قرآن کریم اور احادیث سے ثابت ہیں اور جو حیلے مذموم اور باطل ہیں ان کا سختی سے انکار کرتے ہیں۔

بَابُ مَاجَاءَ فِی الصَّرفِ
(بیع صرف (نقدی کو نقدی کے بدلے بیچنے) کا بیان)

صاحب ہدایہؒ فرماتے ہیں کہ صرف کا لغوی معنی ہے النقل والرد اور صرف کا لغوی معنی الزیادۃ بھی ہے۔ اور بیع صرف اس کو کہتے ہیں کہ بائع اور مشتری دونوں بیع کی صورت میں جن چیزوں کا تبادلہ کر رہے ہیں ان میں سے ہر ایک مِنْ جنسِ الاَثمان ہو (یعنی سونا اور چاندی ہو سونے اور چاندی کو اپنے اصل کے لحاظ سے ثمن قرار دیا جاتا ہے خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہوں۔ سکے کی شکل میں یا ڈلی اور زیورات کی شکل میں ہوں) اور لغوی معنی اَلنَّقلَ وَالرَّدّ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس بیع کو صرف کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک بدل ایک کی ملکیت سے دوسرے کی ملکیت میں منتقل ہو جاتا ہے اور اگر لغوی معنی الزیادۃ کو پیش نظر رکھا جائے تو پھر اس بیع کو صرف کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس بیع میں زیادتی ہی مطلوب ہوتی ہے اس لیے اس کو بیع صرف کہتے ہیں (ہدایہ ص ۸۷ ج ۳)

اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ بیع صرف وہ ہوتی ہے جس میں مبیع اور ثمن دونوں نقدی ہوں یعنی سونا یا چاندی ہوں۔ خواہ سونے کے بدلہ میں سونا ہو یا چاندی ہو۔ سونا اور چاندی اپنے اصل کے اعتبار سے ثمن ہیں اور باقی چیزیں اصل کے لحاظ سے ثمن نہیں ہیں۔ (العرف الشذی ص ۳۹۰)

علامہ عینیؒ شرح ہدایہ میں فرماتے ہیں کہ بیع صرف کے جواز کی تین شرطیں ہیں۔

۱۔ جانبین (بائع اور مشتری) سے جدا ہونے سے پہلے پہلے قبضہ کرنا۔ ۲۔ جانبین میں سے کسی کو شرط خیار نہ ہونا۔ ۳۔ کسی جانب سے ادہار نہ ہو۔ اگر یہ بیع بجنسہ ہو یعنی سونے کے بدلہ میں سونا ہو اور چاندی کے بدلہ میں چاندی ہو تو ایسی صورت میں تفاضل (کمی بیشی) اور نسیئہ (ادہار) دونوں ممنوع ہیں اور اگر بغیر جنسہ ہو یعنی سونے کے بدلہ میں چاندی ہو تو ایسی صورت میں تفاضل جائز اور نسیئہ ممنوع ہے۔ اور اس میں جید اور ردی کا اعتبار نہ ہوگا اور اسی طرح مضروب (سکہ) اور غیر مضروب کا لحاظ نہ ہوگا بلکہ وزن کا اعتبار ہوگا۔ (عینی شرح ہدایہ ص ۲۱۴ ج ۳)

اور علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ بیع صَرف میں جانبین سے قبضہ بالاجماع ضروری ہے اور اس بارہ میں حضرت ابن عباسؓ سے اس کے خلاف جو قول منقول ہے، تو اس سے ان کا

رجوع ثابت ہے۔ (العرف الشذی ص ۳۹۰)
حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ فرماتے ہیں کہ امام خطابیؒ نے فرمایا ہے کہ عامۃ المسلمین کا یہی قول ہے کہ بیع صرف میں قبضہ مِنَ الْجَانِبَین ضروری ہے اور ایک جنس ہونے کی صورت میں تفاضل جائز نہیں ہے۔ البتہ حضرت اسامہ بن زیدؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ وہ ایک درہم کی بیع دو دراہم کے بدلے میں جائز قرار دیتے تھے مگر اس سے ان کا رجوع ثابت ہے۔ (بذل المجہود ج ۵ ص ۲۴۵)
اور مبارکپوریؒ صاحب فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں حضرت ابن عمرؓ کا اختلاف بھی منقول ہے مگر ان کا بھی رجوع ثابت ہے اور حضرت ابن عباسؓ کے رجوع کے بارہ میں اقوال مختلف ہیں اور پھر فتح الباری ص ۳۸۲ ج ۴ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ ان کا رجوع بھی ثابت ہے کہ ابو الصہباء کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ سے مکہ میں اس کے بارہ میں سوال کیا تو انہوں نے کرھہ اس کو ناپسند قرار دیا۔ (تحفۃ الاحوذی ص ۲۴۰ ج ۲)
اور حضرت ابن عباسؓ وغیرہ کی دلیل یہ تھی کہ حضور علیہ السلام نے ایسی اشیاء کی بیع میں فرمایا ہے لَا رِبَا اِلَّا فِی النَّسِیْئَۃِ یعنی صرف ادہار کی صورت میں سود ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت مُحْتَمَل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ایسی صورت میں ہو جبکہ جانبین سے جنس مختلف ہوں۔ جبکہ اس کے بر خلاف حضرت ابو سعید الخدریؓ کی روایت جو امام ترمذی نے تحت الباب ذکر کی ہے وہ اپنے مفہوم میں واضح ہے اس لیے اس روایت کو ترجیح ہوگی اور قاضی شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ لَا رِبَا اِلَّا فِی النَّسِیْئَۃِ میں نفی اصل کی نہیں بلکہ نفی اکمل کی ہے کہ جس قسم کا سخت ربوا جس پر شدید وعید آئی ہے اس قسم کا ربا نہیں ہے (نیل الاوطار ص ۲۰۳ ج ۵)

اِسْتِبْدَالِ ثَمَن کے بارے میں ائمہ کرام کے اقوال

قَوْلُہٗ قَالَ کُنْتُ اَبِیْعُ الْاِبِلَ بِالْبَقِیْعِ فَاَبِیْعُ بِالدَّنَانِیْرِ فَاٰخُذُ مَکَانَہَا الْوَرِقَ
اگر کوئی آدمی سودا دراہم کے ساتھ کرتا ہے مگر ان کی جگہ دینار دیتا ہے یا سودا دینار کے ساتھ کرتا اور اس کی جگہ دراہم دیتا ہے تو کیا درست ہے یا نہیں اس میں ائمہ کا اختلاف ہے امام احمدؒ فرماتے ہیں بِسِعْرِ یَوْمِھَا جائز ہے یعنی درہم اور دینار کی اس دن کی جو قیمت ہوگی اس کے حساب سے جائز ہے اور وہ اپنی تائید میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت کے ان الفاظ کو دلیل بناتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا لَا بَأْسَ بِہٖ

بِالْقِیْمَةِ (ترمذی ج ۱ ص ۲۳۵)

حضرت سعید بن المسیبؒ اور ایک روایت امام شافعیؒ سے یہ ہے کہ استبدال ثمن ہر حال میں مکروہ ہے۔ یعنی جو چیز ثمن میں طے کی ہو، وہی ادا کرے اس کو بدلنا مکروہ ہے۔

اور امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعی مشہور روایت کے مطابق یہ فرماتے ہیں کہ استبدال ثمن ہر حال میں جائز ہے خواہ بِسِعْرِ یَوْمِهَا ہو یا کمی بیشی کے ساتھ ہو۔ اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے اِذَا اخْتَلَفَتْ هٰذِهِ الْاَصْنَافُ فَبِیْعُوا کیف شئتم اِذَا کَانَ یَدًا بِیَدٍ (مسلم ج ۲ ص ۲۵)

امام سرخسیؒ فرماتے ہیں کہ استبدال ثمن اس وقت درست ہے جبکہ صاحب الحق راضی ہو (المبسوط ص ۱۸ ج ۱۴)

اور مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ جن روایات میں بِسِعْرِ یَوْمِهَا کے الفاظ ہیں یہ الفاظ صاحب حق کے راضی ہونے سے کنایہ ہوں۔ اس لیے کہ ظاہر یہی ہے کہ صاحب حق بھاؤ کے خلاف پر راضی نہیں ہوتا۔ (اعلاء السنن ص ۲۴۶ ج ۱۴)

امام احمدؒ کی دلیل ابوداؤد ص ۱۲۰ ج ۲ وغیرہ کی وہ روایت ہے جس میں الفاظ ہیں لَا بَأْسَ اَنْ تَاْخُذَ بِسِعْرِ یَوْمِهَا یعنی اگر تو اس دن کے بھاؤ کے مطابق لے لے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ تو امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ بِسِعْرِ یَوْمِهَا کا لحاظ رکھا جائے گا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ امیر یمانیؒ فرماتے ہیں کہ وَاَمَّا قَوْلُهٗ فِیْ رِوَایَةِ اَبِیْ دَاؤُدَ بِسِعْرِ یَوْمِهَا فَالظَّاهِرُ اَنَّهٗ غَیْرُ شَرْطٍ یعنی اسی دن کے بھاؤ کا بیان شرط کے طور پر نہیں ہے (سبل السلام ص ۸۱۳ ج ۳)

قَوْلُهٗ لَا تُشِفُّوْا بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ

لَا تُشِفُّوْا اِشْفَافٌ سے ہے اور یہ لفظ مِنَ الْاَضْدَادِ ہے یعنی اس کا معنی کمی کرنا اور زیادتی کرنا دونوں طرح آتا ہے۔

قَوْلُهٗ لَا تَبِیْعُوْا مِنْهَا غَائِبًا بِنَاجِزٍ۔ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ غَائِبًا بِنَاجِزٍ کا مطلب یہ ہے موجل کو حال کے بدلہ میں مت بیچو۔ (فتح الباری ص ۳۸۰ ج ۴)

حضرت مالکؓ بن اوس کی روایت جو ترمذی ج ۱ ص ۲۳۵ میں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ بیع صرف میں اتنی مہلت کی اجازت بھی نہ دیتے تھے کہ آدمی اپنے خادم کے آنے کا انتظار کرے۔

قَوْلُہٗ اِلاَّ ھَاءَ وَھَاءَ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ ھاء کو مد کے ساتھ اور قصر کے ساتھ دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے اور یہ اصل میں ھَاکَ تھا کاف کی جگہ ہمزہ لے آئے اور اس کا معنی یہ ہے کہ بائع اور مشتری میں سے کوئی ایک دوسرے کو کہتا ہے خُذْ ھٰذا اور دوسرا بھی اسی طرح کہے (نووی شرح مسلم ص ۲۴ ج ۲) اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ بائع اور مشتری میں سے ہر ایک مبیعہ اور ثمن کو ایک دوسرے کے حوالے دست بدست کریں۔

کرنسی نوٹوں کا حکم

کرنسی نوٹ کے بارہ میں حضرات مفتیان کرام کی عبارات مختلف ہیں اور اس کا مدار اس تحقیق پر ہے کہ نوٹ کی حیثیت کیا ہے؟ پہلے نوٹ کی حیثیت کچھ اور تھی اور آج کے زمانہ میں کچھ اور ہے۔ اس لیے مفتیان کرام نے اپنے اپنے دور کے لحاظ سے فتوے دیے ہیں۔

پہلے نوٹ کی حیثیت یہ تھی کہ حکومت کے پاس جتنی مالیت کی نقدی یعنی سونا یا چاندی ہوتی تھی اسی کے مطابق نوٹ چھاپے جاتے تھے اور وہ نوٹ مالیت نہیں بلکہ زر ضمانت تھے کہ نوٹ والا جب بھی اصل نقدی سونا اور چاندی حاصل کرنا چاہے تو حکومت اس کو دے گی۔ اصل مالیت حکومت کے پاس ہوتی تھی اور نوٹ حکومت کی جانب سے ضمانت نامہ ہوتا تھا۔ اسی کے پیش نظر اس دور کے مفتیان کرام نے فتوے دیے کہ نوٹ مال نہیں بلکہ مال کی سند ہے اور محض حوالہ ہے یعنی حکومت کے ذمہ جو قرضہ ہے اس کے وصول کرنے کا ذریعہ ہے اور اس کی تفصیل مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ کے فتاویٰ امداد الاحکام ص ۱۱ ج ۲ میں دیکھی جا سکتی ہے اور اسی کے مطابق حضرت تھانویؒ نے لکھا ہے کہ معاملہ نوٹ حوالہ ہے بیع نہیں۔ (امداد الفتاویٰ ص ۶۷ ج ۳) اسی وجہ سے ان حضرات نے کہا کہ نوٹ کے ذریعہ سے اگر زکوٰۃ ادا کی گئی تو وہ زکوٰۃ اس وقت تک ادا نہ ہوگی جب تک فقیر اس سے سامان خرید نہ لے۔ اور اگر اس فقیر کے سودا خریدنے سے پہلے ہی نوٹ ضائع ہوگیا تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

پھر اس کے بعد نوٹ کی حیثیت میں تبدیلی آگئی اور حکومت نے اس کا لحاظ کیے بغیر کہ اتنی مالیت کی نقدی ہے یا نہیں نوٹ جاری کرنا شروع کر دیے اور ان ہی نوٹوں پر کاروبار شروع ہوگیا۔ اور نقد کی جانب توجہ ہی نہ رہی تو اس بدلتی ہوئی حیثیت کی وجہ سے مفتیان کرام نے پہلے حضرات سے کچھ مختلف فتوے دیے۔

دارالعلوم دیوبند کے مفتی صاحب سے سوال کیا گیا کہ اگر کسی آدمی کے پاس اصل نقدی نہیں بلکہ نوٹ ہیں تو کیا آدمی اصل نقدی ملنے تک زکوٰۃ کی ادائیگی مؤخر کرے یا نوٹوں سے زکوٰۃ دے دے تو اس کا جواب دیا گیا کہ موجودہ دور میں نقد کا انتظار بے سود ہے اس وجہ سے کہ نقد پایا ہی نہیں جاتا اس لیے نوٹ اگر نصاب بھر ہیں تو اس پر زکوٰۃ اور اس کی ادائیگی واجب ہے۔ (فتاویٰ دارالعلوم ص ۱۰۸ ج ۶)

اور ایک سوال کے جواب میں مفتی محمود الحسن صاحب گنگوہی فرماتے ہیں کہ اگر ڈالر کی حیثیت وہ ہے جو کہ انڈیا میں نوٹ کی ہے کہ اصالتاً وہ رسید اور حوالہ تھا اس رقم کا جو اس میں درج ہے کہ اس کے ذریعہ رقم وصول کی جا سکتی ہے لیکن رفتہ رفتہ اب رقم تقریباً معدوم ہو چکی اور سب جگہ نوٹ ہی رقم کی طرح مستعمل ہے پس یہ نوٹ بھی اب مبیع بن چکا ہے اس کی بیع کمی زیادتی کے ساتھ درست ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ص ۳۱۰ ج ۱۱)

اور غیر مقلدین کے شیخ الکل مولانا نذیر حسین دہلویؒ لکھتے ہیں حاصل کلام حکم نوٹ کا مثل حکم دراہم متعین کے ہوگا اور نیز بیع و شراء اس میں مثل دراہم کے جاری ہوگی۔ (فتاویٰ نذیریہ ص ۱۷۱ ج ۲) اور موجودہ دور کے فقیہ عالم دین مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دام مجدہم کی بھی یہی رائے ہے کہ موجودہ دور میں نوٹ عرفی ثمن بن گئے ہیں اور اب یہ حوالہ کی حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔ (کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم ص ۷) اور اسی نظریہ کی تائید ہندوستانی جید علماء کرام نے کی ہے۔ تفصیل کے لیے جدید فقہی مباحث کا مطالعہ فرمائیں۔

اشکال

اگر نوٹ کی موجودہ حیثیت جو مفتیان کرام نے ظاہر کی ہے اس کا لحاظ رکھا جائے تو اشکال ہوتا ہے کہ نوٹ تو کاغذ ہے اس کو ثمن کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے کہ کسی بھی دھات تانبہ، کانسی وغیرہ حتی کہ چمڑے کے ٹکڑوں کو بھی کرنسی اور نقد بنایا جاتا رہا ہے اور ایسی حیثیت میں ان کی اپنی حیثیت باقی رہتی بلکہ ان کی جو قیمت حکومت یا عرف کے لحاظ سے مقرر کی جاتی ہے اس کا لحاظ سے ہوتا ہے اسی جیسے ایک سوال کے جواب میں مفتی محمود الحسن صاحب فرماتے ہیں سلور، تانبہ، کانسی وغیرہ کو اگر سکہ بنا لیا جائے تو اس کو اصطلاحاً ثمن کہا جائے گا حقیقت میں وہ ثمن نہیں (فتاویٰ محمودیہ ص ۳۷۲ ج ۶)

یہاں بھی عرفی اور اصطلاحی ثمن قرار پانے کے بعد ان نوٹوں کی کاغذی حیثیت باقی نہ

رہے گی بلکہ ان کی جو قیمت مقرر کی گئی ہے اس کا لحاظ ہوگا۔

کرنسی نوٹ ایک جنس ہیں یا مختلف اجناس ہیں؟

ایک ملک کے نوٹ' مُتّحِدُ الْجِنَس ہوں گے اور ان میں ان کی اکائی قیمت کا لحاظ ہوگا۔ دس کے نوٹ میں دس اکائیاں ہیں تو یہ ایک ایک کے دس اور دو دو کے پانچ اور پانچ پانچ کے دو نوٹوں کے برابر ہوگا۔ اس لیے نوٹ کی بیع نوٹ کے بدلہ میں برابر ہی ہونی چاہیے ان کی مقرر کردہ قیمت سے زائد وصول کرنا درست نہ ہوگا۔ پانچ کا نوٹ پانچ ہی کا ہوگا اس میں کمی بیشی درست نہ ہوگی۔ اسی طرح جب ایک ملک کے نوٹ ایک جنس قرار دیے گئے تو ان میں نئے اور پرانے کا لحاظ نہیں ہوگا اس لیے پرانے نوٹ زیادہ دے کر نئے نوٹ کم لینا جیسا یہ طریق رائج ہو رہا ہے۔ یہ کاروبار درست نہیں ہے بلکہ یہ سود ہے۔

اور اگر جانبین سے ایک ملک کے نوٹ نہیں بلکہ مختلف ممالک کے نوٹ ہیں تو یہ مختلف اجناس قرار دیے جائیں گے اس لیے ان کی بیع کمی بیشی کے ساتھ درست ہے مثلاً پاکستانی سو روپے کا نوٹ سعودی عرب کے دس ریال کے بدلہ میں لینا یا اسی طرح دوسرے ملکوں کے نوٹ اپنے ملک کے نوٹوں کے بدلہ میں لینا تو اس میں کمی بیشی جائز ہے ان میں اکائی کا لحاظ نہ ہوگا۔

اشکال

دو مختلف ممالک کے نوٹ تبادلہ کی صورت میں اگر حکومت نے غیر ملکی کرنسی کا اپنی کرنسی سے تبادلہ کی صورت میں قیمت کا تعین کر دیا ہو تو اس مقرر کردہ قیمت سے کمی بیشی درست ہے یا نہیں مثلاً حکومت پاکستان ایک سو کا نوٹ سعودی عرب کے ساڑھے آٹھ ریال کے برابر مقرر کرتی ہے تو کیا حکومت کےاس مقرر کردہ نرخ میں کمی بیشی ہو سکتی ہے یا نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اسی جیسے ایک سوال کے جواب میں مفتی محمود الحسن صاحب فرماتے ہیں سوال یہ تھا کہ غیر ملکی نوٹ کی قیمت حکومت کچھ مقرر کرتی ہے مگر پرائیویٹ طور پر اس کی قیمت زائد مل جاتی ہے تو کیا پرائیویٹ طور پر اس غیر ملکی کرنسی کا تبادلہ کیا جا سکتا ہے یا نہیں تو جواب میں فرمایا کہ اگر ایسا کرنے پر قانونی گرفت نہیں تو اس کی گنجائش ہے بشرطیکہ مسلم کو خسارہ نہ ہو۔ (فتاوی محمودیہ ص ۲۴۳ ج ۴)

الغرض غیر ملکی نوٹ کی بیع بائع اور مشتری کی مرضی سے کمی اور زیادتی کے ساتھ ہو سکتی ہے اس لیے کہ وہ مُختَلِفُ الجِنس ہیں مگر یَدًا بِیَدٍ ہو نسیئہ کی صورت میں درست نہ ہوگی واللہ اعلم۔

بَابُ مَا جَآءَ فِي ابْتِيَاعِ النَّخْلِ بَعْدَ التَّابِيرِ وَالْعَبْدِ وَلَهُ مَالٌ

(تابیر کے بعد درختوں کو اور مال دار غلام کو بیچنے کا بیان)

تابیر کہتے ہیں تلقیح یعنی پودوں کو قلم لگانا۔ اور اس میں درخت کے نر خوشوں کو مادہ خوشوں پر ڈالا جاتا ہے جس سے پھل بڑھ جاتا ہے۔

درخت کے مالک نے تابیر کے بعد درخت کو بیچا تو اس درخت کا پھل کس کا ہوگا؟ بائع کا یا مشتری کا۔ اس بارہ میں ائمہ کرامؒ میں اختلاف ہے۔

ائمہ ثلاثہؒ کا نظریہ

ائمہ ثلاثہؒ (امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ) فرماتے ہیں کہ ایسی صورت میں پھل بائع کا ہوگا مگر یہ کہ مشتری شرط لگا دے کہ درخت کے ساتھ پھل بھی لوں گا اور اگر بیع تابیر سے پہلے ہو تو ائمہ ثلاثہ کے نزدیک وہ پھل مشتری کا ہوگا مگر یہ کہ بائع شرط لگا دے کہ پھل کے بغیر درخت بیچتا ہوں۔

ائمہ ثلاثہ کی دلیل

ترمذی شریف ج ۱ ص ۲۳۵ وغیرہ کی روایت ہے جس میں یہ الفاظ ہیں مَنِ ابْتَاعَ نَخْلًا بَعْدَ اَنْ تُؤَبَّرَ فَثَمَرَتُهَا لِلَّذِيْ بَاعَهَا اِلَّا اَنْ يَّشْتَرِطَ الْمُبْتَاعُ کہ جس نے کھجور کا درخت اس وقت بیچا جب کہ اس میں تابیر کی گئی ہو تو اس کا پھل اس شخص کے لیے ہوگا جس نے درخت بیچا ہے مگر یہ کہ مشتری شرط لگا دے کہ میں پھل سمیت درخت خریدتا ہوں۔

اور اگر تابیر سے قبل درخت کو بیچا تو پھل مشتری کا ہوگا مگر یہ کہ بائع شرط لگا دے کہ میں اس پھل کے بغیر درخت بیچتا ہوں تو اس حال میں ان حضرات کے نزدیک پھل بائع کا ہوگا اور اس بارہ میں یہ مفہوم مخالف کو دلیل بناتے ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ کا نظریہ اور دلیل

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ بیع تابیر کے بعد ہو یا پہلے ہو ہر حال میں پھل بائع کا ہوگا مگر یہ کہ مشتری شرط لگا دے۔ احناف کے نزدیک چونکہ مفہوم مخالف حجت نہیں ہے اس لیے وہ اس کا اعتبار نہیں کرتے۔ جب پھل بائع کا ہے تو وہ فی الفور پھل اتار کر درخت مشتری کے حوالے کرے اور امام ابن ابی لیلیٰؒ فرماتے ہیں کہ ہر صورت میں پھل مشتری کا ہوگا۔

علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ تابیر اپنے عمل سے کی ہو یا خود بخود ہو جائے دونوں صورتوں میں حکم ایک جیسا ہے (فتح الباری ص ۴۰۲ ج ۴)

حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ بعد ان تؤبر کی قید عادت کو پیش نظر رکھ کر لگائی گئی ہے اس لیے کہ تابیر سے پہلے بیع کی عادت ہی نہیں۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ اس پھل کا درخت کے ساتھ اتصال قراری نہیں اور قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی چیز کا اتصال مبیعہ کے ساتھ قراری نہ ہو تو وہ چیز بلا صراحت بیع میں داخل نہیں ہوتی اس لیے مشتری اگر شرط لگائے گا تو یہ پھل اس کا ہوگا ورنہ یہ بائع ہی کا ہوگا۔ (الکوکب الدری ص ۳۶۲)

علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ امام صاحبؒ کی جانب سے اس روایت کا صحیح جواب وہ ہے جو علامہ طیبیؒ نے دیا ہے کہ تابیر کنایہ ہے پھل کے ظاہر ہونے سے۔ یعنی پھل ظاہر ہو جانے کے بعد درخت کی بیع ہو تو پھل بائع کا ہوگا مگر یہ کہ مشتری شرط لگا دے۔ علامہ طیبیؒ کے اس بیان کی روشنی میں یہ حدیث احناف کے نظریہ کے خلاف نہیں بلکہ نظریہ اس حدیث کے مطابق ہے۔ (العرف الشذی ص ۳۹۱)

اور اس کی تائید حضرت ابن عمرؓ کی وہ روایت کرتی ہے جو امام بیہقیؒ نے نقل کی ہے جس میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَيُّمَا رَجُلٍ بَاعَ نَخلاً قَدْ اَيْنَعَتْ فَثَمَرَتُهَا لِرَبِّهَا الْاَوَّلِ اِلاَّ اَنْ يَّشْتَرِطَ الْمُبْتَاعُ جس آدمی نے درخت اس وقت بیچا جبکہ اس کا پھل ظاہر ہو چکا ہو تو وہ پھل اس کے پہلے مالک یعنی بائع کا ہوگا مگر یہ کہ مشتری شرط لگا دے۔ علامہ ماردینیؒ فرماتے ہیں کہ امام بیہقیؒ نے اس روایت کو منقطع خیال کیا ہے حالانکہ یہ روایت مسند بھی ثابت ہے اس لیے کہ عکرمۃ بن خالد کا حضرت ابن عمرؓ سے سماع ثابت ہے۔ (الجوہر النقی ج ۵ ص ۲۹۸)

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ اگر بدو صلاح (پھل پکنے) سے پہلے پھل کی بیع اس شرط پر کی کہ فی الفور پھل اتار لیا جائے گا تو یہ بیع بالاتفاق جائز ہے۔ (طحاوی ج ۲ ص ۱۷۲)

اعتراض اور اس کا جواب

امام طحاویؒ نے جو یہ فرمایا ہے کہ بدو صلاح سے پہلے پھل کاٹ لینے کی شرط کے ساتھ بیع بالاتفاق جائز ہے تو یہ درست نہیں اس لیے کہ امام ترمذیؒ نے ج ۱ ص ۲۴۶ میں امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا یہ نظریہ بیان کیا ہے کہ وہ بدو صلاح سے پہلے بیع کو مکروہ قرار دیتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ امام طحاویؒ کے پیش نظر امام شافعیؒ کا وہ قول ہو جس میں بدو صلاح سے قبل بشرط القطع بیع درست ہے جس کی جانب مبارکپوری صاحبؒ نے بھی اشارہ کیا ہے قِيْلَ اِنْ شَرَطَ الْقَطْعَ لَمْ يَبْطَلْ وَاِلَّا بَطَلَ وَهُوَ قَوْلُ الشَّافِعِيِّ وَاَحْمَدَ (تحفۃ الاحوذی ص ۲۳۴ ج ۲) یہ بھی کہا گیا ہے کہ فی الفور پھل کاٹ لینا شرط قرار دیا گیا ہو تو بیع باطل نہیں ہوتی ورنہ باطل ہوگی اور یہی قول ہے امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا۔

امام ترمذیؒ نے اس باب کے تحت جو روایت ذکر کی ہے مَنِ ابْتَاعَ نَخْلًا بَعْدَ اَنْ تُؤَبَّرَ فَثَمَرَتُهَا لِلَّذِيْ بَاعَهَا اِلَّا اَنْ يَّشْتَرِطَ الْمُبْتَاعُ اس حدیث سے جو مفہوم ظاہر ہے اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے اور تابیر سے پہلے کی صورت میں جو اختلاف ہے' اس کا مدار اس حدیث کے مفہوم مخالف پر ہے جو احناف کے نزدیک حجت نہیں ہے۔ اور علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ نے تابیر کے ذکر کو ماقبل التابیر پر تنبیہ خیال کیا ہے اور اصول میں اس کا نام معقول الخطاب ہے اور امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نے اس کو اس پر محمول کیا ہے کہ جس حصہ سے خاموشی اختیار کی گئی ہے وہ بھی منطوق کی طرح ہے اور اس کو اہل اصول دلیل الخطاب کا نام دیتے ہیں (حاشیہ نمبر ۸ بخاری ص ۲۹۳ ج ۱)

علامہ عینیؒ کے فرمان کا خلاصہ یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے اپنے نظریہ پر اس حدیث سے معقول الخطاب کو دلیل بنایا ہے جبکہ دیگر حضرات نے دلیل الخطاب سے دلیل پکڑی ہے اور دونوں جانب اجتہاد ہے۔

غلام کے بیچے جانے کے وقت اس کے پاس جو مال ہے' وہ کس کا ہوگا؟

قَوْلُهُ وَمَنْ بَاعَ عَبْدًا وَلَهُ مَالٌ فَمَالُهُ لِلْبَائِعِ اِلَّا اَنْ يَّشْتَرِطَ الْمُبْتَاعُ

قاضی شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ کے نزدیک اور امام شافعیؒ کے قدیم قول کے مطابق اگر مالک اپنے غلام کو کسی مال کا مالک بنا دے تو وہ اس کا مالک بن جاتا ہے اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اور امام شافعیؒ کے جدید قول کے مطابق غلام بالکل کسی چیز کا مالک نہیں بن

سکتا۔ (نیل الاوطار ص ۱۸۲ ج ۵)

اس حدیث کے تحت حضرت گنگوہی فرماتے ہیں کہ غلام کا تو مال ہو ہی نہیں سکتا اس لیے وَلَهٗ مَالٌ میں مال کی اضافت غلام کی جانب اس لیے ہے کہ وہ مال اس کے پاس ہے (الکوکب الدری ص ۳۶۳) قاضی شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ غلام یا باندی کے کان میں حلقہ یا ہاتھ میں انگوٹھی، پاؤں کے جوتے اور بدن کے کپڑے غلام کے بیع میں داخل نہ ہوں گے۔ یہ مال مالک یعنی بائع کا ہوگا۔

بدن کے کپڑوں کے بارہ میں تین اقوال ہیں۔ ا۔ عادۃً چونکہ غلام کی بیع شراء کرنے والے اس کے بدن کے کپڑوں سے درگزر کرتے ہیں اس لیے عادت کی وجہ سے وہ بیع میں داخل ہو جائیں گے یہ نظریہ ہے امام ابو حنیفہؒ کا۔ ۲۔ کسی قسم کا کوئی کپڑا بیع میں داخل نہ ہو گا اگر بائع چاہے تو چھوڑ دے ورنہ مشتری سے کہے کہ اس کو اپنے کپڑے پہناؤ اور میں نے جو کپڑے اس کو پہنائے ہیں وہ مجھے دے دو۔ ۳۔ تیسرا قول یہ ہے کہ ستر عورت جتنا کپڑا بیع میں داخل ہوگا اس سے زائد نہیں۔ (نیل الاوطار ج ۵ ص ۱۸۳)

حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ اگر مشتری نے غلام کے پاس جو مال ہے، اس کی بھی بیع میں شرط لگا دی تو اگر مال معلوم ہو تو اس کا ہو جائے گا اور اگر مال مجہول ہو تو بیع درست نہ ہو گی اس لیے کہ اس صورت میں غلام کی بیع مال سمیت ہے اور مال مجہول ہے تو مبیعہ کا ایک جز مجہول ہونے کی وجہ سے بیع فاسد ہوگی۔ اور حاشیہ میں اَلتَّعْلِيْقُ الْمُمَجَّد کے حوالہ سے لکھا ہے کہ امام شافعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس مال کا معلوم ہونا ضروری ہے۔ (الکوکب الدری ص ۳۶۳)

مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ اگر غلام کے پاس مال دراہم کی صورت میں ہو اور بیع بھی دراہم کے ساتھ ہوئی ہو تو غلام کی یہ بیع درست نہیں ہے۔ اسی طرح جس قسم کا مال غلام کے پاس ہے اگر اسی طرح کے مال کو ثمن مقرر کیا گیا تو غلام کی بیع درست نہ ہو گی۔ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ حدیث میں الفاظ علی الاطلاق آئے ہیں اس لیے خواہ غلام کے پاس مال کی قسم کو ثمن مقرر کیا گیا ہو تو تب بھی بیع جائز ہوگی۔ (تحفۃ الاحوذی ص ۲۴۱ ج ۲)

بَابُ مَا جَآءَ اَلْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا

(جب تک بائع اور مشتری جدا نہ ہوں، ان کو خیار ہوتا ہے)

بَیِّعَانِ تثنیہ کا صیغہ ہے بَیِّعٌ سے جو کہ ضَیِّقٌ کی طرح صفت کا صیغہ ہے اور فاعل کے معنی میں ہے۔ تو بَیِّعٌ بَائِعٌ کے معنی میں ہے اور بَیِّعَانِ سے مراد بائع اور مشتری ہیں۔

بیع میں خیار کی اقسام

حضرات فقہاء کرام کے ہاں بیع میں تین قسم کا خیار اتفاقی ہے۔ ۱۔ خیار شرط۔ ۲۔ خیار عیب۔ ۳۔ خیار رویت۔

خیار شرط میں حکم کی اضافت سبب کی جانب ہے یعنی وہ خیار جو شرط لگا دینے کی وجہ سے حاصل ہوا ہو اور یہ خیار بائع اور مشتری میں سے ہر ایک کو حاصل ہوتا ہے جو بھی شرط لگا دے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک اس کی زیادہ سے زیادہ مدت تین دن ہے اس سے زیادہ نہیں اور صاحبینؒ کے نزدیک بائع اور مشتری باہمی رضا کے ساتھ جو بھی مدت مقرر کرلیں تو اتنی مدت میں خیار باقی رہے گا۔ جس نے بیع میں شرط خیار لیا ہو وہ خیار شرط کی مدت کے دوران مدت پوری ہونے سے پہلے بھی اگر بیع کو فسخ کرنا چاہے تو کر سکتا ہے اور اگر بیع کو نافذ کرنا چاہے تو نافذ بھی کر سکتا ہے۔

اگر خیار شرط بائع نے لیا ہو اور مبیعہ مشتری کے پاس ہو اور اس کے پاس مبیعہ ہلاک ہو جائے تو مشتری کو قیمت ادا کرنا ہوگی اور اگر خیار شرط بھی بائع نے لیا ہو اور مبیعہ بھی اس کے پاس ہو۔ یا خیار شرط مشتری نے لیا ہو مگر مبیعہ بائع کے پاس ہو۔ اور مدت خیار کے دوران وہ ہلاک ہوجائے تو بیع فسخ ہو جائیگی اور مشتری کے ذمہ کچھ نہ ہو گا اور اگر خیار شرط مشتری نے لیا ہو اور مبیعہ بھی اس کے قبضہ میں ہو اور مبیعہ ہلاک ہو جائے تو مشتری کو ثمن ادا کرنا پڑے گا۔ (ہدایہ ص ۱۱۔ ۱۲ ج ۳)

قیمت اور ثمن میں فرق

قیمت اس کو کہتے ہیں جو کسی چیز کی لوگوں میں رائج ہو اور ثمن اس کو کہتے ہیں جو بائع اور مشتری باہمی رضا کے ساتھ آپس میں طے کرلیں۔ مثلاً ایک چیز مارکیٹ میں دس روپے کی ملتی ہے مگر بائع اور مشتری باہمی رضا کے ساتھ سات روپے طے کر لیتے ہیں تو اس چیز کی قیمت دس روپے ہوگی اور اس کا ثمن سات روپے ہوگا۔

خیار عیب کا مطلب یہ ہے کہ بظاہر مبیعہ ٹھیک ٹھاک تھا مگر مشتری کو اس میں عیب

نظر آگیا تو اس عیب کی وجہ سے اس کو خیار حاصل ہے کہ وہ اس مبیعہ کو رد کر دے۔
خیار رؤیت کا مطلب یہ ہے کہ مشتری نے ایسی چیز کا سودا بائع سے کر لیا جو چیز مشتری نے ابھی تک دیکھی نہیں تو بیع جائز ہوگی اور اس کو مبیعہ دیکھنے کے بعد اگر پسند نہ آیا تو رد کا اختیار ہوگا۔ صاحب ہدایہؒ فرماتے ہیں کہ اگر مشتری نے مبیعہ نہ دیکھا ہو توامام شافعیؒ کے نزدیک یہ عقد ہی صحیح نہیں ہے اس لیے کہ مبیعہ مجہول ہے۔ (ہدایہ ص ۱۷ ج ۳) اور مولانا امیر علی صاحب لکھتے ہیں اور ہم نہیں جانتے کہ امام شافعیؒ سے پہلے سلف میں بھی کوئی منع کرنے والا ہے۔ (عین الہدایہ ص ۴۹ ج ۳)
بہر حال یہ تین قسم کا خیار فقہاء کرام کے ہاں تقریباً اتفاقی ہے۔ ان کے علاوہ خیار کی اور بھی اقسام ہیں۔ ا۔ خیار قبول یعنی بائع نے کہا کہ میں تجھ پر یہ چیز اتنے کی بیچتا ہوں تو یہ اس کی جانب سے ایجاب ہے اور دوسرے کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا خیار ہے۔ یا مشتری نے کہا کہ میں تجھ سے یہ چیز اتنے کی خریدتا ہوں تو یہ اس کی جانب سے ایجاب ہے اور دوسرے کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا خیار ہے اسی طرح اگر ایک نے ایجاب کیا تو دوسرے کے قبول کر لینے سے پہلے اس کو اپنا ایجاب واپس لینے کا خیار ہے اس کو خیار قبول کہتے ہیں۔
۲۔ خیار مجلس۔ بائع اور مشتری نے آپس میں ایک چیز کا سودا مکمل کر لیا تو امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک جس مجلس میں سودا ہوا ہو اس مجلس کے ختم ہونے تک ان میں سے ہر ایک کو رد کا خیار ہے اس کو خیار مجلس کہتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک خیار مجلس نہیں ہے۔

اَلْبَیِّعَانِ بِالْخِیَارِ میں کون سا خیار مراد ہے اور تفرق سے کیا مراد ہے؟

اَلْبَیِّعَانِ بِالْخِیَارِ میں خیار سے مراد کون سا خیار ہے اور مَالَمْ یَتَفَرَّقَا میں تفرق سے کون سا تفرق مراد ہے؟ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مَالَمْ یَتَفَرَّقَا میں تفرق سے مراد تفرق بالاقوال ہے اور بالخیار سے مراد خیار قبول ہے۔ یعنی اگر بائع اور مشتری میں سے کسی ایک نے ایجاب کیا تو جب تک بیع کے معاملہ میں گفتگو سے ہٹ نہ جائیں اس وقت تک دوسرے کو قبول کا خیار ہے اور اگر دونوں نے ایجاب و قبول کر لیا تو بیع تام ہو گئی پھر کسی کو خیار نہ ہوگا۔
اور امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ تفرق سے مراد تفرق بالابدان ہے اور خیار

سے مراد خیار مجلس ہے یعنی ان حضرات کے نزدیک ایجاب و قبول کے ساتھ بیع تام تو ہو جاتی ہے مگر اس کا حکم ثابت نہیں ہوتا بلکہ اختتام مجلس پر موقوف ہوتا ہے۔ اختتام مجلس ہوجائے تو حکم ثابت ہوگا۔

اور اہل ظاہر کے نزدیک تفرق بالابدان سے قبل یعنی اختتام مجلس سے پہلے بیع تام ہی نہیں ہوتی۔ امام ابراہیم نخعیؒ کا نظریہ بھی امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کی طرح ہے چنانچہ مبارکپوری صاحب نے امام محمدؒ کے حوالہ سے امام ابراہیم نخعیؒ سے یہ نقل کیا ہے

اَلْمُتَبَایِعَانِ بِالْخِیَارِ مَا لَمْ یَتَفَرَّقَا عَنْ مَنْطِقِ الْبَیْعِ اِذَا قَالَ الْبَائِعُ قَدْ بِعْتُکَ فَلَهٗ اَنْ یَّرْجِعَ مَا لَمْ یَقُلِ الْاٰخَرُ قَدِ اشْتَرَیْتَ وَاِذَا قَالَ الْمُشْتَرِیْ قَدِ اشْتَرَیْتُ بِکَذَا وَکَذَا لَهٗ اَنْ یَّرْجِعَ عَنْ قَوْلِهٖ اشْتَرَیْتُ مَا لَمْ یَقُلِ الْبَائِعُ قَدْ بِعْتُ وَهُوَ قَوْلُ اَبِیْ حَنِیْفَةَ وَالْعَامَّةِ مِنْ فُقَهَائِنَا (تحفۃ الاحوذی ص ۲۴۳ ج ۲) یعنی آپس میں بیع کرنے والوں کو خیار ہے جب تک کہ وہ بیع کے بارہ میں گفتگو سے جدا نہ ہو جائیں۔ جب بائع نے کہا کہ میں نے یہ چیز تجھ پر بیچی تو اس کو اس وقت تک خیار ہے جب تک دوسرا یہ نہ کہہ دے کہ میں نے خرید لی۔ اور اسی طرح جب مشتری نے کہا کہ میں نے یہ چیز تجھ سے اتنے ثمن کے بدلے میں خرید لی تو اس کو اپنے اشتریت کے قول سے رجوع کرنے کا اس وقت تک حق ہے جب تک بائع یہ نہ کہہ دے کہ میں نے بیچ دی۔ اور یہی قول ہے امام ابو حنیفہؒ اور ہمارے اکثر فقہاء کا۔

اَلْبَیِّعَانِ بِالْخِیَارِ میں خیار اور تفرق کا تعین مجتہد فیہ مسئلہ ہے

حدیث اَلْبَیِّعَانِ بِالْخِیَارِ مَا لَمْ یَتَفَرَّقَا میں جو خیار اور تفرق ہے اس کو احناف بھی مانتے ہیں اور شوافع بھی۔ صرف اس کا مفہوم متعین کرنے میں اختلاف ہے اور مفہوم متعین کرنا مجتہد فیہ مسئلہ ہے دونوں فریق ترجیح کی وجوہات کے پیش نظر اپنے نظریہ کو راجح قرار دیتے ہیں۔ جب مفہوم متعین کرنا مجتہد فیہ مسئلہ ہے تو اس کی وجہ سے کسی ایک جانب کو یہ کہنا کہ وہ حدیث کی مخالفت کرتا ہے یہ کہنا درست نہیں ہے بالخصوص غیر مقلدین حضرات کا احناف کے متعلق کہنا کہ وہ حدیث کی مخالفت کرتے ہیں قطعاً درست نہیں اس لیے کہ حدیث میں کہاں ہے کہ خیار سے مراد خیار مجلس ہے اور تفرق سے مراد تفرق بالا بدان ہے کہ احناف پر حدیث کی مخالفت کا الزام ثابت کیا جا سکے۔ جب خیار سے مراد خیار قبول اور خیار مجلس دونوں ہو سکتے ہیں اور تفرق سے مراد تفریق بالاقوال اور تفرق بالابدان دونوں ہو سکتے ہیں تو ترجیح کی وجوہات کے ذریعہ سے ہی کسی جانب کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔

احناف کی جانب سے اپنے نظریہ پر ترجیح کی وجوہات

پہلی ترجیح

حدیث کا مفہوم ایسا ہونا چاہیے کہ وہ کتاب اللہ کے واضح مفہوم کے مخالف نہ ہو اور یہاں اگر تفرق سے تفرق بالابدان مراد لیا جائے تو یہ مفہوم قرآن کریم کے مفہوم کے مطابق نہیں بنتا اس لیے کہ قرآن کریم میں ہے وَاَشۡهِدُوۡۤا اِذَا تَبَايَعۡتُمۡ (سورۃ البقرہ آیت ۲۸۲) جب تم بیع کرو تو گواہ بنا لو۔ اگر تفرق سے تفرق بالابدان مراد لے کر تفرق سے پہلے گواہ بنائے جائیں تو گواہ مفید نہیں اس لیے کہ ابھی تک بیع لازم نہیں۔ اور اگر تفرق بالابدان کے بعد گواہ بنائیں تو گواہ فی غیر محلہ ہوں گے اس لیے کہ اس صورت میں یہ گواہ علی البیع نہیں بلکہ بعد البیع ہوں گے۔ اور اگر تفرق سے پہلے مراد تفرق بالاقوال لیں تو یہ خرابی لازم نہیں آتی۔

دوسری ترجیح

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں ہے وَاِنۡ يَّتَفَرَّقَا يُغۡنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنۡ سَعَتِهٖ (سورۃ النساء آیت ۱۲۹) اگر وہ میاں بیوی ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو ان میں سے ہر ایک کو اپنی کشائش سے بے پروا کر دے گا۔ اس میں اگر مرد عورت کو طلاق دے دے تو تفرق بالابدان بے شک نہ ہوا ہو' تو قول کے ساتھ ہی عورت بالاتفاق جدا ہو جاتی ہے تو جب یہاں تفرق بالاقوال سے حکم شرعی ثابت ہو جاتا ہے تو مَا لَمۡ يَتَفَرَّقَا میں بھی تفرق بالاقوال سے حکم شرعی ثابت ہو جاتا ہے۔ (طحاوی ج ۲ ص ۱۴۵)

تیسری ترجیح

قرآن کریم میں ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ (سورۃ المائدہ آیت نمبر۱) اے ایمان والو عقود کو پورا کرو۔ تو باقی تمام عقود اجارہ' اعارہ اور نکاح وغیرہ قول کے ساتھ ثابت ہو جاتے ہیں تو یہ عقد بیع بھی قول کے ساتھ تام ہو کر اپنا حکم ثابت کرے گا ورنہ اس عقد اور باقی عقود کے درمیان فرق کی کوئی معقول وجہ بیان کرنی چاہیے۔

چوتھی ترجیح

بخاری ص ۲۸۴ ص ج ۱ میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں ہے کہ میں ایک سفر میں

حضور علیہ السلام کے ساتھ تھا اور حضرت عمرؓ کے اونٹ پر سوار تھا حضور علیہ السلام نے حضرت عمرؓ سے فرمایا بِعْنِيهِ کہ اس اونٹ کو مجھ پر بیچ دو فَبَاعَهُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تو انہوں نے وہ اونٹ حضور علیہ السلام پر بیچ دیا۔ اس کے ساتھ ہی حضور علیہ السلام نے فرمایا هُوَ لَكَ يَا عَبْدَ اللّٰهِ تَصْنَعُ بِهِ مَا شِئْتَ اے عبد اللہ اب یہ اونٹ تیرا ہو گیا تو اس کے ساتھ جو چاہے کر یعنی تیری ملکیت ہے اور اس میں تصرف کا تجھے اختیار ہے۔ علامہ عینیؒ فرماتے ہیں فِيهِ حُجَّةٌ لِمَنْ يَقُوْلُ الْاِفْتِرَاقَ بِالْكَلَامِ جو تفرق بالاقوال کا قول کرتے ہیں ان کے لیے یہ دلیل ہے کیونکہ حضور علیہ السلام نے تفرق بالابدان سے قبل ہی وہ اونٹ حضرت ابن عمرؓ کو ھبہ کر دیا تھا جو اس بات کی دلیل ہے کہ بات مکمل ہو جانے کے ساتھ بیع مکمل ہو گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ملکیت میں آجانے کی وجہ سے ہی اس کو ہبہ کیا تھا۔ (عمدۃ القاری ص ۲۳۱ ج ۱۱)

پانچویں ترجیح

امام بخاریؒ نے باب قائم کیا ہے بَابُ اِذَا اشْتَرٰى شَيْئًا فَوَهَبَ مِنْ سَاعَتِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّتَفَرَّقَا وَلَمْ يُنْكِرِ الْبَائِعُ عَلَى الْمُشْتَرِيْ۔ یہ باب ہے اس بیان میں کہ مشتری کوئی چیز خرید کر اسی وقت ھبہ کر دے جبکہ وہ ابھی تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہوئے ہوں اور بائع مشتری کی اس کاروائی پر اعتراض نہ کرے۔ باب باندھنے کے اس انداز سے بھی پتہ چلتا ہے کہ تفرق بالابدان سے پہلے بھی مبیعہ بائع کی ملکیت سے مشتری کی ملکیت میں منتقل ہو جاتا ہے۔ جبکہ مشتری نے وہ چیز خرید لی ہو اور خریدنا ایجاب وقبول کے ساتھ مکمل ہو جاتا ہے۔

چھٹی ترجیح

ترمذی ج ۱ ص ۲۲۶ ابوداؤد ص ۱۳۳ ج ۲ وغیرہ کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا يَحِلُّ لَهٗ اَنْ يُّفَارِقَ صَاحِبَهٗ خَشْيَةَ اَنْ يَّسْتَقِيْلَهٗ کہ بائع اور مشتری میں سے کسی کا اپنے ساتھی سے اس خوف سے جدا ہونا درست نہیں ہے کہ کہیں وہ اقالہ کا مطالبہ نہ کر دے۔ اور ظاہر بات ہے کہ اقالہ تب ہی ہوگا جبکہ بیع پہلے مکمل ہو چکی ہو۔ اس لیے اَنْ يَّسْتَقِيْلَهٗ کے الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ تفرق بالابدان سے قبل ہی بیع تام ہو کر حکم ثابت کر چکی ہے۔

ساتویں ترجیح

امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب کسی چیز کے ارکان پائے جائیں تو اس کا ثبوت اور تَحَقُّق ہو جاتا ہے تو بیع کے ارکان ایجاب وقبول جب پائے جارہے ہیں تو اس کا تحقق کیوں نہ ہوگا؟

آٹھویں ترجیح

ترمذی ج ۱ ص ۲۳۶ میں حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خَيَّرَ اَعْرَابِيًّا بَعْدَ الْبَيْعِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کے بعد ایک دیہاتی کو خیار دیا اس پر مبارکپوریؒ صاحب لکھتے ہیں کہ یہ بیع ایجاب و قبول کے ساتھ تام ہو گئی تھی اور اس میں امام ابو حنیفہؒ کے لیے دلیل ہے مگر اس کا جواب یہ ہے کہ اس مطلق کو مقید پر محمول کریں گے (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۲۴۴) مگر مبارکپوریؒ صاحب کا یہ جواب صرف جان چھڑانے کا ایک بہانہ ہے۔

نویں ترجیح

حضرت مولانا سید انور شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ نے فرمایا کہ ہمارے اس شہر یعنی مدینہ منورہ میں اس (تفرق بالابدان) پر عمل نہیں ہے تو یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس پر ان صحابہ کا تعامل نہ تھا جو مدینہ منورہ میں رہتے تھے۔

ان ترجیحات کی وجہ سے احناف کہتے ہیں کہ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا میں تفرق سے مراد تفرق بالاقوال ہے۔

امام شافعیؒ کی جانب سے ان کے نظریہ کی ترجیحات

پہلی ترجیح

حضرت ابن عمرؓ کا عمل جو خود اس روایت کے راوی ہیں اس بارہ میں یہ تھا کہ جب ان کو سودا پسند ہوتا تو سودا کر لینے کے بعد مجلس سے اٹھ جاتے تھے تاکہ سودا پختہ ہو جائے اور مبارکپوریؒ تحفۃ الاحوذی ص ۲۴۲ ج ۲ میں حضرت مولانا عبد الحیٔ لکھنویؒ کی التعلیق الممجد کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ ان اقوال میں سے وہی قول اولیٰ ہوگا جو دو صحابیوں (حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابو برزہ الاسلمیؓ) نے سمجھا۔ اور فہم صحابی اگرچہ حجت نہیں ہے مگر دوسروں کے فہم پر اس کو ترجیح ہوگی ان دونوں صحابہ نے تفرق بالابدان سمجھا ہے تو اس

سے معلوم ہوا کہ تفرق سے تفرق بالابدان مراد لینا راجح ہے۔

اس کا پہلا جواب

حضرت ابن عمرؓ کے عمل سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس کو واجب اور ضروری سمجھتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ترمذی شریف ج ۱ ص ۲۳۶ وغیرہ کی روایت میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا لَا یَحِلُّ لَہٗ اَنْ یُّفَارِقَ صَاحِبَہٗ خَشْیَۃَ اَنْ یَّسْتَقِیْلَہٗ اور دوسری روایت حضرت ابو ہریرہؓ کی ترمذی ج ۱ ص ۲۳۶ میں اس طرح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا یَتَفَرَّقَنَّ عَنْ بَیْعٍ اِلَّا عَنْ تَرَاضٍ کہ آدمی بیع کر کے ہرگز باہمی رضا کے بغیر جدا نہ ہو۔ اور ابوداؤد ج ۲ ص ۱۳۴ کی روایت میں ہے لَا یَتَفَرَّقَنَّ اثْنَانِ اِلَّا عَنْ تَرَاضٍ کہ دونوں (بائع اور مشتری) میں سے کوئی بھی باہمی رضا کے بغیر جدا نہ ہو۔ اور مبارکپوری صاحبؒ تحفۃ الاحوذی ص ۲۴۴ ج ۲ میں ملا علی قاریؒ کی مرقات ص ۵۸ ج ۶ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ ان روایات میں نہی کراہت تنزیہی پر محمول ہے اس لیے کہ بائع اور مشتری میں سے ہر ایک کا دوسرے کی اجازت کے بغیر جدا ہونا بالاتفاق جائز ہے جب جدا ہونا دوسرے کی رضا کے بغیر مکروہ تنزیہی ہے تو کراہت تنزیہی جواز کے ساتھ تو جمع ہو سکتی ہے مگر وجوب کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔ اس لیے حضرت ابن عمرؓ کا یہ عمل وجوب کے طور پر نہیں ہو سکتا۔ اور جواز ہمارے نزدیک بھی ہے اس لیے یہ روایت ہمارے (احناف) خلاف نہیں ہے۔

دوسرا جواب

امام طحاوی ج ۲ ص ۱۴۶ میں فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ خود تو تفرق بالابدان کے قائل نہ ہوں (جس کی جانب بخاری ج ۱ ص ۲۸۴ کی روایت اشارہ کرتی ہے) دوسرے فریق کے جھگڑے سے بچنے کے لیے وہ کھڑے ہو جاتے ہوں کیونکہ ممکن تھا کہ وہ ظاہر حدیث کے پیش نظر فسخ کرنا چاہتا ہو۔ یہ بات تقریر ترمذی ص ۳۵ میں حضرت شیخ الہندؒ نے بھی فرمائی ہے اور حضرت شیخ الہندؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ کا بیع کی مجلس سے اٹھ کھڑے ہونا احتیاطاً، زہداً اور اتقاءً تھا۔

تیسرا جواب

امام طحاویؒ نے ص ۱۴۶ ج ۲ میں حضرت ابن عمرؓ کی ایک روایت نقل کی ہے جس سے

معلوم ہوتا ہے کہ جب بیع میں ایجاب و قبول ہو جائے تو بیع تام ہو جاتی ہے اور اگر اس کے بعد مبیعہ ہلاک ہو جائے تو مشتری کا مال ہلاک ہوگا تو اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کے نزدیک بیع کی مجلس سے اٹھ جانا واجب اور ضروری نہ تھا۔

امام شافعیؒ کی جانب سے اپنے نظریہ پر دوسری ترجیح

شوافع حضرات اپنے نظریہ کی ترجیح کے لیے حضرت ابوبرزہ الاسلمیؓ کا وہ فیصلہ بھی پیش کرتے ہیں جو انہوں نے ایسے دو آدمیوں کے درمیان کیا تھا جو ایک گھوڑے کے بارہ میں ان کے پاس لے کر گئے تھے جو ترمذی ج ۱ ص ۲۳۶ وغیرہ میں موجود ہے کہ کشتی میں سوار دو آدمیوں نے ایک گھوڑے کی بیع کی اور طحاوی ج ۲ ص ۱۹۵ کی روایت میں ہے کہ اگلے دن تک گھوڑا اپنی جگہ بندھا رہا جب دوسرے دن مشتری اس گھوڑے کو زین باندھنے کے لیے آیا تو بائع نے کہا کہ یہ گھوڑا میں تجھے نہیں دیتا تو مشتری نے کہا کہ سودا مکمل ہو چکا تھا اس لیے میں یہ گھوڑا لے جاؤں گا۔ وہ اپنا جھگڑا حضرت ابو برزہ الاسلمیؓ کے پاس لے گئے تو انہوں نے فرمایا لَا اَرَاکُمَا اِفْتَرَقْتُمَا میرا خیال یہ ہے کہ تم دونوں جدا نہیں ہوئے اس لیے کہ تم دونوں ایک ہی کشتی میں سفر کر رہے ہو لہٰذا بائع کو گھوڑا اپنے پاس روکنے کا اختیار ہے۔

اس کا جواب

حضرت ابوبرزہ الاسلمیؓ کا یہ فیصلہ تو حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بھی متعارض ہے اس لیے کہ وہ تو صرف مجلس سے اٹھ کھڑے ہو جانے سے خیار کو کالعدم قرار دیتے ہیں اور حضرت ابوبرزہ الاسلمیؓ دوسرے دن تک بھی کشتی میں سوار ہونے کی وجہ سے تفرق نہیں سمجھ رہے حالانکہ اس دوران نماز اور دیگر حاجات کے لیے جدا ہونا اور بالخصوص روایت کے الفاظ کہ وہ زین لے کر آیا یہ سب چیزیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ جدا ہوئے تھے اور اس قدر تفرق کو تفرق نہ سمجھنا تو شوافع حضرات کے نظریہ کے مطابق بھی درست نہیں ہے اس لیے اس فیصلہ کو احناف کے خلاف پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو حضرت ابوبرزہ الاسلمیؓ کی ذاتی رائے ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

امام شافعیؒ کی جانب سے تیسری ترجیح

امام شافعیؒ کِتَابُ الْاُمّ ج ۳ ص ۶ میں فرماتے ہیں کہ اَلْبَیِّعَانِ بِالْخِیَارِ کے الفاظ

دلالت کرتے ہیں کہ تفرق سے مراد تفرق بالابدان ہے اس لیے کہ جب تک وہ قول کے ساتھ بیع تام نہ کرلیں اس وقت تک وہ متساومین یعنی بھاؤ طے کرنے والے ہوتے ہیں اور جب ایجاب و قبول کرلیں تو بیعان ہیں اور حدیث میں مَالَمْ یَتَفَرَّقَا کا خیار بیعان کو ہے تو متعین ہوگیا کہ تفرق سے مراد تفرق بالابدان ہے۔

اس کا جواب

امام طحاوی ص ۱۴۶ ج ۲ میں فرماتے ہیں کہ لغت عرب میں فعل کے قریب ہونے کی وجہ سے بھی فعل کے ساتھ موصوف کیا جاتا ہے جیسا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبیح کہا جاتا ہے اس لیے کہ وہ فعل ذبح کے قریب تھے۔ اسی طرح بائع اور مشتری کو فعل بیع کے قریب ہونے کی وجہ سے بیعان کہا جا سکتا ہے۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ سوم اور بیع کا اطلاق ایک ہی چیز پر بھی کیا جا سکتا ہے جیسا کہ مسلم ص ۳ ج ۲ کی روایت میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا لَا یَبِیْعُ الرَّجُلُ عَلٰی بَیْعِ اَخِیْہِ کہ آدمی اپنے بھائی کی بیع پر بیع نہ کرے اور مسلم ہی میں اس سے آگے روایت ہے لَا یَسُمِ الْمُسْلِمُ عَلٰی سَوْمِ اَخِیْہِ کہ کوئی مسلمان اپنے بھائی کے سودا پر سودا نہ کرے۔ اور دونوں روایات کا معنی ایک ہی ہے۔ تو شوافع حضرات کا سوم اور بیع کے معنی کو جدا جدا کرکے بیعان سے قول کے لحاظ سے بیع تام ماننے کے بعد مَالَمْ یَتَفَرَّقَا سے تفرق بالابدان ہی متعین کرنا کوئی وزن نہیں رکھتا۔

قاضی شوکانیؒ کا دعویٰ اور اس کا رد

قاضی شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ افتراق کلام کے لحاظ سے جدا ہونے پر اور تفرق بدن کے لحاظ سے جدا ہونے پر بولا جاتا ہے مگر علامہ ابن العربیؒ نے اس کا رد کیا ہے اور کہا ہے کہ قرآن کریم میں ہے وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ (پارہ نمبر ۳۰ سورۃ البینہ) اور یہ تفرق کلام کے لحاظ سے یعنی اعتقاد کے طور پر تھا۔ اسی طرح قرآن کریم میں ہے وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (سورۃ آل عمران آیت نمبر ۱۰۳) اور اللہ تعالیٰ کی رسی کو سارے کے سارے مضبوطی سے پکڑو اور تفرقہ بازی مت کرو۔ یہاں بھی نظریات اور اعتقاد کا تفرق مراد ہے جو کہ قول ہی سے ہوتا ہے۔

امام ابو یوسفؒ کا نظریہ

امام طحاویؒ نے ص ۱۴۶ ج ۲ میں امام ابو یوسفؒ کا نظریہ یہ بیان کیا ہے کہ ان کے

نزدیک مَا لَمۡ یَتَفَرَّقَا میں تفرق سے مراد تفرق بالا بدان ہے جیسا کہ امام شافعیؒ کا نظریہ ہے اور خیار سے مراد خیار قبول ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے سے کہتا ہے کہ یہ چیز میں اتنے ثمن کے بدلے تجھ پر بیچتا ہوں۔ یا مشتری کہتا ہے کہ میں یہ چیز اتنے کی تجھ سے خریدتا ہوں تو دوسرے آدمی کو مجلس سے اٹھنے تک خیار ہے کہ وہ قبول کرلے اور اگر وہ مجلس سے اٹھ گیا تو پھر اس کو خیار باقی نہ رہے گا۔

حضرت مولانا سید انور شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ مَا لَمۡ یَتَفَرَّقَا میں اگر تفرق سے مراد تفرق بالابدان بھی لیں تو یہ کنایہ ہے تفرق بالاقوال سے۔ یعنی ایجاب و قبول کے ساتھ بیع کی تکمیل سے۔ اس لیے کہ ایجاب و قبول کے بعد تفرق بالابدان ہو سکتا ہے۔

غیر مقلدین کا غلط پروپیگنڈا

غیر مقلد حضرات احناف کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ احناف مَا لَمۡ یَتَفَرَّقَا والی روایت کو امام ابو حنیفہؒ کے قول کی وجہ سے چھوڑ دیتے ہیں حالانکہ یہ بات غلط ہے اسی لیے حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ حدیث میں جو خیار ہے اس خیار کے دو پہلو ہیں ایک انعقاد بیع کا اور دوسرا فسخ بیع کا۔ اگر بائع اور مشتری ایجاب و قبول کے بعد مجلس سے اٹھنے سے پہلے انعقاد پر متفق ہو جائیں یا دونوں بیع کے فسخ پر متفق ہو جائیں تو یہ صورتیں احناف اور شوافع کے درمیان اتفاقی ہیں ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ اور اگر ایجاب و قبول کے بعد مجلس سے اٹھنے سے پہلے بائع انعقاد کے پہلو اور مشتری فسخ کے پہلو کو اختیار کرتا ہے یا اس کے عکس ہو تو امام شافعی فسخ کے پہلو کو اور احناف بیع کے انعقاد کے پہلو کو ترجیح دیتے ہیں اور حدیث میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے بلکہ یہ ترجیح قیاس کے ذریعہ سے ہے تو احناف حدیث کی نہیں بلکہ امام شافعیؒ کے قیاس کی مخالفت کرتے ہیں اور امام شافعیؒ کا قیاس ہمارے لیے حجت نہیں ہے۔ (تقریر ترمذی ص ۳۵)

احناف نے تو حدیث کی مخالفت نہیں کی البتہ غیر مقلدین کے امام ابن حزمؒ ظاہری نے بخاری ص ۲۸۴ ج ۱ کی بواسطہ ہمام حضرت حکیم بن حزامؓ کی روایت کے بارہ میں کہہ دیا مَا کَانَ هٰکَذَا فَلَا یَجُوۡزَ الۡاَخۡذَ بِهٖ وَلَا تَقُوۡمَ بِهِ الۡحُجَّةُ کہ اس جیسی روایت کو نہ لینا جائز ہے اور اس کے ساتھ دلیل نہیں پکڑی جا سکتی۔ ملاحظہ ہو المحلیٰ ص ۳۲۲ ج ۸)

قَوْلُہٗ اَلْبَیِّعَانِ بِالْخِیَارِ مَالَمْ یَتَفَرَّقَا اَوْ یَخْتَارَا

علامہ کشمیریؒ اور حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ اَوْ یَخْتَارَا میں اَوْ عطف کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور اسکا عطف یَتَفَرَّقَا پر ہوگا اور یہ نفی کے تحت داخل ہوگا۔ اور اَوْ اِلٰی اَنْ یا اِلَّا اَنْ کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے اور اس صورت میں یہ استثناء یا غایت ہوگی۔ (العرف الشذی ص ۲۹۱ الکوکب الدری ص ۳۶۳)

حضرات فقہاء کرام نے یَخْتَارَا کی مختلف تفسیریں بیان کی ہیں۔

پہلی تفسیر

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اختتام مجلس سے قبل ہی خیار کو ختم کرنے کے لیے کہہ دیں کہ میں نے پسند کرلیا تو ایسی صورت میں اختتام مجلس سے قبل ہی خیار ختم ہو جائے گا۔ اور اسی کو خِیَار بِاِمْضَاءِ الْبَیْعِ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (تحفۃ الاحوذی ص ۲۴۳ ج ۲)

دوسری تفسیر

دوسری تفسیر یہ ہے کہ یَخْتَارَا سے مراد خیار شرط ہے کہ اگر بائع اور مشتری میں سے کسی نے خیار لے لیا تو اختتام مجلس کے بعد بھی خیار باقی رہتا ہے اور یہ احناف کے نزدیک بھی جائز ہے امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک خیار شرط کی حد تین دن ہے جبکہ صاحبین کے نزدیک اس کی کوئی حد متعین نہیں ہے بلکہ جو مدت جانبین طے کرلیں اس وقت تک خیار رہے گا۔

تیسری تفسیر

مولانا عبد الحئیؒ لکھنویؒ فرماتے میں کہ یَخْتَارَا کی تفسیر یہ ہے کہ دونوں بیع سے قبل طے کرلیں کہ کسی کو خیار نہیں تو ایسی صورت میں بھی کسی کو خیار نہ ہوگا۔ (التعلیق الممجد ص ۳۳۹)

قَوْلُہٗ اِلَّا اَنْ تَکُوْنَ صَفْقَۃَ خِیَارٍ

مبارکپوری صاحب قاضی شوکانی کی نیل الاوطار (ص ۱۹۸ ج ۵) سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر اَنْ تَکُوْنَ میں کَانَ کو تامہ بنائیں تو صَفْقَۃَ خِیَارٍ اس کا فاعل ہو کر مرفوع ہوگا اور معنی یہ ہوگا کہ جدا ہونے تک بیعان کو خیار ہوگا مگر یہ کہ صفقہ خیار کا ہو۔ یعنی

مُتَبَایِعَیْنِ میں سے ایک دوسرے کو کہتا ہے کہ بیع تام ہونے کو اختیار کر یا فسخ کو اختیار کر تو وہ امضاء بیع کو اختیار کرتا ہے تو ایسی صورت میں بیع تام ہو گئی اور ایسی صورت میں امام شافعیؒ کے نزدیک بھی اختتام مجلس تک خیار نہ ہوگا۔ اور اگر اَنْ تَکُوْنَ میں کَانَ ناقصہ ہو تو صَفْقَةَ خِیَارٍ منصوب ہوگا اور اصل عبارت اس طرح ہوگی اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ الصَّفْقَةُ صَفْقَةَ خِیَارٍ اور وہی صورت ہوگی جو بیان ہوئی ہے۔ (تحفۃ الاحوذی ص ۲۴۳ ج ۲)

قَوْلُهٗ وَرُوِیَ عَنِ ابْنِ الْمُبَارَکِ اَنَّهٗ قَالَ کَیْفَ اَرُدُّ هٰذَا وَالْحَدِیْثُ فِیْهِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ صَحِیْحٌ کہ عبد اللہ بن المبارکؒ نے فرمایا کہ میں اس تفرق بالابدان والے نظریہ کو کیسے رد کر سکتا ہوں جبکہ اس بارہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث ثابت ہے اس کے بارہ میں الکوکب الدری ص ۳۶۴ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ حدیث بے شک صحیح ہے مگر جو مفہوم احناف کے مخالف لیا جا رہا ہے وہ مفہوم اس حدیث سے ثابت نہیں ہوتا۔

قَوْلُهٗ فَلَا یَحِلُّ لَهٗ اَنْ یُّفَارِقَ صَاحِبَهٗ خَشْیَةَ اَنْ یَّسْتَقِیْلَهٗ

امام ترمذیؒ کا احناف پر اعتراض

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اس عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ تفرق سے مراد تفرق بالابدان ہے اس لیے کہ اگر تفرق بالاقوال مراد ہو تو حدیث کا معنی صحیح نہیں رہتا اس لیے کہ اس میں صراحت ہے کہ مفارقت کی وجہ سے اس کا فسخ کا حق باطل ہوگیا اور مفارقت سے پہلے اس کو فسخ کا حق باقی تھا تو اس نے خیار مجلس ثابت ہوگیا۔ اور اگر تفرق بالاقوال مراد ہو تو اس صورت میں تو خواہ مفارقت ہو یا نہ ہو دونوں صورتوں میں فسخ کا حق نہیں رہتا اور یہ حدیث کے مفہوم کے خلاف ہے۔

اس کا پہلا جواب

حضرت گنگوہی الکوکب الدری ص ۳۶۴ میں فرماتے ہیں کہ لَا یَحِلُّ لَهٗ اَنْ یُّفَارِقَ صَاحِبَهٗ کا معنی یہ ہو سکتا ہے کہ ایجاب کے بعد دوسرا فی الفور قبول کر لے۔ اس خیال سے کہ کہیں اس کا ساتھی جس نے ایجاب کیا ہے وہ اپنے ایجاب سے رجوع نہ کر لے۔ جب اس کا معنی احناف کے نظریہ کے مطابق بھی ہو سکتا ہے تو پھر شوافع حضرات کا اپنے معنی پر دلیل کے طور پر پیش کرنا مصادرہ علی المطلوب ہے۔ (مصادرہ علی المطلوب اس کو کہتے ہیں

کہ جو دعویٰ ہو اسی کو دلیل بنا لیا جائے) اس صورت میں زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ اقالہ حقیقی معنیٰ نہ رہے گا اور اقالہ کا حقیقی معنیٰ تو شوافع حضرات کے نزدیک بھی نہیں ہے جیسا کہ مبارکپوریؒ صاحب نے تحفۃ الاحوذی ص ۲۴۳ ج ۲ میں قاضی شوکانیؒ سے نقل کیا ہے کہ اَنَّ الْمُرَادَ عَنِ الْاِسْتِقَالَۃِ الْفَسْخَ لَا حَقِیْقَۃَ الْاِقَالَۃِ استقالہ سے اقالہ کا حقیقی معنیٰ نہیں بلکہ طلب فسخ مراد ہے تو یہاں اقالہ سے مراد شوافع حضرات طلب فسخ لیتے ہیں اور احناف کے نزدیک اس صورت میں رجوع عن الایجاب یعنی ایجاب سے رجوع کرنا مراد ہوگا۔

دوسرا جواب

حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ تفرق سے مراد تفرق بالا بدان ہے تو ہم کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کا یہ فرمان اس لیے ہے کہ مجلس جب کئی حالات پر مشتمل ہو تو اگرچہ ایجاب و قبول کے ساتھ عقد پورا ہو جاتا ہے پھر بھی عاقدین میں سے ہر ایک فسخ اور اقالہ کے قبول کرنے کے قریب تر ہوتا ہے جبکہ اس کا ساتھی بھی اس کا ارادہ کر لے۔ بے شک جب وہ اسی مجلس میں اقالہ چاہے گا جس میں بیع کا عقد ہوا تو اس کو اقالہ قبول کرنے پر شرم ابھارے گی اس لیے کہ اس کو قبول کر لینے میں کوئی ضرر نہیں ہے۔ بخلاف اس کے کہ جب مجلس سے اٹھ جائیں اس لیے کہ اس صورت میں اس کو اقالہ کی وجہ سے ضرر لاحق ہوگا۔ اور حدیث کے الفاظ میں بھی اس جانب اشارہ ہے اس لیے کہ اس کو اقالہ کے ساتھ تعبیر کیا ہے اور یہ پہلے بیع کے تام ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ (الکوکب الدری ص ۳۶۴ ج ۱)

قَوْلُہٗ خَیَّرَ اَعْرَابِیًّا

علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے ایک دیہاتی سے اونٹ خریدا اور اس کو کہا کہ اپنے سودے میں غور و فکر کر لینا اگر کسی وقت بھی تم واپس لینا چاہو تو میں واپس دے دوں گا وہ کافی عرصہ کے بعد آیا اور آپؐ نے اس کے خیار کو باقی رکھا علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ آپؐ کا اتنے عرصہ کے بعد اس کو سودا واپس دے دینا حق شرعی نہ تھا بلکہ یہ تو آپؐ کے اخلاق کریمانہ اور آپ کی مروت کی وجہ سے تھا۔ (العرف الشذی ۳۹۳)

بَابُ مَا جَاءَ فِیمَنْ یُخْدَعُ فِی الْبَیْعِ

(بیع میں دھوکا کھا جانے والے کا بیان)

قَوْلُهٗ عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَجُلاً۔ عمدۃ القاری ص ۲۳۳ ج ۱۱ اور نووی شرح مسلم ص ۷ ج ۲ میں ہے کہ اس آدمی کا نام حبانؓ بن منقذ تھا۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ اس نے ایک سو تیس سال عمر پائی اور علامہ عینیؒ فرماتے ہیں وہ حضرت عثمانؓ کی خلافت میں فوت ہوا۔

قَوْلُهٗ كَانَ فِيْ عُقْدَتِهٖ ضُعْفٌ

حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ وہ ایسا آدمی تھا کہ جو چیز خرید تا اس کی مقدار بھول جاتا اور پھر کم قیمت پر اس کو بیچ دیتا تھا (الکوکب الدری ص ۳۹۴ ج ۱) امام نووی ج ۲ ص ۷ میں اور علامہ عینیؒ عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۲۳۳ میں فرماتے ہیں کہ یہ حضور علیہ السلام کے ساتھ کسی غزوہ میں شریک تھے کہ سر پر چوٹ لگی جس کی وجہ سے ان کے دماغ اور زبان میں فرق آگیا۔ امام مسلم نے ص ۷ ج ۲ میں روایات نقل کی ہے کہ حضرت حبانؓ لَا خِلَابَةَ کا صحیح تلفظ نہیں کر سکتے تھے بلکہ وہ لَا خِيَابَةَ کہتے تھے۔

علامہ کشمیریؒ فرماتے میں کہ یہ روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ حکم کا مدار مقاصد پر ہوتا ہے اگرچہ الفاظ کی ادائیگی میں کچھ کوتاہی ہو جائے۔ (العرف الشذی ص ۳۹۴)

قَوْلُهٗ لَا خِلَابَةَ

علامہ عینیؒ اور امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ لَا خِلَابَةَ خاء کے کسرہ اور لام کی تخفیف کے ساتھ ہے جس کا معنیٰ ہے لَا خَدِيْعَةَ کہ دھوکہ نہیں ہونا چاہیے۔

حضرت حبانؓ بن منقذ جب بیع و شراء کرتے تو نقصان اٹھاتے تو ان کے گھر والوں نے حضور علیہ السلام کے پاس آکر درخواست کی کہ آپ ان کو بیع و شراء سے روک دیں تو آپؐ نے ان کو بیع و شراء سے منع فرمایا تو وہ کہنے لگے کہ میں تو اس سے باز نہیں آ سکتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تو بیع کیا کرے تو لَا خِلَابَةَ کہہ دیا کر۔ تو لَا خِلَابَةَ کی وجہ سے اس کو خیار ہوتا تھا۔

کیا غبن کی وجہ سے فسخ کا خیار ہوتا ہے یا نہیں؟

امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ غبن کی وجہ سے خیار نہیں ہوتا۔ اور امام مالکؒ سے بھی ایک روایت اسی طرح کی ہے۔ اور امام مالکؒ کے وہ اصحاب جو بغداد میں تھے' وہ کہتے ہیں کہ اگر غبن مبیعہ کی کل قیمت کے تہائی حصہ جتنا ہو تو پھر فسخ کا خیار ہوگا اور اگر اس سے کم ہو تو خیار نہ ہوگا۔ اور امام مالکؒ سے ایک روایت یہ ہے کہ اگر بائع اور مشتری

بیع کے وقت مبیعہ اور اس کے بھاؤ کو جانتے تھے تو بے شک جتنا بھی غبن ہو جائے خیار نہ ہوگا اور اگر ان میں سے کوئی مبیعہ یا اس کے بھاؤ کو بیع کے وقت نہ جاننے والا ہو تو ایسی حالت میں بیع فسخ ہوگی اور امام داؤد بن علی ظاہریؒ کے نزدیک ایسی صورت میں عقد ہی باطل ہے۔

قاضی شوکانی نے لکھا ہے کہ امام احمدؒ اور ایک روایت کے مطابق امام مالکؒ کا نظریہ یہ ہے کہ جس نے بھی لَا خِلَابَۃَ کے ساتھ شرط لگا دی اور اس کے ساتھ بیع میں غبن ہوا ہو تو اس کو رد کا اختیار ہوگا۔ (نیل الاوطار ص ۱۹۴ ج ۵)

کیا لَا خِلَابَۃَ کے ساتھ خیار حضرت حبانؓ کے لیے خاص تھا؟

حضرات فقہاء کرام کا اس میں اختلاف ہے کہ حضور علیہ السلام نے حضرت حبانؓ بن منقذ کو جو لَا خِلَابَۃَ کے ساتھ اختیار دیا تھا یہ ان کے ساتھ خاص تھا یا اس کا حکم عام ہے۔

امام محمدؒ موطا ص ۳۴۱ میں فرماتے ہیں کہ ان کے ساتھ خاص تھا اور اسی کے مثل علامہ ابن حجرؒ نے فتح الباری ج ۵ ص ۲۴۱ میں اور علامہ عینیؒ نے عمدۃ القاری ص ۲۳۴ ج ۱۱ میں علامہ ابن العربی سے نقل کیا ہے۔

اعتراض

دار قطنی ج ۳ ص ۵۴ کی روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ سے بیوع کے سلسلہ میں کلام کرنے والوں نے کلام کیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا مَا اَجِدُ لَکُمْ شَیْئاً اَوْسَعَ مِمَّا جَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِحِبَّانِ بْنِ مُنْقِذٍ یعنی میں تمہارے لیے اس سے زیادہ گنجائش نہیں پاتا جو گنجائش حضور علیہ السلام نے حضرت حبانؓ بن منقذ کو دی تھی اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ نے اس حکم کو حضرت حبانؓ کے ساتھ مختص نہ سمجھا تھا۔

اس کا جواب

علامہ ابن حجر فتح الباری ج ۵ ص ۲۴۱ میں اور علامہ عینی عمدۃ القاری ص ۲۳۴ ج ۱۱ میں ابن العربی سے یہ نقل کرتے ہیں کہ اس روایت کا مدار عبد اللہ بن لہیعہ پر ہے جس پر جرح کی گئی ہے تو اس کی وجہ سے یہ روایت ضعیف ہے۔

کیا لاَ خِلاَبَۃَ کے ساتھ خیار ثابت ہوتا ہے؟

حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ خیار صرف لاَ خلابۃ کے الفاظ کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ یہ الفاظ بھی ہیں وَلِیَ الْخِیَارَ ثَلاَثَۃَ اَیَّامٍ اور مجھے تین کا خیار ہے جیسا کہ مستدرک ج ۲ ص ۲۲ اور بیہقی ج ۵ ص ۲۸۳ میں روایت ہے کہ حضرت حبانؓ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے میرے لیے تین دن کا خیار قرار دیا ہے جو بھی بیع کروں۔ تو خیار اس وجہ سے تھا (اور لا خلابۃ صرف علامت کے طور پر تھا) اور اس کی جانب حضرت گنگوہی نے الکوکب الدری ص ۳۶۴ ج ۱ میں اور علامہ کشمیریؒ نے العرف الشذی ص ۳۹۳ میں اشارہ فرمایا ہے۔

علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ لا خلابۃ کی وجہ سے کوئی حکم شرعی نہ تھا بلکہ یہ صرف اطلاع تھی کہ یہ آدمی بیع کے معاملات میں کمزور ہے اس کا لحاظ رکھا جائے اور لوگ دیندار تھے اور وہ ان الفاظ کو سمجھ جاتے تھے اور اس کے ساتھ مناسب معاملہ کرتے تھے۔

قَوْلُہٗ فَنَہَاہُ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنِّیْ لَا اَصْبِرُ عَنِ الْبَیْعِ

کیا عاقل بالغ آزاد آدمی کو تصرفات سے روکا جا سکتا ہے؟

احناف کا نظریہ یہ ہے کہ آزاد عاقل بالغ آدمی کو بیع وغیرہ جیسے معاملات سے روکا نہیں جا سکتا۔ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ سَفِیْہ یعنی نادان اور اپنا حصہ بھول جانے والے کو قاضی ان تصرفات سے روک سکتا ہے۔

شوافع حضرات کی دلیل

یہ حضرات نَہَاہُ کے الفاظ سے دلیل پکڑتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اگر روکنا درست نہ ہوتا تو آپؐ نہ روکتے۔

اس کا جواب

علامہ عینیؒ عمدۃ القاری ص ۲۳۴ ج ۱۱ میں، حضرت گنگوہیؒ الکوکب الدری میں اور حضرت شیخ الہندؒ تقریر ترمذی ص ۳۶ میں یہ جواب دیتے ہیں کہ جب اس نے حضور علیہ السلام سے کہا کہ میں بیع کے معاملہ میں خود کو نہیں روک سکتا تو آپؐ نے اس کو اجازت دے دی۔ حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ یہ نہی حکیمانہ تھی، حکماً نہ

تھی بلکہ اس پر شفقت اور مروت کی وجہ سے تھی ورنہ تو آپ اس کو کسی بھی صورت میں اجازت نہ دیتے۔

علامہ ابن حزم ظاہریؒ فرماتے ہیں کہ صرف لَا خِلَابَۃَ کے لفظ کے ساتھ ہی خیار ہوگا اگر اس کا ہم معنیٰ کوئی اور لفظ بولا گیا مثلاً لَا خَدِیْعَۃَ یا لَا غِشَّ وغیرہ کہہ دیا گیا تو خیار نہ ہوگا (المحلی ص ۴۷۵ ج ۵)

بَابُ مَا جَاءَ فِی الْمُصَرَّاۃِ

(جس جانور کے تھنوں میں دودھ روکا گیا ہو' اس کے بیچنے کا بیان)

بعض احادیث میں اَلْمُصَرَّاۃ کے اور بعض میں اَلْمُحَفَّلَات کے الفاظ آتے ہیں۔ اَلْمُحَفَّلَات جمع ہے اَلْمُحَفَّلَۃ کی۔ المصراۃ اور المحفلہ کا مفہوم ایک ہی ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ مُصَرَّاۃ تَصْرِیَۃٌ سے ہے اور پھر اس کے معانی نقل کر کے فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ نے یہ معنی کیا ہے کہ بکری یا اونٹنی کے تھنوں کو باندھ دینا اور ان کو دو تین دن تک اسی طرح چھوڑ دینا تاکہ دودھ زیادہ اکٹھا ہو جائے اور یہ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ مشتری دودھ دوہنے پر یہ سمجھے کہ اس جانور کی عادت ہی زیادہ دودھ دینے کی ہے اور اس کے ثمن میں اضافہ کرے۔ (نووی شرح مسلم ص ۳ ج ۲)

اور امام ترمذیؒ بَابُ مَا جَاءَ فِیْ بَیْعِ الْمُحَفَّلَاتِ میں فرماتے ہیں اَلْمُحَفَّلَۃُ ھِیَ الْمُصَرَّاۃُ کہ محفلہ مصراۃ ہی کو کہتے ہیں اور پھر اس کی یہ تعریف کی کہ مادہ دودھ دینے والے جانور کا مالک کئی دن تک اس کا دودھ نہ دوہے تاکہ اس کے تھنوں میں دودھ جمع ہو جائے اور اس کی وجہ سے وہ مشتری کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔

اور امام بخاری ج ۱ ص ۲۸۸ میں فرماتے ہیں کہ مصراۃ اس جانور کو کہتے ہیں جس کے دودھ کو تھنوں میں روک دیا جائے اور جمع کیا جائے اور کئی دن تک اس کا دودھ نہ دوہا جائے۔

کیا مصراۃ کا حکم اونٹنی اور بکری میں خاص ہے یا ہر مادہ جانور میں عام ہے؟

حدیث کے الفاظ میں صراحتاً صرف اونٹنی اور بکری میں تصریہ کی ممانعت ہے مگر امام بخاریؒ نے ج ۱ ص ۲۸۸ میں البقر کو بھی اس حکم میں شامل کیا ہے، بلکہ باب میں وَکُلَّ مُحَفَّلَۃٍ کا جملہ شامل کر کے اشارہ کر دیا کہ ہر مادہ جانور کا یہی حکم ہے اور علامہ ابن حجرؒ فرماتے

ہیں کہ امام بخاریؒ نے وکل محفلة کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ دیگر مَاْکُوْلُ اللَّحم مادہ جانوروں کا بھی یہی حکم ہے (فتح الباری ص ۲۶۴ ج ۵) اور علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ حنابلہ اور بعض شوافع نے یہ کہا ہے کہ تصریہ کا حکم نعم یعنی ماکول اللحم جانوروں کے ساتھ مختص ہے اور اگر کوئی آدمی لونڈی یا گدھی میں تصریہ کرتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کو دودھ کا عوض لازم ہوگا یا نہیں؟ اس میں ان حنابلہ اور بعض شوافع کا اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ عوض دینا پڑے گا اور بعض کہتے ہیں کہ عوض لازم نہیں ہے نیز علامہ ابن حجرؒ ابن دقیق العید سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تصریہ کا حکم خلاف القیاس ہے اس لیے اس کو اپنے مورد پر بند رکھیں گے۔ (فتح الباری ص ۲۶۲ ج ۵) اس سے معلوم ہوا کہ امام ابن دقیق العید کے نزدیک تصریہ کا حکم صرف اونٹنی اور بکری میں پایا جاتا ہے۔

تصریہ کی وجہ سے رد کا خیار کب ہوگا اور کتنے عرصہ تک ہوگا؟

ترمذی شریف ج ۱ ص ۲۳۶ کی روایت میں فَهُوَ بِالْخِيَارِ اِذَا حَلَبَهَا کے الفاظ ہیں اور بخاری ج ۱ ص ۲۸۸ اور ابو داؤد ۱۳۲ ج ۲ کی روایت میں بَعْدَ اَنْ يَحْلِبَهَا کے الفاظ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خیار اس جانور کا دودھ دوہنے کے بعد ہوگا علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں ظَاهِرُ الْحَدِيْثِ اَنَّ الْخِيَارَ لَا يَثْبُتُ اِلَّا بَعْدَ الْحَلَبِ کہ حدیث کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خیار دودھ دوہنے کے بعد ہی ہوگا۔ نیز فرماتے ہیں وَالْجَمْهُوْرُ عَلٰى اَنَّهٗ اِذَا عَلِمَ بِالتَّصْرِيَةِ ثَبَتَ بِهِ الْخِيَارُ وَلَوْ لَمْ يَحْلِبْ (فتح الباری ص ۲۶۵ ج ۵) کہ جمہور اس بات کے قائل ہیں کہ جس وقت مشتری کو تصریہ کا علم ہو جائے تو اس کا خیار ثابت ہو جاتا ہے اگرچہ اس نے دودھ نہ دوہا ہو۔

پھر حدیث کے الفاظ ہیں فَهُوَ بِالْخِيَارِ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ ظاہر حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خیار تین دن تک ممتد ہوگا یہ ہمارے بعض شوافع حضرات کا نظریہ ہے وَالْاَصَحُّ عِنْدَهُمْ اَنَّهٗ عَلَى الْفَوْرِ اور شوافع کا اصح قول یہ ہے کہ خیار فی الفور ہوگا اور ثلاثہ ایام کی روایات کو اس صورت پر محمول کریں گے جبکہ مشتری کو مصراۃ کا علم نہ ہوا ہو۔ (شرح مسلم ص ۴ ج ۲)

تنبیہ

جو عبارات پیش کی گئی ہیں ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مصراۃ والی حدیث کے

ظاہر پر امام بخاریؒ سمیت کسی کا عمل نہیں ہے بلکہ وہ اس میں قیاس اور رائے کو شامل کرتے ہیں اور دیگر حضرات فقہاء کرام نے بھی اپنے اپنے دلائل کے مطابق اس حدیث کو ظاہر سے پھیر کر آراء قائم کی ہیں۔

حدیث مصراۃ کے بارے میں احناف کا نظریہ

احناف کہتے ہیں کہ حدیث مصراۃ پر عمل نہیں ہو سکتا اور اس کی کئی وجوہات ہیں۔

پہلی وجہ

مصراۃ والی روایات میں اضطراب ہے۔ کسی میں صَاعٌ مِّنْ تَمْرٍ (بخاری ج ۱ ص ۲۸۸) کسی میں صَاعًا مِّنْ طَعَامٍ کسی میں صَاعًا مِّنْ طَعَامٍ لَا سَمْرَاءَ (مسلم ج ۲ ص ۴) یعنی طعام کا ایک صاع ہو جو کہ گندم نہ ہو۔ اور کسی میں صَاعٌ مِّنْ قَمْحٍ (گندم کا ایک صاع) کے الفاظ آتے ہیں۔ اور کسی روایت میں صاع اور کسی میں مِثْلٌ اَوْ مِثْلَيْ لَبَنِهَا قَمْحًا (ابو داؤد ج ۲ ص ۱۳۲) کہ اس کے دودھ کے برابر یا دودھ سے دوگنا اور کسی میں بِاِنَاءٍ مِّنْ طَعَامٍ (کہ طعام کا ایک برتن) کے الفاظ آتے ہیں۔ اور اس اضطراب کا اعتراف خود علامہ ابن حجرؒ نے فتح الباری ص ۲۶۸ ج ۵ میں اور مبارک پوری صاحبؒ نے تحفۃ الاحوذی ص ۲۴۵ ج ۲ میں کیا ہے اور پھر اس کا جواب دیا کہ صحیح طرق میں کوئی اختلاف نہیں اور ضعیف طرق کی وجہ سے صحیح پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مگر مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اعلاء السنن ص ۷۷ ج ۱۴ میں فرماتے ہیں کہ یہ صرف تساہل اور تسامح ہے ورنہ ابن سیرین کی روایات میں باوجود صحت کے اضطراب کا اعتراف علامہ ابن حزمؒ نے بھی المحلی میں کیا ہے نیز بخاری اور مسلم کی روایات میں کسی میں صَاعٌ مِّنْ تَمْرٍ (کھجوروں کا ایک صاع (اور کسی میں صَاعٌ مِّنْ طَعَامٍ (طعام کا ایک صاع) اور کسی میں صَاعٌ مِّنْ طَعَامٍ لَا سَمْرَاءَ (طعام کا ایک صاع جو گندم نہ ہو) کے الفاظ ہیں۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اکثر شوافع حضرات کے نزدیک صَاعٌ مِّنْ تَمْرٍ متعین ہے اور بعض حضرات کے نزدیک صَاعٌ مِّنْ قُوْتِ الْبَلَدِ ہے (شرح مسلم ص ۵ ج ۲) یعنی جو خوراک ایک شہر میں عام استعمال کی جاتی ہو اس کا ایک صاع دینا ہوگا۔ اور حضرت گنگوہی فرماتے ہیں کہ تمر کی تخصیص ترجیح بلا دلیل ہے۔ (الکوکب الدری ص ۳۶۵ ج ۱)

دوسری وجہ

حدیث مصراۃ کے ظاہر پر مکمل عمل تو امام بخاریؒ سمیت ائمہ میں کسی کا نہیں۔ سب اس میں اپنی آراء کو داخل کرتے ہیں تو اس کی ایسی تاویل کرنی چاہیے جو کتاب اللہ اور سنت مشہورہ میں سے کسی کے مفہوم کے مخالف نہ ہو۔ اور قرآن کریم میں (سورۃ النحل آیت ۱۲۶) ہے وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ اور اگر تم بدلہ لو تو اسی قدر بدلہ لو جتنی تمہیں تکلیف پہنچائی گئی ہے اور قرآن کریم میں ہے فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (سورۃ البقرہ آیت نمبر ۱۹۴) پس تم اس پر زیادتی کرو جیسی اس نے تم پر زیادتی کی۔ ان آیات میں ایک ضابطہ بیان کیا گیا ہے کہ بدلہ برابر ہونا چاہیے مگر اس حدیث پر عمل کرنے کی وجہ سے یہ ضابطہ چھوڑنا پڑتا ہے اسی لیے علامہ ابن الہمام نے فتح القدیر ص ۱۴۱ ج ۲ میں فرمایا کہ تلف شدہ چیز کا تاوان بالمثل ہونا چاہیے اور صَاعٌ مِنْ تَمْرٍ نہ تو اس دودھ کا مثل صوری ہے اور نہ مثل معنوی یعنی نہ اس دودھ کی قیمت ہے جو مشتری نے استعمال کیا ہے اس لیے نص قطعی کو ترجیح ہوگی اور اس حدیث کی تاویل یہ ہوگی کہ حضور علیہ السلام نے ایسا صرف نزاع ختم کرنے کے لیے فرمایا ہوگا۔

تیسری وجہ

حدیث مصراۃ اَلْخَرَاجُ بِالضَّمَانِ والی حدیث کے خلاف ہے اور یہ حدیث ابوداؤد ص ۱۳۹ ج ۲، طحاوی ص ۱۴۹ ج ۲ اور سنن الکبریٰ ص ۳۲۱ ج ۵ میں ہے۔ جو خرچہ اٹھاتا ہے وہی اس کے فوائد کا حقدار ہوتا ہے۔ یہاں چونکہ مشتری چارہ وغیرہ ڈال کر خرچہ اٹھاتا ہے تو دودھ کا حقدار بھی وہی ہے اور حدیث مصراۃ پر عمل کرنے کی وجہ سے اس اصول کی خلاف ورزی لازم آتی ہے۔ اسی طرح یہ حدیث اَلْغُنْمُ بِالْغُرْمِ والی حدیث کے بھی خلاف ہے۔ یعنی جس پر تاوان آتا ہے، فائدہ بھی وہی اٹھا سکتا ہے۔ اگر ایسی صورت میں جانور ہلاک ہو جائے تو مشتری کا مال ہلاک ہوگا اور یہ جانور مشتری کی ضمان میں ہے تو فائدہ بھی وہی اٹھائے گا۔

چوتھی وجہ

قاعدہ ہے کہ طعام کی طعام سے بیع نسیئہ جائز نہیں ہے خواہ جنس مختلف ہو جیسا کہ بخاری ص ۲۹۱ ج ۱ کی روایت ہے لَا بَأْسَ بِهٖ يَدًا بِيَدٍ وَلَا خَيْرَ فِيْهِ نَسِيْئَةً اگر ہاتھ بہ ہاتھ ہو تو کوئی حرج نہیں ہے اور ادھار کی صورت میں اس میں خیر نہیں ہے اور حدیث مصراۃ پر

عمل کی وجہ سے اس کی مخالفت لازم آتی ہے اس لیے کہ دودھ بھی طعام ہے اور اس کے بدلے میں تمر یا طعام ہے اور ظاہر ہے کہ دودھ دوہنے کا زمانہ اور ہے اور تمر یا طعام ادا کرنے کا زمانہ اور ہے یعنی جب وہ دودھ نکال رہا تھا تو اس وقت اس نے طعام نہیں دیا اور جب طعام یا تمر دے رہا ہے تو اس وقت دودھ نہیں ہے۔

پانچویں وجہ

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ مصراۃ والی حدیث منسوخ ہے اس لیے کہ یہ حرمت ربا سے پہلے کی ہے اور چونکہ ربوا کی حرمت نص قطعی اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اس لیے حدیث مصراۃ پر عمل نہیں۔ (شرح معانی الاثار ص ۱۶۸ ج ۲)

چھٹی وجہ

طحاوی ص ۱۶۹ ج ۲، دار قطنی ص ۳۱۹ ج ۲، سنن الکبریٰ ص ۲۹۰ ج ۵ اور مستدرک ص ۵۷ ج ۲ وغیرہ میں روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بَیْعُ الْکَالِیِٔ بِالْکَالِیِٔ سے منع فرمایا ہے یعنی ایسی بیع جس میں دونوں جانب سے ادہار ہو۔ تو حدیث مصراۃ پر عمل کی وجہ سے ان روایات کی مخالفت لازم آتی ہے اس لیے کہ ابھی تک نہ تو مشتری نے پورا دودھ وصول کیا اور نہ ہی بائع نے تمر کا صاع وصول کیا ہے اور یہ بَیْعُ الدَّیْنِ بِالدَّیْنِ ہے جس سے نہی آئی ہے۔

تصریہ غبن ہے یا عیب ہے؟

ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ تصریہ غبن ہے کہ بائع نے ایسا کر کے مشتری کے ساتھ غبن کیا ہے تو غبن کی دیگر صورتوں کی طرح اس میں بھی یا تو مشتری بائع کو راضی کر کے اس جانور کو رد کرے یا اس کا جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی بائع سے کرائے اس صورت میں رد متعین نہیں ہے امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ تصریہ عیب ہے اور عیب کی وجہ سے مبیعہ کا رد متعین ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں وَاعْلَمْ اَنَّ التَّصْرِیَةَ حَرَامٌ سَوَاءٌ تَصْرِیَةُ النَّاقَةِ وَالْبَقَرَةِ وَالشَّاةِ وَالْجَارِیَةِ وَالْفَرَسِ وَالْاَتَانِ وَغَیْرِھَا لِاَنَّہٗ غِشٌّ وَخِدَاعٌ وَبَیْعُھَا صَحِیْحٌ مَعَ اَنَّہٗ حَرَامٌ (شرح مسلم ص ۳ ج ۲) آپ جان لیں کہ تصریہ حرام ہے خواہ تصریہ اونٹنی میں ہو یا

گائے، بکری، لونڈی، گھوڑی اور گدھی وغیرہ میں ہو اس لیے کہ یہ فراڈ اور دھوکا ہے اور ایسی بیع حرام ہونے کے باوجود صحیح ہے امام نوویؒ کی اس وضاحت کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ جب بیع صحیح ہے تو پھر بائع کی رضا کے بغیر رد کیسے متعین ہو سکتا ہے؟ باقی رہا یہ کہ اس میں مشتری کا نقصان ہے تو اس کے نقصان کی تلافی بائع سے کرائی جا سکتی ہے۔

مصراۃ میں رد کی صورت میں کیا عوض دینا ہوگا اور وہ عوض کس کا ہوگا؟

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مصراۃ کی وجہ سے رد کی صورت میں صَاعٌ مِنْ تَمرٍ کا تعین ضروری نہیں ہے جبکہ شوافع کے نزدیک اس کا تعین ضروری ہے جیسا کہ پہلے امام نووی کے حوالہ سے گزر چکا ہے امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اگر رد کی صورت ہو تو مشتری نے جتنا دودھ استعمال کیا ہے، اس کی قیمت ادا کرے۔

علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ مصراۃ میں خواہ ایک جانور ہو یا کئی جانور ہوں (جبکہ مشتری نے ان کو اکٹھا خریدا ہو اور ان کا دودھ دوہنے کے بعد تصریہ کا علم ہوا ہو) تو تمام جانوروں کے دودھ کے عوض میں ایک ہی صاع کھجوریں ادا کرنا ہونگی (فتح الباری ص ۲۷۳ ج ۵)

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ یہ حدیث اصول کے خلاف وارد ہوئی ہے اس لیے کہ ایک صاع کھجوروں کا سو یا اس سے بھی زائد بکریوں اور اونٹنیوں کے دودھ کا بدل بننا خلاف المعقول ہے۔

حدیث کے الفاظ ہیں فَهُوَ بِالْخِيَارِ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ کہ مشتری نے مصراۃ جانور خریدا اور تین دن جو اس کے خیار کے ہیں اگر ان دنوں میں ایک دفعہ یا کئی دفعہ بھی دودھ دوہا ہو تو جن حضرات کے نزدیک رد متعین ہے ان کے نزدیک اس سارے دودھ کے بدلہ میں صاع من تمر دے گا۔ احناف یہ کہتے ہیں کہ یہ بھی خلاف المعقول ہے اور علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں وَرَدَّ عِوَضِ اللَّبَنِ الَّذِيْ كَانَ مَوْجُوْدًا وَقْتَ الْعَقْدِ وَجَعَلَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِوَضَهٗ صَاعًا مِنْ تَمْرٍ (فتاویٰ ابن تیمیہ ص ۴۲۶ ج ۲۹) یعنی اصل میں اس دودھ کا عوض واپس کرنا چاہئے جو کہ عقد کے وقت جانور کے تھنوں میں تھا اور آپ ﷺ نے اس کا عوض ایک صاع کھجوروں کو قرار دے دیا۔

احناف پر اعتراض

بعض حضرات نے کہا ہے کہ جس طرح جَنِیَن (نا تمام بچہ) کی دیت غرہ کی صورت میں یا زخموں کی دیت دی جاتی ہے حالانکہ یہ خلاف المعقول ہے اور احناف اس کو مانتے ہیں تو اسی طرح یہاں بھی ایک صاع کھجوروں کا متعین ہونا بے شک خلاف المعقول ہے مگر حدیث کی وجہ سے وہ مان لینا چاہیے۔

اس کا جواب

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ یہ قیاس مع الفارق ہے (اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۶۴) اس لیے کہ جَنِیَن یا زخم کی صورت میں غرہ یا دیت کی ادائیگی مظلوم کے ساتھ تعاون ہے جبکہ مصراۃ کی صورت میں ایک صاع کھجوریں بائع کو دینا ہوتی ہیں جو کہ ظالم اور دھوکا دینے والا ہے۔

احناف پر دوسرا اعتراض اور اس کا جواب

بعض حضرات نے یہ اعتراض کیا ہے کہ جس طرح نماز میں قہقہہ کی وجہ سے وضو ٹوٹنے اور بھول کر روزے کی حالت میں کھا پی لینے کی روایات کو خلاف القیاس ہونے کا باوجود احناف تسلیم کرتے ہیں تو اسی طرح مصراۃ والی حدیث پر عمل کیوں نہیں کرتے اس کا جواب یہ ہے کہ مصراۃ والی حدیث کے ظاہر پر عمل کرنے کی وجہ سے بہت سے مسلمہ اصولوں کی خلاف ورزی لازم آتی ہے جن کا بیان پہلے ہو چکا ہے۔ جبکہ قہقہہ فی الصلوۃ یا روزہ کی حالت میں بھول کر کھا پی لینے والی روایات پر عمل کرنے سے کسی اصول کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ اس لیے دونوں صورتوں میں فرق ہے اور اصول و قواعد کے پیش نظر کسی حدیث کے ظاہر پر عمل نہ کرنے کو طعن نہیں بنایا جا سکتا۔ اس لیے کہ ایسا صرف احناف ہی نہیں کرتے بلکہ دیگر فقہاء کرام بھی کرتے ہیں جیسا کہ علامہ محمد ابن ابراہیم الوزیر الیمانی لکھتے ہیں کہ بلاشبہ حضرت امام شافعیؒ نے کئی احادیث کو دیکھ کر اور جان کر ان کے ظاہر پر عمل ترک کر دیا کیونکہ ان کے نزدیک ان احادیث یا ان کی نسخ یا ان کی تاویل یا اس کی مانند اور اعذار پر دلائل قائم ہو چکے ہیں (الروض الباسم ص ۱۰۷ ج ۱) اور غیر مقلدین بھی بہت سی احادیث کے ظاہر پر عمل نہیں کرتے اس لیے ان کو اس بارہ میں احناف کو طعن دیتے وقت خود اپنا محاسبہ بھی کر لینا چاہیے۔

حضرت مولانا سید انور شاہ صاحبؒ فیض الباری ص ۲۴۱ ج ۲ اور العرف الشذی ص

۳۹۴ میں فرماتے ہیں کہ حدیث مصراۃ صلح اور دیانت کی حالت پر محمول ہے یعنی قضاء" تو رد واجب نہیں البتہ صلح کی صورت میں یا دیانتاً رد ہو سکتی ہے اور ایسا احناف کے نزدیک بھی ہے۔ باقی رہا یہ کہ قضاء" حکم اور ہو اور دیانتاً اور ہو تو اس بارہ میں حضرت علامہ کشمیری فرماتے ہیں کہ ایسا تو شوافع کے ہاں بھی ہے۔

الغرض احناف کے نزدیک تصریہ کی وجہ سے جانور کا رد بائع کی رضا کے ساتھ ہو سکتا ہے اور صاع من تمر کا ادا کرنا بائع اور مشتری کے جھگڑے کو ختم کرنے کے لیے تبرعا" ہو سکتا ہے یہ واجب اور ضروری نہیں ہے اور حدیث مصراۃ کو اسی پر محمول کریں گے تاکہ مسلمہ اصولوں اور دیگر روایات کی مخالفت لازم نہ آئے۔

احناف کے خلاف پروپیگنڈہ اور اس کی حقیقت

احناف میں سے عیسیٰ بن ابان نے (جو کہ امام شافعیؒ کے ہم عصر ہیں) کہا ہے کہ مصراۃ والی حدیث صرف حضرت ابوہریرۃؓ سے ہے اور حضرت ابوہریرۃؓ چونکہ غیر فقیہ ہیں اس لیے ان کی یہ روایت قیاس کے خلاف ہونے کی وجہ سے متروک ہے اور اسی سے بعض حضرات نے اصول فقہ کی کتابوں مثلاً نور الانوار ص ۱۸۳ اور اصول الشاشی ص ۷۵ وغیرہ میں لکھ دیا ہے مگر یہ نظریہ جمہور احناف کا نہیں بلکہ صرف عیسیٰ بن ابانؒ کا ہے جیسا کہ النامی علی الحسامی ص ۱۴۹ اور المولوی علی الحسامی ص ۳۸۴ میں منقول ہے۔ جمہور احناف کے نزدیک خبر واحد قیاس پر مقدم ہوتی ہے یہاں تک کہ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ اگر روایت ہوتی تو قیاس کے مطابق میں عمل نہ کرتا۔ روزہ کی حالت میں بھول کر کھا پی لینا خلاف القیاس ہونے کے باوجود احناف حضرت ابوہریرۃؓ کی روایت پر عمل کرتے ہیں (المولوی علی الحسامی ص ۳۸۴) عیسیٰ بن ابان کے نظریہ کی وجہ سے تمام احناف کو طعن کا نشانہ بنانا اور ان کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا قطعاً درست نہیں ہے جبکہ احناف نے خود اس نظریہ کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ یہ روایت صرف ابوہریرۃؓ سے ہی نہیں ہے بلکہ یہ روایت حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت انسؓ سے بھی ہے اور یہ بھی غلط ہے کہ حضرت ابوہریرۃؓ غیر فقیہ تھے۔ علامہ ابن الہمام فرماتے ہیں کہ حضرت ابوہریرۃؓ فقیہ تھے (فتح القدیر ص ۱۳۱ ج ۲) حضرت ابوہریرۃؓ مدینہ کے قاضی تھے (بخاری ص ۳۲۳ ج ۱) مولانا عبد الحلیم لکھنوی فرماتے ہیں حضرت ابوہریرۃؓ فقیہ تھے (قمر الاقمار ص ۱۸۳) مولانا عبد الحئی لکھنوی فرماتے ہیں کہ حضرت ابوہریرۃؓ فقیہ تھے۔ (مقدمہ ہدایہ اخیرین ص ۸) اور مولانا محمد یعقوب

البنانی فرماتے ہیں کہ یہ بات ثابت نہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ غیر فقیہ تھے (المولوی علی الحسامی ص ۳۸۵) اور علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ کو غیر فقیہ کہنا اور پھر یہ کہنا کہ غیر فقیہ کی روایت کا اعتبار نہیں یہ ایسی بات ہے کہ اس کو کتابوں سے نکال دینا چاہیے (العرف الشذی ص ۳۹۴) ان عبارات سے واضح ہو گیا کہ جمہور احناف کا یہ نظریہ نہیں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ غیر فقیہ تھے بلکہ یہ نظریہ عیسیٰ بن ابان کا ہے اس لیے تمام احناف کی جانب یہ نظریہ منسوب کر کے پروپیگنڈہ کرنا قطعاً درست نہیں ہے۔

مصراۃ والی بعض روایات اور ان کی حیثیت

قَوْلُهٗ وَفِي الْبَابِ عَنْ اَنَسٍ

یہ روایت مسند ابو یعلیٰ ج ۵ ص ۱۵۵ میں ہے مگر اس کی سند میں اسماعیل بن مسلم المکی ہے جو کثیر التدلیس ہے۔

قَوْلُهٗ وَرَجُلٍ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

یہ روایت مسند احمد ج ۴ ص ۳۱۴ میں ہے مگر صحابی کا نام نہیں ذکر کیا

حدیث مصراۃ حضرت ابن عمرؓ سے ابوداؤد ج ۲ ص ۱۳۲ میں ہے مگر اس میں جمیع بن عمر التیمی ہے جس کے بارہ میں امام بخاریؒ نے فرمایا فِيْهِ نَظَرٌ اور ابن حبان نے اس کو ضعفاء میں شمار کیا ہے اور کہا ہے کَانَ رَافِضِيًّا يَضَعُ الْحَدِيْثَ کہ یہ رافضی تھا اور حدیثیں وضع کرتا تھا۔ اور ابن نمیر نے کہا کہ کَانَ مِنْ اَكْذَبِ النَّاسِ بہت بڑا جھوٹا تھا (بذل المجہود ص ۲۷۰ ج ۵)

مبارکپوری صاحبؒ علامہ ابن حجر سے نقل کرتے ہیں کہ مصراۃ والی حدیث بیہقی میں عمرو بن عوف المزنی سے بھی ہے (تحفۃ الاحوذی ص ۲۴۴ ج ۲) مگر مولانا ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت عمرو بن عوف سے نہیں بلکہ عَنْ عَوْفٍ عَنِ الْحَسَنِ مُرْسَلًا روایت ہے (حاشیہ اعلاء السنن ص ۶۰ ج ۱۴) اور مرسل روایت تو شوافع اور غیر مقلدین کے نزدیک حجت نہیں ہوتی۔ اور بخاری ج ۱ ص ۲۸۸ میں مصراۃ کی حدیث حضرت ابن مسعودؓ سے موقوفاً ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي اشْتِرَاطِ ظَهْرِ الدَّابَّةِ عِنْدَ الْبَيْعِ

(جانور کی بیع کرتے وقت اس پر سواری کی شرط لگانے کا بیان)

اگر ایک آدمی نے سواری خریدی اور بائع نے اپنے ٹھکانے تک پہنچنے تک سوار رہنے کی شرط لگادی تو کیا یہ درست ہے یا نہیں۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ درست نہیں ہے بلکہ فرماتے ہیں کہ ہر ایسی شرط جس کا عقد تقاضا نہیں کرتا ایسی کوئی شرط بیع میں درست نہیں ہے البتہ امام شافعیؒ کے نزدیک آزاد کر دینے کی شرط کے ساتھ غلام یا لونڈی کا خریدنا اور بیچنا درست ہے۔ اور امام احمدؒ اور امام اسحاق بن راہویہؒ فرماتے ہیں کہ بیع میں ایک شرط لگانا جائز ہے اور اگر دو شرطیں لگادیں تو درست نہیں ہے اس لیے ان کے نزدیک ایک شرط کی وجہ سے ٹھکانے تک پہنچنے تک سوار رہنے کی شرط لگانا درست ہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر منزل قریب ہو تو شرط لگانا درست ہے ورنہ مکروہ ہے اور مبارکپوریؒ فرماتے ہیں کہ قریب کی حد یہ ہے کہ تین دن کی مسافت ہو۔ (تحفۃ الاحوذی ص ۲۴۶ ج ۲)

امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے دلائل۔ پہلی دلیل

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نَهٰی عَنْ بَيْعٍ وَ شَرْطٍ (نیل الاوطار ج ۵ ص ۱۹۰)

شرط کے ساتھ بیع سے منع فرمایا ہے۔

دوسری دلیل

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نَهٰی عَنِ الثُّنْيَا (مسلم ج ۲ ص ۱۱)

تیسری دلیل

موطا امام مالکؒ ص ۵۴۱ میں حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی سے لونڈی خریدی اور بیوی نے یہ شرط لگائی کہ اگر آپ اس لونڈی کو بیچنا چاہیں گے تو جتنے کی میں نے آپ پر بیچی ہے اتنے کی میں ہی آپ سے خرید لوں گی تو انہوں نے حضرت عمرؓ سے مسئلہ پوچھا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس لونڈی کے قریب نہ جانا اس لیے کہ (بائع اور مشتری میں سے) ایک کے لیے شرط رکھی گئی ہے۔

چوتھی دلیل

موطا امام مالک میں ہے کہ حضرت ابن عمرؓ سے پوچھا گیا کہ رقبہ واجبہ اگر عِتق کی

شرط کے ساتھ خریدا جائے تو کیا درست ہے تو انہوں نے فرمایا نہیں۔ اس میں امام شافعی کا جواب بھی ہو جاتا ہے جو اس کے قائل ہیں کہ غلام یا لونڈی کو آزاد کرنے کی شرط کے ساتھ خریدنا اور بیچنا جائز ہے۔

امام احمدؒ وغیرہ کی پہلی دلیل

ترمذی ج ۱ ص ۲۳۶ وغیرہ کی حضرت جابرؓ بن عبد اللہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے اونٹ خریدا اور میں نے اپنے گھر پہنچنے تک اس پر سواری کی شرط لگائی۔ اس میں چونکہ ایک شرط تھی اس لیے جائز ہے۔

اس کا جواب

امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت کے الفاظ مختلف آتے ہیں کسی روایت میں ہے اَعَارَہٗ ظَھْرَ الْجَمَلِ اِلَی الْمَدِیْنَۃِ کہ حضرت جابرؓ نے حضور علیہ السلام سے اونٹ کی سواری مدینہ پہنچنے تک عاریت کے طور پر لی۔ کسی روایت میں ہے ہے بِعْتَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ جَمَلاً فَاَفْقَرَنِیْ ظَھْرَہٗ اِلَی الْمَدِیْنَۃِ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اونٹ بیچا تو آپؐ نے مدینہ پہنچنے تک کے لیے اس کی سواری مجھے عاریتاً" دی۔ افقار کا معنی ہے سوار ہونے کے لیے سواری عاریت کے طور پر لینا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شرط بیع کے اندر نہ تھی (بلکہ بیع کے بعد تھی) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپؐ نے ان سے اس کا وعدہ کیا ہو اور عقد جب شروط سے خالی ہو تو اس کے بعد اگر ایسے امور میں سے کوئی امر پایا جائے تو اس سے عقد میں کوئی نقصان نہیں آتا۔ اور چونکہ آپ نے افقار اور اعارہ کا وعدہ فرمایا تھا اور یہ آپ کی جانب سے ایسا معاملہ تھا جس کے پورا کرنے میں کوئی شک ہی نہیں تو راوی نے اس کو شرط کی جگہ ذکر کر دیا اور ایسے امور واجبہ جن کی خلاف ورزی نہ ہو سکتی ہو ان کو شرط سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ جب آپ حضرت جابرؓ کے قصہ میں غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس میں بیع کے احکام قبضہ کرنا اور حوالے کرنا وغیرہ پائے ہی نہیں گئے۔ بلکہ آپ نے جو ثمن طے کیا تھا وہ بھی اور اونٹ بھی حضرت جابرؓ کو دے دیا تھا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ در حقیقت بیع نہ تھی بلکہ حضرت جابرؓ کے ساتھ تعاون کرنے اور ان کی مدد کرنے کا ایک معاملہ تھا (معالم السنن ص ۱۵۰ تا ۱۵۲ ج ۵) اور حضرت سہارنپوری نے بھی امام خطابی کے حوالہ سے یہی بحث بذل المجہود ص ۲۸۸ ج

۵ میں نقل کی ہے۔
تو احناف کہتے ہیں کہ یہ شرط صلب عقد میں نہ تھی بلکہ بعد میں تبرعاً تھی۔

امام احمد وغیرہ کی دوسری دلیل

جب حضرت بریرہؓ کو حضرت عائشہؓ نے خریدنا چاہا تو اس کے مالکوں نے شرط لگائی کہ ولاء ہماری ہوگی اس کے باوجود حضرت عائشہؓ نے اس کو خرید لیا (ابوداؤد ص ۴۸ ج ۲ ترمذی ص ۲۳۸ ج ۱)

اس کا پہلا جواب

جب روایات میں موجود ہے کہ حضور علیہ السلام نے خطبہ ارشاد فرما کر ایسی شرط لگانے پر ناراضگی کا اظہار فرمادیا تھا تو پھر کیسے اس شرط کا جواز ثابت ہو سکتا ہے؟

دوسرا جواب

حضرت بریرہؓ والی روایت میں بعض راوی کہتے ہیں کہ حضرت بریرہؓ کی بیع ہوئی تھی مگر امام طحاوی نے ج ۲ ص ۱۸۱ میں امام زہری سے جو روایت کی ہے اس میں ہے کہ وہ بیع نہ تھی بلکہ بدل کتابت کی ادائیگی تھی۔ اور امام زہری اَتْقَنْ اور اَضْبَطْ ہیں اس لیے ان کی روایت کو ترجیح ہوگی تو جب یہ بیع ہی نہیں تو پھر اس کو اس معاملہ میں پیش کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے؟

امام خطابیؒ نے معالم السنن ص ۱۵۴ ج ۵ میں اور علامہ کشمیریؒ نے العرف الشذی ۳۹۵ میں المحلی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ عبد الوارث بن سعید کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حج کے موسم میں تین فقیہ امام ابوحنیفہؒ ابن ابی لیلیٰؒ اور ابن ابی شبرمہؒ اکٹھے ہیں تو میں نے ان سے ایک مسئلہ پوچھا تو تینوں کے جوابات مختلف تھے میں نے پوچھا کہ ایک آدمی بیع کرتا ہے اور اس میں شرط رکھتا ہے تو امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ شرط بھی باطل اور بیع بھی باطل ہے اور دلیل میں نَھٰی عَنْ بَیْعٍ وَّشَرْطٍ والی حدیث بیان کی۔

اور ابن ابی لیلیٰؒ سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ بیع جائز ہے اور شرط باطل ہے اور دلیل میں حضرت بریرہؓ والی حضرت عائشہؓ کی روایت پیش کی جس میں ہے اَمَرَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ اَشْتَرِیَ بَرِیْرَۃَ فَاُعْتِقَھَا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں بریرہ کو خرید لوں پھر اس کو آزاد کر دوں۔ امام خطابی معالم السنن ص ۱۵۵

ج ۵ میں فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بے شک تو اس کے مالکوں کے لیے ولاء کی شرط مان لے اس لیے کہ ایسی شرط کا اعتبار نہیں ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ بیع جائز اور شرط باطل ہے۔

اور ابن ابی شبرمہؒ سے یہی مسئلہ پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ بیع بھی جائز ہے اور شرط بھی جائز ہے اور انہوں نے اپنی دلیل میں حضرت جابر بن عبد اللہ والی حدیث پیش کی جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے اونٹ خریدا اور میں نے مدینہ تک پہنچنے کے لیے سواری کی شرط لگائی۔

اس کے بارے میں ائمہ کرام کے نظریات اور دلائل بَابُ مَا جَاءَ فِیْ کَرَاہِیَۃِ بَیْعِ مَا لَیْسَ عِنْدَکَ میں بیان ہو چکے ہیں۔

بَابُ الْاِنْتِفَاعِ مِنَ الرَّهْنِ

(مرہونہ چیز سے فائدہ اٹھانے کا بیان)

لغت میں رہن کہتے ہیں کسی چیز کو روک رکھنا خواہ کسی بھی وجہ سے ہو۔ اور شریعت کی اصطلاح میں کہتے ہیں کہ اپنے کسی حق قرض وغیرہ کی وجہ سے جس کے ذمہ حق ہے اس کی کسی ایسی چیز کو روک رکھنا جس سے اس حق کی ادائیگی ہو سکے۔ (ہدایہ ص ۲۴۳ ج ۴)

اگر کوئی آدمی کسی دوسرے سے قرض لیتا ہے اور قرض دینے والا قرض لینے والے سے اس کی کوئی ملکیتی چیز اعتماد کے لیے اپنے پاس رکھ لیتا ہے تاکہ قرض لینے والے نے قرض کی ادائیگی کی جو میعاد مقرر کی ہے اس میعاد کے پورا ہونے پر وہ قرض ادا کر دے تو اس چیز کے روک رکھنے کو رہن کہتے ہیں۔ قرض لے کر اپنی ملکیتی چیز دوسرے کے پاس رکھنے والے کو راہن اور جس کے پاس چیز رکھی گئی ہے اس کو مرتہن اور جو چیز رکھی گئی ہے اس کو مرہون کہتے ہیں۔

رہن کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ عاقدین عاقل ہوں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ دونوں راضی ہوں اور تیسری شرط یہ ہے کہ راہن نے مرتہن کے پاس جو چیز رہن کے طور پر رکھنی ہے اس پر مرتہن کو قبضہ دے اور چوتھی شرط یہ ہے کہ مرہونہ چیز ایسی ہو کہ اس کو بیچ کر اس کی قیمت وصول کی جا سکے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک سفر اور حضر دونوں حالتوں میں رہن رکھنا

جائز ہے اور امام داؤد بن علی ظاہریؒ اور مجاہدؒ کے نزدیک سفر میں جائز ہے حضر میں جائز نہیں ہے اور وہ اپنے نظریہ میں دلیل کے طور پر وَاِنۡ كُنۡتُمۡ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمۡ تَجِدُوۡا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقۡبُوۡضَةٌ (سورۃ البقرہ آیت نمبر ۲۸۳) کو پیش کرتے ہیں یعنی اگر تم سفر میں ہو اور کاتب نہ پاؤ تو رہن ہاتھ میں رکھنی چاہیے۔ جمہور کی طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ سفر میں ایسی اچانک ضرورت پیش آجاتی ہے اس لیے سفر کی حالت میں رہن کا ذکر کر دیا گیا ہے ورنہ رہن تو حضر میں بھی جائز ہے جیسا کہ بخاری ج ۲ ص ۶۴۱ اور مسلم ج ۱ ص ۲۳۶ کی روایت میں ہے حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی وَدِرۡعُهٗ مَرۡهُوۡنَةٌ عِنۡدَ يَهُوۡدِيٍّ بِثَلَاثِيۡنَ صَاعًا مِّنۡ شَعِيۡرٍ تو اس وقت آپ کی درع مبارک تیس صاع جو کے بدلے ایک یہودی کے پاس رہن رکھی ہوئی تھی۔

مرہونہ چیز کی حیثیت کیا ہے؟

احناف کے نزدیک جب مرہونہ چیز پر مرتہن نے قبضہ کر لیا تو وہ اس کی ضمان میں ہو جاتی ہے یعنی اس کی حفاظت اس کے ذمہ ہوتی ہے اور اگر اس کے قبضہ میں وہ ضائع ہو جائے تو اس کا تاوان اس پر ہوگا۔ اگر قرضہ جو لیا ہے وہ اس مرہونہ چیز کی قیمت کے برابر ہو تو معاملہ برابر ہو گیا' نہ راہن کے ذمہ کچھ رہا اور نہ مرتہن کے ذمہ۔ اور اگر قرضہ کم ہے اور مرہونہ چیز کی قیمت زیادہ ہو تو قرضہ جتنی رقم نکال کر باقی رقم یہ مرتہن راہن کو ادا کر دے گا۔ اور اگر قرضہ زیادہ اور مرہونہ چیز کی قیمت کم ہو تو قرضہ جتنی رقم نکال کر باقی رقم یہ مرتھن راہن سے وصول کرے گا۔ اور اسی کے مثل حضرت قتادہؒ امام ابراہیم نخعیؒ اور سفیان ثوریؒ سے مصنف عبد الرزاق ج ۸ ص ۲۴۲ میں روایات ہیں۔ اور اس بارہ میں احناف کی ایک دلیل تو ابن ابی شیبہ ص ج کی روایت ہے جس میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس مرتہن سے فرمایا جس نے مرہونہ گھوڑا ضائع کر دیا تھا کہ اب تیرا حق ختم ہو گیا اور وہ آثار بھی دلیل ہیں جن میں ہے: الرهن بما فيه (دار قطنی ج ۳ ص ۳۲) اور شافعؒ کے نزدیک مرہونہ چیز مرتہن کے قبضہ میں امانت ہوتی ہے امانت سے فائدہ اٹھانا درست نہیں۔ اور اگر مرہونہ چیز مرتہن کے قبضہ میں ہلاک ہو جائے تو مرتہن پر کوئی تاوان نہیں بلکہ وہ مال راہن کا ضائع ہوگا اور مرتہن اپنا پورا قرضہ راہن سے وصول کرے گا۔ اور وہ اپنی دلیل میں پیش کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا يَغۡلَقُ الرَّهۡنُ لَهٗ غُنۡمُهٗ وَعَلَيۡهِ غُرۡمُهٗ (دار قطنی ج ۳ ص ۳۳ و مستدرک ج ۲ ص ۵۱) کہ رہن رکھ دینے سے راہن

کو اس فائدے سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ جو اس چیز سے حاصل ہو اور اسی کے اوپر اس کے نقصان کی ذمہ داری ہے۔

اس کا جواب صاحب ہدایہؒ یہ دیتے ہیں کہ اس سے مراد احتباس کلی ہے یعنی ملکیت راہن ہی کی رہتی ہے اور مرتہن کو ملک ید اور حبس حاصل ہوتی ہے یعنی قبضہ اور روک رکھنے کا حق اس کو ہوتا ہے اور فرماتے ہیں کہ صحابہ اور تابعین میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ مرہونہ چیز امانت ہوتی ہے بلکہ ان کے نزدیک وہ مضمون ہوتی ہے اگرچہ ضمان کی کیفیت کے بارہ میں ان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ (ہدایہ ص ۴۳۸ ج ۴)

کیا مرہونہ چیز سے مرتہن فائدہ اٹھا سکتا ہے؟

ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں کہ مرتہن مرہونہ چیز سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اور امام ترمذیؒ نے امام احمدؒ اور امام اسحاق بن راہویہؒ کا یہ نظریہ نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک مرتہن مرہونہ چیز سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مگر مبارکپوری صاحبؒ فرماتے ہیں کہ امام احمدؒ اور امام اسحاقؒ کے نزدیک صرف اسی قدر فائدہ اٹھانا جائز ہے جتنا مرتہن نے مرہونہ چیز پر خرچہ کیا ہے۔ اس سے زائد انتفاع ان کے نزدیک بھی درست نہیں ہے۔ (تحفۃ الاحوذی ص ۲۴۷ ج

۲) مولانا سہارنپوریؒ فرماتے ہیں کہ امام احمدؒ اور اسحاقؒ کے نزدیک صرف دودھ دینے والے مرہونہ جانور کا دودھ اور سواری کے قابل جانور کی سواری ان کے نفقہ کے بدلہ میں حاصل کر سکتا ہے۔ ان کے علاوہ کسی مرہونہ چیز سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ (بذل المجہود ج ۵ ص

۲۹۴) علامہ ابن رشد فرماتے ہیں وَالْجُمْهُوْرُ عَلٰى اَنْ لَيْسَ لِلْمُرْتَهِنِ اَنْ يَّنْتَفِعَ بِشَيْئٍ مِّنَ الرَّهْنِ (بدایۃ المجتہد ص ۲۷ ج ۲) کہ جمہور کا نظریہ یہ ہے کہ مرتہن مرہونہ چیز سے کچھ بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اور مولانا عبد الحئی لکھنوی فرماتے ہیں وَاعْلَمْ اَنَّ مَنَافِعَ الرَّهْنِ حَرَامٌ عَلٰى كُلِّ حَالٍ (حاشیہ شرح وقایہ ص ۴۷ ج ۴) کہ مرہونہ چیز سے ہر حال میں نفع اٹھانا حرام ہے۔

جو حضرات مرتہن کو مرہونہ چیز سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دیتے ہیں ان کی دلیل وہ روایت ہے جس میں آتا ہے اَلظَّهْرُ يُرْكَبُ بِنَفَقَتِهٖ اِذَا كَانَ مَرْهُوْنًا وَلَبَنُ الدَّرِّ يُشْرَبُ بِنَفَقَتِهٖ اِذَا كَانَ مَرْهُوْنًا (بخاری ج ۱ ص ۳۴۱۔ طحاوی ج ۲ ص ۲۰۹) مرہونہ سواری پر اس کے نفقہ کے بدلہ میں سواری کی جا سکتی ہے اور مرہونہ دودھ دینے والے جانور کا دودھ پیا جا سکتا ہے اور جو سواری کرتا ہے اور دودھ پیتا ہے اسی کے ذمہ اس کا نفقہ ہوگا۔

اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ اگر مرتہن کو مرہونہ چیز سے فائدہ اٹھانا درست قرار دیا جائے تو یہ اس اصول کے خلاف ہے کُلُّ قَرْضٍ جَرَّ نَفْعًا فَھُوَ رِبًا
ہر ایسا قرضہ جو نفع کو کھینچ لائے تو وہ سود ہوگا۔ اس لیے مانعین نے کہا کہ جن روایات سے مرتہن کو مرہونہ چیز سے فائدہ اٹھانے کا جواز ثابت ہو رہا ہے تو وہ روایات سود کا حکم آنے سے پہلے کی ہیں اور منسوخ ہیں جیسا کہ امام طحاویؒ نے ج ۲ ص ۲۰۹ میں فرمایا ہے۔ اور پھر یہ اس اصول کے بھی خلاف ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا يَحْلُبَنَّ اَحَدٌ مَاشِيَةَ اِمْرَءٍ بِغَيْرِ اِذْنِهٖ کہ مالک کی اجازت کے بغیر کسی جانور کا دودھ دوہنا جائز نہیں اور مرہونہ جانور کا مالک تو راہن ہے اس لیے اس کی اجازت کے بغیر اس جانور کا دودھ استعمال کرنا جائز نہ ہوگا۔

دوسرا جواب

قاضی شوکانی فرماتے ہیں کہ يُرْكَبُ اور يُشْرَبُ مجہول کے صیغے ہیں ان کا فاعل متعین نہیں ہے اور فاعل راہن بھی ہو سکتا ہے اور مرتہن بھی تو جب تک متعین نہ ہو جائے کہ فاعل مرتہن ہے تو اس وقت تک اس کو دلیل میں پیش کیسے کیا جا سکتا ہے۔ (نیل الاوطار ج ۵ ص ۲۴۸)

تیسرا جواب

جن روایات میں مرتہن کے لیے مرہونہ چیز سے فائدہ اٹھانا جائز ثابت ہو رہا ہے تو ان کو راہن کی اجازت پر محمول کریں گے اور صاحب ہدایہ" فرماتے ہیں کہ مالک کی اجازت کے ساتھ فائدہ اٹھانا درست ہے مگر اس پر اشکال یہ ہے کہ ایسی صورت میں تو مالک مجبوری سے اجازت دیتا ہے جیسا کہ وقت پر قرض نہ ادا کر سکنے والا مقروض قرض خواہ کو رقم میں اضافے کی اجازت دے دیتا ہے اس لیے آج کے دور میں اس اجازت کا اعتبار نہ ہوگا اور احتیاط اسی میں ہے کہ مالک کی اجازت کے ساتھ بھی مرہونہ چیز سے فائدہ نہ اٹھایا جائے۔

چوتھا جواب

امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ اگر راہن مرہونہ چیز کے اخراجات نہ برداشت کر سکے تو مرتہن کو اجازت دی جائے گی کہ اس مرہونہ چیز کا خرچہ برداشت کرے اور اس سے فائدہ اٹھاتا رہے اور اجازت والی روایات اسی صورت پر محمول ہیں۔

پانچواں جواب

علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ یُرْکَبُ الرَّهَنَ بِنَفَقَتِهِ والی روایت میں رہن کا شرعی معنی مراد نہیں بلکہ لغوی معنی مراد ہے یعنی مَنِيْحَة اور قاموس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ راہن بمعنی مانح مستعمل ہے (العرف الشذی ص ۳۹۶) اور مَنِيْحَه اس جانور کو کہتے ہیں جو عَارِيَةً کسی کو دے تاکہ وہ اس کا دودھ پیتا رہے اور اس پر سواری کرتا رہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي شِرَاءِ الْقِلَادَةِ وَفِيهَا ذَهَبٌ وَخَرَزٌ

(سونا اور موتی لگے ہوئے ہار کو بیچنے کا بیان)

احناف کا نظریہ

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جس چیز میں سونا یا چاندی جڑا ہوا ہو اس چیز کو سونے یا چاندی کے بدلہ میں بیچنا جائز ہے بشرطیکہ مقابلہ میں سونا یا چاندی اس مقدار سے زیادہ ہو جتنی مقدار اس چیز میں ہے تاکہ سونا سونے کے بدلہ میں یا چاندی چاندی کے بدلے اور زائد مقدار اس چیز کے بدلہ میں ہو جائے جو سونے یا چاندی کے علاوہ ہے۔ اور ایسی بیع جائز ہے خواہ اس چاندی یا سونے کو اس چیز سے جدا کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ اور بدلہ میں سونا یا چاندی زیادہ ہونے کی شرط اس لیے لگائی تاکہ ربا (سود) لازم نہ آئے۔ (العرف الشذی ص ۳۹۶)

امام مالکؒ کا نظریہ

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی چیز میں سونا یا چاندی تابع ہو تو بیع جائز ہے ورنہ نہیں اور تابع کی مقدار انہوں نے ایک تہائی بتائی ہے جیسا کہ امام نوویؒ نے شرح مسلم ص ۲۶ ج ۲ اور مبارکپوریؒ نے تحفۃ الاحوذی ص ۲۲۸ ج ۲ میں ذکر کیا ہے۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا نظریہ

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ جب تک اس چیز سے سونے یا چاندی کو جدا نہیں کر لیا جاتا اس وقت تک اس کی بیع سونے یا چاندی کے بدلہ میں جائز نہیں ہے خواہ قلیل ہو یا کثیر ہو جیسا کہ ان کا یہی نظریہ امام ترمذیؒ نے اسی باب کے تحت ذکر کیا ہے۔

احناف کی پہلی دلیل

وہ مطلق روایات ہیں جن میں اَلذَّھَبَ بِالذَّھَبِ (سونے کو سونے کے بدلے میں بیچنے) کی اجازت ہے خواہ وہ کسی دوسری چیز کے ساتھ جڑا ہوا ہو یا علیحدہ ہو۔

دوسری دلیل

علامہ سرخسیؒ نے حضرت حسن بصریؒ کی روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کَانُوْا یَتَبَایَعُوْنَ فِیْمَا بَیْنَھُم السَّیْفَ الْمَحَلّٰی یعنی صحابہ کرامؓ جس تلوار کے ساتھ سونا یا چاندی کا جڑاؤ ہوتا تھا آپس میں ان کی بیع کرتے تھے۔ تو جب صحابہؓ سے اس چاندی اور سونے کو جدا کیے بغیر بیع ثابت ہے تو یہ جواز کی دلیل ہے۔ (المبسوط ص ۱۰ ج ۱۴)

تیسری دلیل

علامہ ابراہیم بن محمد الیبجوریؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن پیالوں میں پانی پیا ان میں سے ایک پیالہ مُضَبَّب تھا اور وہ حضرت نضر بن انسؓ کی میراث میں نو لاکھ درہم کا فروخت ہوا اور فرماتے ہیں کہ اس پیالہ سے امام بخاریؒ کو بھی پینا نصیب ہوا۔ (المواہب اللدنیہ شرح شمائل ترمذی ص ۱۰۰) مضبب اس پیالے کو کہتے ہیں جس میں چاندی کا جڑاؤ ہو اگر چاندی کے جڑاؤ والی چیز سے چاندی جدا کیے بغیر مطلقاً بیع کی ممانعت ہوتی تو یہ پیالہ کیسے فروخت ہوا؟

چوتھی دلیل

علامہ ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ سیف محلی (سونے کے جڑاؤ والی تلوار) کو دراہم کے بدلے بیچنے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اور ایک روایت یہ نقل کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت علیؓ خطبہ ارشاد فرمار ہے تھے کہ ایک آدمی نے ان سے کہا کہ ہمارے علاقہ کے لوگ سود کھاتے ہیں تو حضرت علیؓ نے پوچھا کہ وہ کیسے؟ تو اس نے کہا کہ وہ ایسے جام بیچتے ہیں جن میں سونا یا چاندی کا جڑاؤ ہوتا ہے تو حضرت علیؓ نے تھوڑی دیر کے لیے سر جھکا لیا اور پھر سر اٹھا کر فرمایا کہ لَا بَأْسَ بِہٖ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (المحلی ص ۵۷۶ ج ۵)

امام شافعیؒ کی دلیل

یہ حضرات ترمذی ج ۱ ص ۲۳۸ وغیرہ کی اس روایت سے استدلال کرتے ہیں جس میں الفاظ ہیں لَا تُبَاعُ حَتّٰی تُفَصَّلَ کہ جب تک اس سونے یا چاندی کو جدا نہ کر دیا جائے اس وقت تک اس کو نہ بیچا جائے۔

اس کا پہلا جواب

احناف کہتے ہیں کہ اس روایت میں جس ہار کے بیچے جانے کا ذکر ہے وہ بارہ دینار کا خریدا گیا تھا جب کہ اس میں سونا اور خرز بارہ دینار وزن سے زیادہ تھا جیسا کہ ترمذی ج ۱ ص ۲۳۶ اور ابوداؤد ج ۲ ص ۱۲۰ کی روایت میں ہے اِشْتَرَيْتُ يَوْمَ خَيْبَرَ قِلَادَةً بِاِثْنَيْ عَشَرَ دِيْنَارًا فِيْهَا ذَهَبٌ وَ خَرَزٌ فَفَصَّلْتُهَا فَوَجَدْتُ فِيْهَا اَكْثَرَ مِنْ اِثْنَيْ عَشَرَ دِيْنَارًا کہ بارہ دینار کا ہار خریدا جس میں سونا اور موتی تھے تو جب ان کو جدا کیا تو وہ بارہ دینار سے زائد نکلے احناف کہتے ہیں کہ یہ صورت تو ہمارے نزدیک بھی جائز نہیں ہے۔

دوسرا جواب

امام طبرانیؒ نے اس روایت کو کئی سندوں سے نقل کیا ہے اور ان میں سے کسی روایت میں بارہ دینار کسی میں نو دینار اور کسی میں سات دینار کا ذکر ہے اسی طرح کسی روایت میں خَرَزٌ مُعَلَّقٌ بِذَهَبٍ (سونے سے جڑاؤ کیے ہوئے موتی) اور کسی میں ذَهَبٌ وَّخَرَزٌ (سونا اور موتی) کے الفاظ ہیں اور امام طبرانیؒ نے کہا کہ یہ حدیث مضطرب ہے۔ اس اضطراب کو امیر یمانیؒ نے بھی تسلیم کیا ہے مگر کہتے ہیں کہ اس اضطراب سے کوئی فرق نہیں پڑتا اسلیے کہ نَهْيٌ عَنْ بَيْعِ مَا لَمْ يُفَصَّلْ میں کوئی اختلاف نہیں اور نہ ہی اس حصہ میں اضطراب ہے (سبل السلام ص ۸۴۹)

امیر یمانیؒ کا یہ فرمانا کہ نَهْيٌ عَنْ بَيْعِ مَا لَمْ يُفَصَّلْ میں کوئی اختلاف نہیں' درست نہیں ہے اس لیے کہ اگر اتنی واضح نہی ہوتی تو حضرات صحابہ کرام ایسی بیع قطعاً" نہ کرتے حالانکہ ان سے ایسی بیع کرنا ثابت ہے جیسا کہ باحوالہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔

تیسرا جواب

احناف کہتے ہیں کہ اس روایت میں حَتّٰی تُفَصَّلَ سے مراد جدا کرنا نہیں بلکہ تمیز ہے اور ابوداؤد ج ۲ ص ۱۲۰ کی روایت میں حَتّٰی تُمَيِّزَ بَيْنَهُمَا اور جب علم نہ ہو بلکہ شک

ہو تو اس صورت میں اس کو جدا کیا جائے تاکہ معلوم ہو جائے اور اگر پہلے سے ہی بالیقین معلوم ہو جائے کہ مقابلہ میں سونا اور چاندی زیادہ ہے تو یہ جائز ہے تاکہ جواز والی روایات سے تعارض نہ ہو۔ اور بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ حضور علیہ السلام کا یہ فرمان وجوب کے لیے نہ تھا بلکہ ندب کے لیے تھا تب ہی صحابہؓ سے اس جیسی بیع کا ثبوت ملتا ہے۔ یعنی بہتر یہی ہے کہ ان کو جدا کر لیا جائے لیکن اگر جدا نہ بھی کیا جائے تو بیع پھر بھی ہو جائے گی۔

امام نوویؒ کا بے جا اعتراض

امام نوویؒ نے امام ابو حنیفہؒ پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے صریح حدیث کے مخالف قول کیا ہے۔ (شرح مسلم ص ۲۶ ج ۲)

اس کا جواب

علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ امام نوویؒ کا یہ کہنا درست نہیں ہے اس لیے کہ امام ابو حنیفہؒ نے حدیث کا ایسا مفہوم واضح کیا ہے جو زیادہ روشن ہے تو اس میں صریح حدیث کی خلاف ورزی کیسے لازم آتی ہے۔ (العرف الشذی ص ۳۹۶)

مسئلہ مدعجوہ

سونا یا چاندی اگر کسی دوسری چیز کے ساتھ جڑے ہوئے ہوں تو سونے والی چیز کو سونے اور چاندی والی چیز کو چاندی کے بدلے میں بیچنے کو مسئلہ مدعجوہ کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں اور مبارکپوریؒ صاحب لکھتے ہیں وَهٰذِهٖ هِيَ الْمَسْئَلَةُ الْمَشْهُوْرَةُ فِيْ كُتُبِ الشَّافِعِيِّ وَاَصْحَابِهٖ وَغَيْرِهٖ اَلْمَعْرُوْفَةُ بِمَسْئَلَةِ مُدِّ عَجْوَةٍ (تحفۃ الاحوذی ص ۲۴۸ ج ۲) اور یہ مسئلہ امام شافعیؒ اور دیگر شوافع وغیرہ کی کتب میں مشہور ہے جو مسئلہ مدعجوہ کے ساتھ معروف ہے

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ اِشْتِرَاطِ الْوَلَاءِ وَالزَّجْرِ عَنْ ذَالِكَ

غلام یا لونڈی بیچنے کے وقت بائع کا ان کی ولاء اپنے لیے شرط قرار دینے اور اس کی ممانعت کا بیان)

علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ اس بات میں اتفاق ہے کہ حق ولاء کو (بیع یا ہبہ) کے

ساتھ کسی دوسرے کی طرف منتقل کرنا درست نہیں ہے۔ اور جرِّ وَلَاء کا مسئلہ اس سے جدا ہے۔ (العرف الشذی ص ۲۹۶) یعنی ولاء اسی کی ہوگی جس نے آزاد کیا ہے اور یہ حق دوسرے کی طرف منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ جرِّ وَلَاء کا مطلب یہ ہے کہ ولاء ایک کی طرف جا رہی تھی اور کوئی صورت پیدا کر کے اس کو دوسری جانب منتقل کر دیا جائے جیسا کہ ایک آدمی کا غلام اور دوسرے آدمی کی لونڈی ہو اور غلام اور لونڈی کا آپس میں نکاح کر دیا جائے اور ان کی اولاد ہو پھر لونڈی کے مالک نے لونڈی کو آزاد کر دیا تو اس کی اولاد ماں کے تابع ہوگی جیسے ماں کی ولاء اس کو آزاد کرنے والے کو ملتی ہے اسی طرح اس کی اولاد کی ولاء بھی اس ماں کو آزاد کرنے والے کی ہوگی۔ لیکن اگر غلام کے مالک نے غلام کو آزاد کر دیا تو اب اولاد کی ولاء ماں کو آزاد کرنے والے کی بجائے ان کے باپ کو آزاد کرنے والے کی جانب منتقل ہو جائے گی اور اسی جیسی صورت کو جر ولاء کہتے ہیں۔

قَوْلُهُ اَنَّهَا اَرَادَتْ اَنْ تَشْتَرِیَ بَرِیْرَۃَ

بے شک حضرت عائشہؓ نے بریرہ کو خریدنے کا ارادہ فرمایا۔

حضرت عائشہؓ نے حضرت بریرہؓ کو خریدا تھا یا ان کا بدل کتابت ادا کیا تھا؟

بعض حضرات نے کہا ہے کہ حضرت بریرہؓ انصار میں سے کسی کی مکاتبہ تھیں اور بعض نے کہا کہ بنی ہلال قبیلہ کے کسی شخص کی مکاتبہ تھیں اور یہ آزاد ہونے سے پہلے حضرت عائشہؓ کی خدمت کیا کرتی تھیں۔ (تحفۃ الاحوذی ص ۲۴۸ ج ۲)

حضرت بریرہؓ کے مالک نے نو اوقیہ پر ان کو مکاتبہ کر دیا اور کہا کہ ہر سال ایک اوقیہ ادا کرنا جب انہوں نے چار اوقیہ ادا کر دیے تو آگے پانچویں قسط ادا کرنے سے عاجز آ گئیں۔ انہوں نے حضرت عائشہؓ سے ذکر کیا اور مدد چاہی تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میں یک مشت ساری رقم ادا کر دیتی ہوں جب ان کے مالک کو معلوم ہوا تو وہ کہنے لگا کہ ولاء ہماری ہوگی تب ہم بیچتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ کے یک مشت قیمت ادا کرنے کو خریدنا بھی کہا جا سکتا ہے اور اس کو بدل کتابت کی ادائیگی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اب اس روایت میں دو بحثیں ہیں ایک یہ کہ مکاتب کا بیچنا درست ہے یا نہیں اور دوسری بحث یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا وَاشْتَرِطِیَ لَهُمْ کہ تو بھی شرط لگا دے حالانکہ حضور علیہ السلام نے خود نَهٰی عَنْ بَیْعٍ وَ شَرْطٍ الخ کی بیع

سے منع فرمایا ہے جس میں شرط لگائی گئی ہو تو حضرت عائشہؓ سے کیوں فرمایا کہ تو بھی شرط لگا دے؟

مُکاتَب کی بیع سے متعلق بحث۔ امام ابو حنیفہؒ کا نظریہ

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مکاتب کی بیع درست نہیں ہے مگر اس وقت جبکہ مکاتب بدل کتابت کی ادائیگی سے عاجز آجائے اگر بدل کتابت سے عاجز آجائے تو کتابت کو فسخ قرار دیں گے اور پھر اس کی بیع جائز ہو گی (العرف الشذی ص ۳۹۶) اور اسی طرح کی ایک روایت امام شافعیؒ سے بھی ہے۔

ائمہ ثلاثہؒ کا نظریہ

امام مالکؒ، امام احمدؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مکاتب بے شک بدل کتابت کی ادائیگی پر قادر ہو تب بھی اس کی بیع درست ہے جبکہ وہ خود راضی ہو۔

اور بعض حضرات نے کہا کہ مکاتب کی بیع مطلقاً" درست ہے اس لیے کہ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے اَلْمُکَاتَبُ عَبْدٌ مَا بَقِیَ عَلَیْہِ دِرْھَمٌ مِنْ کِتَابَتِہٖ (ابو داؤد ج ۲ ص ۱۹۱)

یعنی اگر مکاتب کے ذمہ ایک درہم بھی باقی ہے تو وہ غلام ہی ہے جب وہ غلام ہے تو اس کی بیع جائز ہے۔

احناف کی دلیل

مکاتب کی بیع سے متعلق بحث میں صاحب ہدایہؒ فرماتے ہیں کہ جب کتابت جائز ہے تو اس کا لحاظ رکھتے ہوئے مالک کا قبضہ نہ رہا مگر اس کی ملکیت باقی رہتی ہے اور مکاتب بیع و شراء اور سفر وغیرہ تصرفات میں خود مختار ہو گا۔ (ہدایہ ص ۲۶۵ ج ۳) اور قاعدہ یہ ہے کہ اس چیز کی بیع درست ہوتی ہے جس کی ملکیت اور قبضہ دونوں ثابت ہوں اور جب قبضہ نہیں تو اس کی بیع بھی درست نہ ہوگی۔ اور حضرت بریرہؓ والی روایت میں مکاتبہ کی بیع نہیں ہے بلکہ اس کے ذمہ بدل کتابت کی صورت میں جو قرض تھا اس کی ادائیگی ہے یا پھر اس روایت کی توجیہ ہوگی کہ وہ بدل کتابت سے عاجز آگئی تھیں اسی لیے انہوں نے حضرت عائشہؓ سے درخواست کی تھی۔ اور کتابت کو فسخ کرنے کے بعد ان کی بیع ہوئی تھی جیسا کہ امام ابو داؤد نے ج ۲ ص ۱۹۲ میں باب ہی یوں قائم کیا ہے۔ بَابٌ فِیْ بَیْعِ الْمُکَاتَبِ اِذَا فُسِخَتِ الْمُکَاتَبَۃُ یعنی جب مکاتبت کو فسخ کر دیا جائے تو اس صورت میں مکاتب کی بیع کا بیان اور

اس کے تحت انہوں نے حضرت بریرہؓ والی روایت ذکر کی ہے۔

وَاشْتَرِطِیْ لَهُمُ الْوَلَاءَ سے متعلق بحث

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ تو ان کی شرط مان لے۔

اس پر دو اعتراض ہیں۔

پہلا اعتراض یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی بیع سے منع فرمایا ہے جس میں شرط لگائی گئی ہو اور یہاں فرمایا کہ تو شرط مان لے تو دونوں روایتوں میں تعارض ثابت ہوتا ہے اور دوسرا اعتراض یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو ان کی شرط مان لے مگر ولاء اس کی ہوگی جس نے آزاد کیا تو اس سے بظاہر ایک قسم کا دھوکہ معلوم ہوتا ہے۔

اس کا پہلا جواب

اسی روایت میں آگے فرمایا فَاِنَّمَا الْوَلَاءُ لِمَنْ اَعْتَقَ اور آگے ہے وَاِنْ کَانَ مِائَةَ شَرْطٍ (بخاری ج ۱ ص ۲۹۰) اور ایک روایت میں ہے لَا یَمْنَعُکَ ذَالِکَ فَاِنَّمَا الْوَلَاءُ لِمَنْ اَعْتَقَ (بخاری ج ۱ ص ۲۹۰۔ مسلم ج ۱ ص ۴۹۳۔ ابوداؤد ج ۲ ص ۴۸) کہ ان کا شرط لگانا تیرے حق کو نہیں روکتا اس لیے کہ ولاء اس کی ہوتی ہے جو آزاد کرتا ہے ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وَاشْتَرِطِیْ لَهُمُ الْوَلَاءَ میں شرط قبول کرنے کا حکم اپنی حقیقت پر نہیں بلکہ یہ بطور زجر تھا۔ اور یہ ایسے ہی ہے جیسے قرآن کریم میں ہے۔ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (سورۃ حم السجدہ آیت ۴۰) اس میں ہر قسم کے عمل کی اجازت نہیں بلکہ ایک قسم کا زجر ہے کہ جو چاہو کر لو' آنا ہمارے پاس ہی ہے۔ اسی طرح اس میں بھی زجر ہے کہ بے شک وہ شرط لگائیں اور تو ان کی شرط مان لے' ہوگا وہی جو شریعت کا قاعدہ ہے اور وہ یہ ہے کہ الولاء لمن اعتق کہ ولاء اسی کی ہوتی ہے جو آزاد کرتا ہے۔

اور امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ حکم حضرت عائشہؓ کے ساتھ خاص تھا اور یہ زجر میں مبالغہ کے لیے تھا اس لیے کہ وہ لوگ خلاف شرع شرط لگا رہے تھے اور یہ شرط قبول کرنا بظاہر تو خدع ہے مگر در حقیقت زجر ہے اس لیے تو آپ ﷺ نے اپنے خطبہ میں زجر فرمایا ہے۔ (شرح مسلم ج ۱ ص ۴۹۳)

دوسرا جواب

قاضی شوکانیؒ نیل الاوطار ج ۵ ص ۱۹۲ میں فرماتے ہیں کہ امام خطابی نے معالم السنن میں اپنی سند کے ساتھ یحییٰ بن اکثم سے نقل کیا ہے کہ انہوں وَاشْتَرِطِيَ لَهُمُ الْوَلَاءَ والی روایت کا انکار کیا ہے اور امام شافعیؒ نے کتاب الام میں اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے اس لیے کہ ان الفاظ کے نقل کرنے میں ہشام بن عروہ اکیلے ہیں یہ اگرچہ ثقہ ہیں مگر اکیلے ہونے کی وجہ سے ان کو مغالطہ ہو سکتا ہے۔

تیسرا جواب

امام طحاوی فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ حضور ﷺ نے یہ ارادہ کیا ہو کہ تو بھی ایسی شرط لگادے جو صحیح بیوع میں لگائی جاتی ہے۔ (طحاوی ج ۲ ص ۱۸۱) وَاشْتَرِطِيَ لَهُمْ میں لام علیٰ کے معنی میں ہوگا اور مطلب یہ ہے کہ تو بھی ان کے خلاف شرط لگادے کیونکہ حق تیرا ساتھ دے رہا ہے مگر امام نوویؒ نے اس جواب کو کمزور قرار دیا ہے۔

چوتھا جواب

علامہ ابن حزمؒ المحلی میں فرماتے ہیں کہ یہ حکم اس وقت تھا جبکہ ولاء کو دوسرے کی طرف منتقل کرنا جائز تھا بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ میں اس کو منسوخ کردیا مگر اس جواب کو اَلْوَلَاءُ لِمَنْ اَعْتَقَ کے الفاظ درست قرار نہیں دیتے۔

بَابٌ

(بیع فضولی کے متعلق بحث)

امام ترمذیؒ نے صرف باب کہا ہے آگے کوئی عنوان ذکر نہیں کیا مگر تحت الباب روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بیع فضولی کے متعلق بحث ہے۔ ایک آدمی کسی دوسرے کا نہ وکیل ہو اور نہ ہی اس نے اس کو اپنی جانب سے عقد کی اجازت دی ہو۔ اس کے باوجود اگر وہ اس کی جانب سے عقد (بیع وشراء ونکاح وغیرہ) کرتا ہے تو اس عقد کرنے والے کو فضولی کہتے ہیں۔

فضولی کے عقد کے بارے میں ائمہ کرام کے اقوال

مبارکپوریؒ صاحب نیل الاوطار کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بیع موقوف صحیح ہے اور شراء موقوف صحیح نہیں ہے اور امام مالک اور امام احمدؒ کے نزدیک بیع

موقوف اور شراء موقوف دونوں صحیح ہیں اور امام شافعیؒ کے دو قول ہیں قدیم قول کے مطابق وہ امام مالکؒ کے ساتھ ہیں اور جدید قول کے مطابق ان کے نزدیک بیع موقوف اور شراء دونوں باطل ہیں۔ (تحفۃ الاحوذی ص ۲۴۹ ج ۲) اور حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ بھی بیع فضولی کے جواز کی جانب مائل ہیں۔ (لامع الدراری ج ۶ ص ۱۳۸)
جس آدمی کو حقدار نے تصرف کی نہ اجازت دی ہو اور نہ ہی وکیل بنایا ہو تو ایسا آدمی اگر بیع و شراء و نکاح کے معاملہ میں اس حقدار کی جانب سے تصرف کرتا ہے تو یہ فضولی کا تصرف کہلاتا ہے امام شافعیؒ کے نزدیک فضولی کا تصرف باطل ہے اور احناف کے نزدیک فضولی کی بیع اور نکاح کرنا موقوف ہوتا ہے اگر حقدار اجازت دے دے تو صحیح ورنہ باطل ہے اور فضولی کی شراء درست نہیں ہے۔ اور امام مالک اور امام احمد کے نزدیک فضولی کی بیع و شراء دونوں موقوف ہیں اور اجازت کے ساتھ صحیح ہو جائیں گی۔

امیر یمانی لکھتے ہیں کہ اس بارہ میں پانچ اقوال ہیں پہلا قول یہ ہے کہ عقد موقوف صحیح ہے اور یہ سلف کی ایک جماعت کا نظریہ ہے دوسرا قول یہ ہے کہ عقد موقوف صحیح نہیں ہے اور یہ قول امام شافعیؒ کا ہے اور تیسرا قول یہ ہے کہ بیع موقوف جائز اور شراء جائز نہیں یہ قول امام ابو حنیفہؒ کا ہے۔ اور چوتھا قول یہ ہے کہ بیع موقوف درست نہیں اور شراء درست ہے اس صورت میں ان کا نظریہ امام ابو حنیفہؒ کے بالکل برعکس ہے اور پانچواں قول یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی چیز خریدنے کا وکیل ہو اور خرید لے تو اس کے بعد فضولی کی حیثیت سے اس کی بیع و شراء درست ہے اور یہ نظریہ امام جصاص کا ہے۔ (سبل السلام ص ۸۳۳ ج ۳)

امام ابو حنیفہؒ کی دلیل

علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ بیع کے معاملہ میں ہماری دلیل یہی حضرت حکیم بن حزامؓ کی روایت ہے (جو ترمذی ص ۲۳۸ ج ۱ اور ابوداؤد ج ۲ ص ۱۲۴ وغیرہ میں آتی ہے) اور نکاح کے معاملہ میں وہ روایت دلیل ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک عورت آئی اور کہا کہ میرے باپ نے میرا نکاح کر دیا ہے اور مجھ سے اجازت نہیں لی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اختیار دیا تو وہ کہنے لگی کہ میرے باپ نے جو میرا نکاح کیا ہے' میں اس پر راضی ہوں۔ اگر وہ عورت ثیبہ تھی تو شوافع کے نزدیک اس کی اجازت کے بغیر نکاح درست ہی نہیں اور اگر باکرہ تھی تو اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ کو اس پر ولایت اجبار یعنی جبر کرنے کا حق نہ تھا (حالانکہ شوافع تو اس کے قائل ہیں) (العرف الشذی ص

۳۹۶) مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک فضولی کی بیع درست ہے اور شراء درست نہیں اور اس پر احناف دلیل یہ دیتے ہیں کہ مالک کی ملکیت سے کسی چیز کو نکالنے کے لیے اس کی اجازت کی ضرورت ہے اور کسی چیز کو اس کی ملکیت میں داخل کرنے میں اجازت کی ضرورت نہیں مگر اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ بیع کی صورت میں بھی تو مالک کی ملکیت سے ثمن نکالنے کی ضرورت ہوتی ہے (اس لیے یہ وجہ کوئی وزنی نہیں ہے) (تحفۃ الاحوذی ص ۲۴۹ ج ۲) اگر اس توجیہ کی بجائے یہ توجیہ کی جائے تو زیادہ بہتر ہے کہ امام صاحب کے نزدیک جو حکم قیاس کے خلاف ثابت ہو اس کو وہ اپنے مورد پر بند رکھتے ہیں جیسا کہ قہقہہ فی الصلوۃ کے مسئلہ میں رکوع اور سجود والی نماز میں قہقہہ کی وجہ سے وضو کے ٹوٹنے کا حکم مانتے ہیں نماز جنازہ میں یہ حکم نہیں مانتے تو اسی طرح یہاں بھی حکم کو اپنے مورد پر بند رکھتے ہوئے حکم مانتے ہیں کہ حضرت حکیم بن حزامؓ شراء کے معاملہ میں تو وکیل تھے اور بیع کے معاملہ میں فضولی تھے اور یہ حکم خلاف القیاس ہے اس لیے کہ بیع میں بائع اور مشتری کا ایجاب و قبول ضروری ہے اور جو بکری وہ خرید کر لائے تھے اس کے بیچنے کے وقت نہ تو حضور علیہ السلام وہاں موجود تھے اور نہ ہی ان کو اس وقت آپ کی جانب سے اجازت تھی مگر جب آ کر انہوں نے قصہ سنایا تو آپ نے اس بیع کو رد کرنے کا حکم نہیں فرمایا جو آپ کی جانب سے رضا پر دلالت کرتا ہے تو فضولی کی بیع درست ہوئی اور شراء کے بارہ میں چونکہ کوئی صراحت نہیں اس لیے اس میں حکم کو ثابت نہیں کریں گے۔

اعتراض

اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ جب حضرت حکیم بن حزامؓ نے پہلی مرتبہ بکری خریدی تو وکالت پوری ہو گئی پھر اس کا بیچنا اور خریدنا دونوں فعل فضولی کی حیثیت سے کیے۔

جواب

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت حکیم بن حزامؓ حضور علیہ السلام کی جانب سے صرف بکری خریدنے کے وکیل نہ تھے بلکہ خرید کر لانے کے وکیل تھے تاکہ آپ اس کی قربانی کریں۔ جب پہلی دفعہ انہوں نے بکری خریدی تو یہی سمجھ کر خریدی کہ اس کو حضور علیہ السلام کے پاس لے جاؤں گا مگر راستہ میں اس کو بیچنے کا معاملہ ہو گیا تو دوبارہ اسی وکالت کی وجہ سے خریدا کہ خرید کر حضور علیہ السلام کے پاس لے جاؤں گا تو دونوں دفعہ خریدنا وکیل

کی حیثیت سے تھا اور بیچنا فضولی کی حیثیت سے تھا۔

اعتراض

احناف پر اعتراض ہوتا ہے کہ اگر یہ بیع درست تھی تو آنحضرت ﷺ نے اس دینار کا صدقہ کیوں کر دیا تھا جو حضرت حکیم بن حزامؓ نفع حاصل کر کے لائے تھے۔

اس کا جواب

حضور علیہ السلام نے حضرت حکیم بن حزامؓ کو ایک دینار دے کر بھیجا تھا کہ بکری خرید کر لائیں تو انہوں نے جا کر بکری خریدی جب آ رہے تھے تو راستہ میں ایک آدمی نے ان سے وہ بکری دو دینار کی خرید لی۔ اور حضرت حکیم بن حزامؓ دوبارہ وہاں گئے جہاں سے بکری خریدی تھی اور ایک دینار کی بکری خریدی اور حضور علیہ السلام کے پاس آ کر بکری اور ایک دینار پیش کر دیا جب حضور علیہ السلام نے دریافت فرمایا تو انہوں نے واقعہ سنایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس دینار کا صدقہ کر دے۔ یہ صدقہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ نے اس بیع کو جائز قرار دے دیا تھا ورنہ حرام مال کا صدقہ تو نہیں ہوتا۔ اور اس دینار کے صدقہ کرنے کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے جیسا کہ الکوکب الدری ص ۳۶۸ میں ہے کہ فقیر آدمی جب قربانی کا جانور خریدتا ہے تو اس کی قربانی اس جانور کے ساتھ متعین ہو جاتی ہے تو وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا نہ اس کا دودھ پی سکتا ہے اور نہ ہی اس کی اون سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اگر ایسا کرے گا تو جتنا فائدہ اٹھایا ہے اس کی قیمت اس پر واجب ہو گی اور حضور علیہ السلام بھی فقیر تھے اس لیے کہ آپ نے تو کبھی مال جمع کیا ہی نہیں کہ آپ کو صاحب نصاب شمار کیا جائے تو جب پہلی بکری حضرت حکیم بن حزامؓ نے خریدی تو اس کے ساتھ قربانی متعین ہو گئی اور اس کے ذریعہ سے جو نفع ہوا اس کا تصدق ضروری تھا اس لیے آپ نے اس دینار کا صدقہ فرمایا۔

اعتراض

مسئلہ یہ ہے کہ فقیر آدمی نے جب قربانی کے لیے جانور خریدا تو وہ اس جانور کو بدل نہیں سکتا بلکہ اسی جانور کی قربانی اس کو کرنا ہوتی ہے اور مذکورہ واقعہ میں تو جانور کا بدلنا ثابت ہوتا ہے۔

اس کا جواب

اس کا جواب بھی حضرت گنگوہیؒ ہی دیتے ہیں کہ حضور علیہ السلام اگرچہ فقیر تھے مگر آپ پر قربانی واجب تھی اور جس پر قربانی شریعت کی جانب سے واجب ہو اس پر قربانی ہوتی ہے جانور کا تعین نہیں ہوتا اس لیے وہ اگر جانور بدلنا چاہے تو بدل سکتا ہے اس لحاظ سے جب وہ جانور بدلا گیا تو کوئی اعتراض کی بات نہیں۔ (الکوکب الدری ص ۳۶۸)

بَابَ مَا جَاءَ فِي الْمُكَاتَبِ اِذَا كَانَ عِنْدَهُ مَا يُؤَدِّيَ

(جس مکاتب کے پاس بدل کتابت کی ادائیگی جتنی مالیت ہو' اس کا حکم)

اس میں دو بحثیں ہیں۔

البحث الاول

جمہور صحابہ کرامؓ اور ائمہ اربعہ فرماتے ہیں کہ اگر مکاتب کے ذمہ بدل کتابت کا ایک درہم بھی ہو تو وہ احکامات میں غلام ہی ہوگا البتہ مالک اس کو نہ بیچ سکتا ہے اور نہ کسی کو ہبہ کر سکتا ہے امام محمدؒ فرماتے ہیں وَبِهٰذَا نَأْخُذُ وَهُوَ قَوْلُ اَبِيْ حَنِيْفَةَ وَهُوَ بِمَنْزِلَةِ الْعَبْدِ فِيْ شَهَادَتِهٖ وَحُدُوْدِهٖ وَجَمِيْعِ اَمْرِهٖ اِلَّا اَنَّهٗ لَا سَبِيْلَ لِمَوْلَاهُ مَا دَامَ كَاتَبًا (موطا امام محمد ص ۳۶۵) یعنی ہمارا اور امام ابو حنیفہ کا یہی نظریہ ہے کہ مکاتب گواہی اور حدود اور دیگر معاملات میں غلام کی طرح ہی ہوتا ہے البتہ جب تک وہ مکاتب ہے مولیٰ کو اس پر (بیچنے یا ہبہ کرنے کا) اختیار نہیں ہوتا۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب مالک نے اپنے غلام کو مکاتب کیا تو مکاتب کرنے کے ساتھ ہی وہ غلام آزاد ہو جاتا ہے اور جو رقم اس کے ذمہ ہوتی ہے وہ اس پر قرض ہوتا ہے۔

امام ابراہیم نخعیؒ کا نظریہ

امام ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں کہ مکاتب نے بدل کتابت کا جتنا حصہ ادا کیا ہو اتنا حصہ اس کا آزاد ہو جاتا ہے اور اسی کے مطابق اس پر احکامات جاری ہوں گے۔ اور حضرت گنگوہیؒ اس کی مثال یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے اپنے غلام کو مکاتب کیا اور اس غلام نے بدل کتابت کا نصف حصہ ادا کیا تو اس کا نصف آزاد اور نصف غلام ہو گا۔ اگر یہ غلام زنا کا ارتکاب کرے تو اس کو پچاس درے آزاد حصہ کی جانب سے اور پچیس درے

غلام کی جانب سے لگیں گے اور اسی طرح میراث وغیرہ میں معاملہ ہو گا (الکوکب الدری ص ۳۶۹) آزاد آدمی جبکہ محصن نہ ہو تو جب وہ زنا کا ارتکاب کرے تو اس کو سو کوڑے مارے جاتے ہیں اور جب غلام ہو تو اس کو پچاس کوڑے مارے جاتے ہیں تو جب اس کا نصف آزاد اور نصف حصہ غلام ہے تو اس کو پچھتر کوڑے مارے جائیں گے اسی طرح اگر اس نے بدل کتابت کا نصف ادا کر دیا ہو اور وُہ کسی مرنے والے کا شرعی وارث بنتا ہو تو اس کو نصف میراث اس کے آزاد حصہ کی جانب سے ملے گی اور نصف حصہ اس کا غلام ہے اس حصہ کی جانب سے وہ محروم رہے گا۔

امام نخعیؒ کی دلیل

امام ترمذیؒ نے اس باب میں جو حضرت ابن عباسؓ کی روایت بیان کی ہے وہ امام نخعیؒ کی دلیل بنتی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں اِذَا اَصَابَ الْمُکَاتَبُ حَدًّا اَوْ مِیْرَاثًا وَرِثَ بِحِسَابِ مَا عَتِقَ مِنْہُ کہ جب مکاتب نے کسی ایسے فعل کا ارتکاب کیا جس پر حد جاری ہوتی ہے یا اس کو کسی مرنے والے سے وراثت ملتی ہو تو اس کے آزاد کردہ حصہ کا حساب رکھا جائے گا۔

اس کا جواب

مبارکپوری صاحبؒ جمہور کی جانب سے اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ قاضی عیاضؒ نے فرمایا ہے کہ اس روایت پر جرح موجود ہے اور پھر یہ بات بھی ہے کہ یہ روایت حضرت عمرو بن شعیب سے مروی دونوں روایتوں کے ساتھ متعارض ہے (تحفۃ الاحوذی ص ۲۵۰ ج ۲)

ائمہ اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ کتابت متجزی نہیں ہے اگر مالک نے غلام کے کسی حصہ کو مکاتب کیا تو کل غلام مکاتب ہوگا۔ البتہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک عتق مُتجزی ہے جبکہ شوافع کے نزدیک عتق بھی متجزی نہیں ہے یعنی اگر مالک نے اپنے غلام کا نصف یا چوتھا حصہ آزاد کیا ہے تو امام صاحبؒ کے نزدیک جتنا حصہ اس نے آزاد کیا اتنا ہی آزاد ہو گا اور باقی حصہ آزاد نہیں ہو گا اور امام شافعی کے نزدیک اس صورت میں غلام مکمل آزاد ہو جائیگا اس لیے کہ ان کے نزدیک عِتق مُتجزیٰ نہیں ہے۔

جب ائمہ اربعہؒ کے نزدیک کتابت متجزی نہیں تو کتابت کی مقررہ کردہ مکمل رقم ادا

کرنے کے ساتھ ہی وہ آزاد ہو گا یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کا کچھ حصہ آزاد ہو جائے اور کچھ حصہ غلام رہے۔

جمہور کی دلیل

جمہور صحابہؓ اور ائمہ اربعہ کی دلیل حضرت عمرو بن شعیبؒ کی روایت ہے جس میں یہ الفاظ ہیں مَنْ كَاتَبَ عَبْدَهٗ عَلٰى مِائَةِ اُوْقِيَةٍ فَاَدَّاهَا اِلَّا عَشَرَةَ اَوَاقٍ اَوْ قَالَ عَشَرَةَ الدَّرَاهِمَ ثُمَّ عَجَزَ فَهُوَ رَقِيْقٌ (ترمذی ج ۱ ص ۲۳۹) جس نے اپنے غلام کو سو اوقیہ کے بدلے مکاتب کیا پھر اس نے دس اوقیہ کم یا فرمایا کہ دس دراھم کم ساری رقم ادا کر دی پھر ادائیگی سے عاجز آگیا تو وہ غلام ہی ہو گا۔

البحث الثانی

عورت اگر غلام کی مالکہ ہو تو کیا اس غلام سے اس مالکہ کو پردہ کرنا ضروری ہے یا نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ غلام اپنی مالکہ کے حق میں اجنبی کی طرح ہے اس لیے اس سے مالکہ کو پردہ کرنا ہو گا مگر غلام گھر میں چونکہ کام کاج کے لیے بکثرت گھر میں آتا جاتا ہے اس وجہ سے پردہ میں زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں تاکہ تکلیف مَالَا يُطَاقُ اور حرج نہ ہو۔ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ غلام اپنی مالکہ کے حق میں محرم کی طرح ہے تو جیسے محرم اپنی محرمات (ماں بیٹی بہن وغیرہ) کے جسم کے جن اعضاء کو دیکھ سکتا ہے اسی طرح غلام بھی اپنی مالکہ کے ان اعضاء کو دیکھ سکتا ہے۔

امام شافعیؒ کی دلیل

امام شافعیؒ کی جانب سے دلیل دی گئی ہے کہ قرآن کریم (سورۃ النور آیت نمبر ۳۱) میں ہے اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اور اس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے جس میں عورت کے لیے محرم بیان کیے گئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام اپنی مالکہ کے لیے محرم کی طرح ہے۔

اس کا جواب

مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ فرماتے ہیں کہ سعید بن المسیبؒ، حسن بصریؒ اور حضرت سمرۃ بن جندبؓ نے فرمایا لَا تَغُرَّنَّكُمْ سُوْرَةُ النُّوْرِ فَاِنَّهَا فِي الْاِنَاثِ دُوْنَ الذُّكُوْرِ (بذل

المجود ص ۱۷ ج ۵) کہ سورۃ النور میں مَامَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ کے الفاظ سے مغالطہ نہ کھانا اس لیے کہ وہ غلاموں سے متعلق نہیں بلکہ لونڈیوں سے متعلق ہے۔

قَوْلُهٗ فَلْتَحْتَجِبْ مِنْهُ

امام شافعیؒ کے نزدیک چونکہ اپنے غلام سے مالکہ کا پردہ نہیں اس لیے وہ فَلْتَحْتَجِبْ میں امر کو استحباب پر محمول کرتے ہیں اور احناف کہتے ہیں کہ پردہ تو پہلے بھی تھا مگر اب زیادہ احتیاط کرے اس لیے کہ اس کے پاس اب اتنا مال ہو گیا ہے کہ وہ بدل کتابت ادا کر کے آزادی حاصل کر سکتا ہے۔

بَابُ مَا جَآءَ اِذَا اَفْلَسَ لِلرَّجُلِ غَرِيْمٌ فَيَجِدُ عِنْدَهٗ مَتَاعَهٗ

(جس کو دیوالیہ قرار دیا گیا' اس کے پاس کوئی آدمی اپنا سامان بعینہ پائے تو وہ کیا کرے؟)

افلاس کا لغوی و اصطلاحی معنیٰ

مبارکپوری صاحبؒ تحفۃ الاحوذی ص ۲۵۰ ج ۲ میں اَلنِّهَايَة کے حوالہ سے اور علامہ ابن حجر فتح الباری ج ۵ ص ۴۵۹ میں لکھتے ہیں اور الفاظ فتح الباری کے نقل کیے جا رہے ہیں۔

اَلْمُفْلِسُ شَرْعًا مَنْ تَزِيْدُ دُيُوْنُهٗ عَلٰى مَوْجُوْدِهٖ سُمِّيَ مُفْلِسًا لِاَنَّهٗ صَارَ ذَا فُلُوْسٍ بَعْدَ اَنْ كَانَ ذَا دَرَاهِمَ وَدَنَانِيْرَ اِشَارَةً اَنَّهٗ صَارَ لَا يَمْلِكُ اِلَّا اَدْنَى الْاَمْوَالِ وَهِيَ الْفُلُوْسُ اَوْ سُمِّيَ بِذٰلِكَ لِاَنَّهٗ يُمْنَعُ التَّصَرُّفَ فِي الشَّيْئِ اِلَّا الشَّيْئِ التَّافِهِ كَالْفُلُوْسِ لِاَنَّهُمْ مَا كَانُوْا يَتَعَامَلُوْنَ بِهَا اِلَّا فِي الْاَشْيَاءِ الْحَقِيْرَةِ اَوْ لِاَنَّهٗ صَارَ اِلٰى حَالَةٍ لَا يَمْلِكُ فِيْهَا فُلْسًا ۔ فَعَلٰى هٰذَا فَالْهَمْزَةُ فِيْ اَفْلَسَ لِلسَّلْبِ

شرعی طور پر مفلس اس کو کہتے ہیں کہ جس کا قرضہ اس کے پاس موجود مال سے زیادہ ہو۔ اس کو مفلس اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے دراہم اور دنانیر والا تھا اب اس حالت سے گر کر فلوس (پیسوں) والا ہو گیا ہے۔ یہ اس بات کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ وہ صرف ادنیٰ مال یعنی فلوس کا مالک ہے یا اس کا مفلس اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کو فلوس جیسی معمولی شے میں تصرف کے علاوہ باقی اشیاء میں تصرف سے روک دیا جاتا ہے اس لیے کہ وہ فلوس کا

لین دین صرف معمولی اشیاء میں ہی کرتے تھے یا اس لیے مفلس کہا جاتا ہے کہ وہ ایسی حالت کی جانب لوٹ گیا ہے کہ ایک پیسے کا مالک بھی نہیں رہا اس صورت میں اَفْلَسَ کے اندر ہمزہ سلب کا ہوگا۔

اور مولانا محمد زکریا صاحب فرماتے ہیں اَلْمُفْلِسُ لُغَةً مَنْ لَا عَيْنَ لَهٗ وَلَا عَرَضَ کہ لغت کے لحاظ سے مفلس اس کو کہتے ہیں جس کے پاس نہ نقدی ہو اور نہ سامان ہو۔ وَشَرْعًا مَنْ قَصَرَ مَا بِيَدِهٖ عَمَّا عَلَيْهِ مِنَ الدُّيُوْنِ اور شرعاً اس کو کہتے ہیں کہ اس کے ذمہ جتنا قرض ہے وہ زیادہ ہو اور اس کے پاس جتنی مالیت ہے اس سے اس کے قرضہ کی ادائیگی نہ ہو سکے۔ (اوجز المسالک ص ۳۴۷ ج ۱۱)

تَفْلِيْس کا حکم

علامہ ابن نجیمؒ البحر الرائق ص ۲۵۰ ج ۶ میں اور علامہ ابن الہمامؒ فتح القدیر ص ۳۴۹ ج ۵ میں اور صاحب ہدایہؒ ص ۳۴۴ ج ۳ میں فرماتے ہیں کہ اگر قاضی کسی شخص کے بارہ میں فیصلہ کر دے کہ یہ مفلس (کنگال ' دیوالیہ) ہو چکا ہے تو صاحبین کے نزدیک یہ حکم ثابت ہو جائے گا اور امام صاحبؒ کے نزدیک یہ حکم ثابت نہیں ہوگا اس لیے کہ مال آنے جانے والی چیز ہے ہو سکتا ہے کہ اب اس کے پاس مال نہ ہو اور بعد میں اس کو وافر مقدار میں مال حاصل ہو جائے اس لیے اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے)

مفلس کے بارے میں ائمہ کرام کے نظریات

قَوْلُهٗ اَيُّمَا امْرِءٍ اُفْلِسَ وَوَجَدَ رَجُلٌ سِلْعَتَهٗ عِنْدَهٗ بِعَيْنِهَا فَهُوَ اَوْلٰى بِهَا مِنْ غَيْرِهٖ اگر ایک آدمی نے کوئی چیز بیچی اور زید نے خرید لی مگر اس کا ثمن ادا نہیں کیا اور زید نے دوسرے لوگوں کا قرضہ بھی دینا ہو اور پھر قاضی یا حاکم نے زید کو مفلس قرار دے دیا اور وہ چیز زید کے قبضہ میں ہو تو کیا وہ آدمی جس نے چیز بیچی ہے وہ اس چیز کو اکیلا لے لے یا وہ باقی قرض خواہوں کے ساتھ اس چیز میں شریک ہوگا۔ علامہ ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ ' امام ابراہیم النخعی ' امام حسن بصری ' امام شعبی ' ابن شبرمہ ' امام وکیعؒ اور اہل کوفہ کے نزدیک وہ آدمی باقی قرض خواہوں کے ساتھ برابر ہوگا خواہ زید مرجائے یا اس پر تَفْلِيْس کا حکم جاری کیا گیا ہو۔ اور یہی قول ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا۔ (قرض خواہوں کے ساتھ برابر ہوگا کا مطلب یہ ہے کہ وہ اکیلا حق دار نہیں ہے بلکہ باقی قرض خواہوں کا بھی اس میں

حق ہوگا اور جس طرح وراثت ہر ایک وارث کے حصہ کے مطابق تقسیم کی جاتی ہے اسی طرح یہ چیز قرض کے تناسب سے سب قرض خواہوں میں تقسیم ہوگی) اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر مفلس زندہ ہو تو جس نے اس کے ہاتھ کوئی چیز بیچی ہو اور وہ چیز موجود ہو تو وہ اس کا حقدار ہے اور اگر مفلس مرگیا تو یہ شخص باقی لوگوں کے ساتھ اس چیز میں برابر ہوگا۔ اور یہی نظریہ ہے امام احمدؒ کا۔ اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ خواہ مفلس زندہ ہو یا مرگیا ہو ہر حال میں یہ آدمی اس چیز کا حقدار ہے دوسرے قرض خواہ اس چیز میں اس کے ساتھ شریک نہ ہوں گے۔ (اعلاء السنن ص ۳۸۶ ج ۱۴) اور ائمہ کرام کے یہی نظریات علامہ ابن حزمؒ نے المحلی ص ۲۰۵ ج ۵ میں اور مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے اوجز المسالک ص ۳۴۹ ج ۱۱ میں اور قاضی شوکانی نے نیل الاوطار ج ۵ ص ۲۵۷، ۲۵۸ میں بیان کیے ہیں اور مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ کا نظریہ یہ ہے کہ اگر مشتری نے کوئی چیز خریدی اور ثمن کا کچھ حصہ ادا کر دیا پھر وہ مفلس ہوگیا تو باقی قرض خواہوں کے ساتھ شریک ہوگا اور اگر ثمن کا کچھ حصہ بھی ادا نہیں کیا تو اس چیز کا بائع حق دار ہوگا (بذل المجهود ج ۵ ص ۲۹۳)

شوافع حضرات کی پہلی دلیل

ترمذی ج ۱ ص ۲۳۹، ابوداؤد ج ۲ ص ۱۴۰، بخاری ج ۱ ص ۳۲۳ وغیرہ میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس آدمی کو مفلس قرار دے دیا گیا اور کوئی آدمی اپنا سود ابعینہ اس کے پاس پاتا ہے تو دوسروں کی بہ نسبت وہ اس سامان کا زیادہ حق رکھتا ہے اور شوافع کے نزدیک خواہ بائع مفلس ہو کر زندہ یا مرگیا ہو، تو دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اور ابو داؤد ج ۲ ص ۱۴۱ کی جن روایات میں وَاِنْ مَاتَ الْمُشْتَرِیْ فَصَاحِبُ الْمَتَاعِ اُسْوَۃٌ لِلْغُرَمَاءِ کے الفاظ ہیں، اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ روایت مرسل ہے۔

اس کا پہلا جواب

علامہ عینیؒ عمدۃ القاری ص ۲۴۰ ج ۱۲ میں، طحاوی کے حوالہ سے اور علامہ ظفر احمد عثمانی اعلاء السنن ص ۳۸۵ ج ۱۴ میں فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ مال ہے جو غصب یا عاریت یا ودیعت یا رہن کی صورت میں اس کے پاس ہو یا سودا مکمل نہ ہوا ہو بلکہ سوم شراء کی حالت میں اس کے قبضہ میں ہو جیسا کہ مسلم ج ۲ ص ۱۷ کی روایت میں ہے وَلَمْ یُفَرِّقْہُ

اس سے بیع کی صورت میں مبیعہ مراد نہیں ہے اس لیے کہ اس روایت میں بیع کے الفاظ نہیں ہیں اور جن روایات میں بیع کے الفاظ ہیں مثلاً ابوداؤد ج ۲ ص ۱۴۰ ان میں بھی شوافع حضرات کے لیے دلیل نہیں بن سکتی اس لیے کہ روایات میں الفاظ ہیں فَوَجَدَ مَتَاعَهٗ بِعَيْنِهٖ ۔ بِعَيْنِهٖ اس مال کو پالیا ہو اور بیع مکمل ہو جانے کے بعد اس مال کی حیثیت بعینہ نہیں رہتی بلکہ بدل جاتی ہے اس لیے کہ وہ پہلے بائع کی ضمان میں تھی اور اب وہ مشتری کی ضمان میں منتقل ہو چکی ہے اور ایک سے دوسرے کی جانب منتقل ہونے کی وجہ سے وہ چیز بعینہ نہیں رہتی جیسا کہ حضرت بریرہؓ کو صدقہ کا گوشت دیا گیا انہوں نے پکایا اور حضور علیہ السلام کو پیش نہ کیا۔ جب آپؐ نے اس بارے میں پوچھا تو حضرت بریرہؓ نے عذر پیش کیا کہ یہ صدقہ کا گوشت ہے۔ اس لیے کہ آپ تو صدقہ نہ کھاتے تھے تو آپ نے فرمایا لَكِ صَدَقَةٌ وَلَنَا هَدِيَّةٌ وہ گوشت تیرے لیے صدقہ ہے اور جب تو ہمیں دے گی تو وہ ہمارے لیے ہدیہ ہوگا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ایک سے دوسرے کی جانب منتقل ہونے کی صورت میں وہ چیز بعینہ نہیں رہتی اس لیے ان روایات میں بیع سے مراد ایسی بیع لیں گے جن میں بائع کی ملکیت باقی رہتی ہے مثلاً مقبوض علی سوم الشراء (یعنی مشتری نے سودا طے کرنے کے لیے اس پر قبضہ کیا ہو) یا بیع الخیار (یعنی ایسی بیع جس میں خیار رکھا گیا ہو) ایسی صورت میں ان روایات پر بھی عمل ہو جاتا ہے اور اصول موضوعہ کو چھوڑنا بھی لازم نہیں آتا۔ اور اس روایت میں مال کو ودیعت وغیرہ پر محمول کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حضرت سمرہؓ سے روایت ہے کہ بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَنْ سُرِقَ لَهٗ مَالٌ اَوْ ضَاعَ لَهٗ مَتَاعٌ فَوَجَدَهٗ بِيَدِ رَجُلٍ بِعَيْنِهٖ فَهُوَ اَحَقُّ بِهٖ وَيَرْجِعُ الْمُشْتَرِيْ عَلَى الْبَائِعِ بِالثَّمَنِ (مسند احمد ج ۵ ص ۱۳) کہ جس آدمی کا مال چوری ہو جائے یا گم ہوجائے اور اس نے کسی کے ہاں بعینہ اس مال کو پالیا تو وہ اس کا حق دار ہے (اس لیے کہ اس کی ملکیت اس سے ساقط نہیں ہوتی) اور اگر جس کے ہاں سے مال ملا ہے اس نے کسی سے وہ مال خریدا ہو تو وہ بائع سے اپنا ثمن واپس لے۔ اور یہ روایت طبرانی ج ۷ ص ۳۰۸ میں یوں ہے۔ عَنْ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَاْمُرُنَا اَنَّهٗ مَنْ ضَلَّ لَهٗ مَالٌ اَوْ اُسْتُرِقَ فَعَرَفَهٗ وَجَاءَ عَلَيْهِ بِبَيِّنَةٍ فَاِنَّ مَالَهٗ يُؤَدّٰى اِلَيْهِ وَاِنَّ الَّذِيْ ابْتَاعَهٗ يَتْبَعُ ثَمَنَهٗ عِنْدَ بَيِّعِهِ الَّذِيْ ابْتَاعَ مِنْهُ یعنی جس آدمی کا مال گم ہوا یا چوری ہوا اور اس نے کسی کے پاس اپنا مال پہچان لیا اور ثبوت پیش کر دیا تو مال اس کو ادا کیا جائے گا اور یہ آدمی اپنا ثمن اس سے واپس لے گا

جس سے خریدا ہے۔ اور شوافع حضرات بعینہ سے مراد یہ لیتے ہیں کہ وہ چیز ضائع نہ ہوئی بلکہ موجود ہو۔

اعتراض

بعض حضرات نے اس روایت پر جس میں مَنْ سُرِقَ لَہٗ مَتَاعٌ کے الفاظ ہیں اعتراض کیا ہے کہ اس میں ایک راوی حجاج بن ارطاۃ ہے اور اس پر جرح کی گئی ہے۔

پہلا جواب

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ اگرچہ بعض حضرات نے اس پر جرح کی ہے مگر امام ابو زرعہؒ، امام ابن حبانؒ، امام عجلیؒ اور خطیب بغدادیؒ جیسے حضرات نے اس کی توثیق بھی کی ہے (عمدۃ القاری ص ۲۴۰ ج ۱۲)

دوسرا جواب

علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ یہ حکم دیانت پر محمول ہے (العرف الشذی ص ۳۹۸) یعنی مشتری اور غرماء پر دیانتاً" یہ ہے کہ وہ چیز بائع کو واپس کر دی جائے جو پہلے اس کی ملکیت تھی۔ یہ حکم قضاء" نہیں ہے۔

شوافع حضرات کی دوسری دلیل

حضرت ابو ہریرہؓ کا فیصلہ ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ میں اس مسئلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں کہ جو شخص دیوالیہ ہو جائے یا مر جائے پھر کوئی آدمی اس کے پاس اپنا سامان بعینہ پائے تو وہ زیادہ حقدار ہے اور یہ روایت ابوداؤد ج ۲ ص ۱۴۰) وغیرہ میں موجود ہے۔

اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ اس میں ایک راوی ابو المعتمر ہے جو کہ مجہول ہے علامہ ظفر احمد صاحب فرماتے ہیں قَالَ الْمُنذِرِی وَاَخْرَجَہٗ ابْنُ مَاجَۃَ وَحَکٰی اَبِیْ دَاؤدَ اَنَّہٗ قَالَ مَنْ یَّاْخُذُ بِھٰذَا؟ وَاَبُو الْمُعْتَمِرِ مِنْ ھٰؤُلَاءِ لَا یُعْرَفُ (اعلاء السنن ص ۳۹۱ ج ۱۴) امام منذری نے فرمایا کہ یہ روایت امام ابن ماجہ نے بھی اپنی کتاب میں لائی ہے اور امام منذری نے امام ابوداؤد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس روایت کو کون لے گا؟ اور ابو المعتمر معروف نہیں ہے اور اسی طرح الجوھر النقی کا حوالہ نقل کرتے ہیں کہ اس

کی سند میں ابو المعتمر ہے اور وہ مجہول ہے اور اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ اس روایت میں بیع کا ذکر نہیں ہے اس لیے اس کو غصب وغیرہ پر محمول کریں گے۔

مالکیہ کی دلیل

مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے امام مالک کا جو نظریہ نقل کیا ہے کہ اگر مشتری نے مبیعہ کے ثمن کا کچھ ادا کر دیا ہو تو ایسی صورت میں بائع باقی قرض خواہوں کے ساتھ برابر ہو گا اور اگر اس نے ثمن کا کچھ حصہ بھی ادا نہیں کیا تو بائع اس چیز کا حق دار ہو گا اس پر ان کی دلیل وہ روایت ہے جو ابوداوٗد ج ۲ ص ۱۴۰ وغیرہ میں ہے جس میں یہ الفاظ ہیں وَلَمْ يَقْبِضِ الَّذِیْ بَاعَهُ مِنْ ثَمَنِهٖ شَيْئًا کہ بائع نے اس بیعہ کے ثمن میں سے کچھ بھی وصول نہ کیا ہو تو وہ اس چیز کا حقدار ہو گا۔ تو اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ اگر اس نے ثمن کا کچھ حصہ وصول کر لیا تو پھر وہ اکیلا حق دار نہ ہو گا اور مالکیہ کے ہاں مفہوم مخالف حجت ہے اور اسی طرح بعض روایات میں یہ الفاظ موجود ہیں وَاِنْ كَانَ قَدْ قَضٰى مِنْ ثَمَنِهَا شَيْئًا فَهُوَ اُسْوَةٌ لِلْغُرَمَاءِ فِيْهَا (ابوداوٗد ج ۲ ص ۱۴۱) اگر اس نے اس مبیعہ کے ثمن کا کچھ ادا کر دیا ہو تو پھر وہ باقی قرض خواہوں کے ساتھ برابر ہو گا۔

اسی طرح مالکیہ نے کہا کہ اگر مفلس مشتری مر گیا تو بائع باقی قرض خواہوں کے ساتھ برابر ہو گا اس پر وہ یہ روایت پیش کرتے ہیں وَاِنْ مَاتَ الْمُشْتَرِیْ فَصَاحِبُ الْمَتَاعِ اُسْوَةُ الْغُرَمَاءِ (ابوداوٗد ج ۲ ص ۱۴۱) اور اگر مشتری مر گیا تو مبیع کا بائع باقی قرض خواہوں کے ساتھ برابر ہو گا۔

شوافع حضرات نے ان روایات کا جواب دیا کہ یہ روایات مرسل ہیں اور شوافع کے نزدیک ایسی مرسل حجت نہیں۔ اور احناف کی جانب سے علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ یہ درست ہے کہ احناف کے نزدیک مرسل حجت ہے لیکن مسند روایت اقوی ہوتی ہے اس لیے کہ حدیث قبول کرنے کے لیے اس کے راویوں کی عدالت شرط ہے اور مسند میں یہ چیز صراحت کے ساتھ پائی جاتی ہے جبکہ مرسل میں یا تو یہ چیز مشکوک ہوتی ہے یا دلالتاً پائی جاتی ہے اور دلالت کی بہ نسبت صریح اقویٰ ہوتی ہے (عمدۃ القاری ص ۲۴۱ ج ۱۲)

احناف کی دلیل

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں وَصَحَّ عَنْ عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيْزِ اَنَّ مَنِ اقْتَضٰى مِنْ ثَمَنِ

سَلعَتِہٖ شَيْئًا ثُمَّ اَفلَسَ فَهُوَ وَالغُرَمَاءُ فِيهِ سَوَاءٌ وَهُوَ قَولُ الزُّهرِيِّ - وَرَوٰى قَتَادَةُ عَنْ خَلاَسِ بنِ عَمرٍو عَن عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنهُ اَنَّهُ قَالَ هُوَ فِيهَا اُسوَةُ الغُرَمَاءِ اِذَا وَجَدَهَا بِعَينِہٖ (عمدۃ القاری ص ۲۴۰ ج ۱۲) اور صحیح روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے فرمایا کہ جس نے مبیعہ کے ثمن کا کچھ حصہ ادا کر دیا پھر مفلس ہو گیا تو اس کا بائع باقی قرض خواہوں کے ساتھ برابر ہو گا۔ اور یہی قول ہے امام زہری کا۔ اور قتادہ نے خلاس بن عمرو کے واسطہ سے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے اس جیسی صورت میں فرمایا کہ جب بائع اس مبیعہ کو بعینہٖ پالے تو بائع باقی قرض خواہوں کے ساتھ برابر ہو گا۔ اور علامہ عینی فرماتے ہیں کہ اسی کے مطابق نظریہ ہے امام ابراہیم النخعیؒ، حسن بصریؒ، امام شعبیؒ اور وکیع بن الجراحؒ جیسے حضرات کا۔

اعتراض

حضرت علیؓ کا جو اثر خلاس بن عمرو کے واسطہ سے ہے اس پر مبارکپوری صاحب اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ التعلیق الممجد (ص ۳۴۱) میں ہے وَاَحَادِيثُ خَلاَسٍ عَنْ عَلِيٍّ ضَعِيفَةٌ (تحفۃ الاحوذی ص ۲۵۱ ج ۲) کہ خلاس کی حضرت علیؓ سے مروی احادیث ضعیف ہیں۔

اس کا جواب

خلاس بن عمرو ثقہ راوی ہے مگر اس پر یہ اعتراض ہے کہ اس نے حضرت علیؓ سے سماعت نہیں کی بلکہ وہ ایک کتاب سے حضرت علیؓ کی روایات کیا کرتا تھا۔ مگر امام ترمذی نے ج ۱ ص ۱۸۲ میں بَابُ مَا جَاءَ فِي كَرَاهِيَةِ الحَلقِ لِلنِّسَاءِ میں عَنْ خَلاَسِ بنِ عَمرٍو عَنْ عَلِيٍّ کی سند سے روایت لی ہے۔ اس کے تحت مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں خَلاَسُ بنُ عَمرٍو الهَجَرِيُّ البَصرِيُّ ثِقَةٌ (تحفۃ الاحوذی ص ۱۰۹ ج ۲ یہاں اس کے عدم سماع کا اعتراض نہ امام ترمذیؒ نے کیا ہے اور نہ ہی مبارکپوری صاحبؒ نے۔ اور مولانا ظفر احمد صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ کا یہ اثر صحیح سند سے ثابت ہے اور علامہ ابن حزمؒ نے کتاب الجہاد میں خلاس عن علیؓ کی سند سے مروی روایت کو صحیح قرار دیا ہے (اعلاء السنن ص ۳۹۰ ج ۱۴) اس سے معلوم ہوا کہ خلاس عن علیؓ کی تمام روایات کو ضعیف کہنا درست نہیں ہے اور مولانا عثمانیؒ لکھتے ہیں کہ امام محمد بن الحسن نے الحجج میں فرمایا کہ حضرت ابو ہریرہؓ

سے مروی روایت میں چونکہ اختلاف ہے کسی میں بیع کا ذکر ہے اور کسی میں نہیں اور کسی میں بیع کا ذکر ہے اور وَلَمْ يَفْتَرِقَه کی قید ہے کسی میں لَمْ يَكُنْ قَبَضَ مِنْ ثَمَنِهٖ شَيْئاً کے الفاظ ہیں اور کسی میں وَإِنْ كَانَ قَبَضَ مِنْ ثَمَنِهٖ شَيْئاً فَهُوَ أُسْوَةُ الْغُرَمَاءِ کے الفاظ ہیں جبکہ حضرت علیؓ کا قول اپنے مفہوم میں واضح ہے اس لیے ہمارے نزدیک حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کی بہ نسبت حضرت علیؓ کا قول راجح ہے۔ (اعلاء السنن ص ۳۹۳ ج ۱۴)

بَابُ مَا جَاءَ فِي النَّهْيِ لِلْمُسْلِمِ أَنْ يَدْفَعَ إِلَى الذِّمِّيِّ الْخَمْرَ يَبِيعُهَا لَهُ

(ذمی کے ذریعے سے شراب کی خرید و فروخت کی مسلمان کے لیے ممانعت کا بیان)

یہاں دو بحثیں ہیں۔

البحث الاول

اگر شراب کا سرکہ بنا لیا جائے تو اس کے بارہ میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ مبارکپوریؒ امام شافعیؒ کا یہ نظریہ نقل کرتے ہیں کہ اگر شراب میں کوئی چیز ڈال کر سرکہ بنا لیا جائے تو جائز نہیں ہے اور اگر دھوپ میں پڑے رہنے وغیرہ کی وجہ سے خود بخود سرکہ بن جائے تو وہ حلال اور طاہر ہے۔ اور امام ابو حنیفہؒ اور امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی چیز ڈال کر بھی سرکہ تیار کیا جائے تب بھی وہ طاہر ہے۔ (تحفۃ الاحوذی ص ۲۵۱ ج ۲) اور امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس بارہ میں امام مالکؒ سے دو روایتیں ہیں اور اصح روایت کے مطابق وہ امام شافعیؒ کے ساتھ ہیں (شرح مسلم ص ۲۲ ج ۲) اور مولانا محمد زکریا صاحبؒ اور مبارکپوری صاحبؒ فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ سے اس بارہ میں تین روایات ہیں۔ ایک روایت کے مطابق اس شراب کا سرکہ بنانا حرام ہے اس کی وجہ سے آدمی گنہگار ہو گا لیکن جو سرکہ تیار کر لیا گیا ہے وہ پاک ہو گا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ سرکہ بھی ناپاک ہوگا۔ اور تیسری روایت کے مطابق ان کا نظریہ امام شافعیؒ کے مطابق ہے۔ (اوجز المسالک ص) تحفۃ الاحوذی ص ۲۵۱ ج ۲) اور امام احمدؒ کا نظریہ ملا علی قاریؒ کے حوالہ سے مبارکپوریؒ نے یہ نقل کیا ہے کہ شراب کا سرکہ بنانا حرام ہے۔

امام صاحبؒ کی پہلی دلیل

مسند احمد ج ۳ ص ۳۱۰ اور ج ۳ ص ۳۹۰ وغیرہ میں روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا نِعۡمَ الۡاِدَامُ الۡخَلُّ بہترین سالن سرکہ ہے اس میں کوئی قید نہیں ہے کہ سرکہ کس چیز سے بنایا گیا ہو۔

دوسری دلیل

امام بیہقیؒ نے حضرت جابرؓ سے مرفوعا روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خَیۡرُ خَلِّکُمۡ خَلُّ خَمۡرِکُمۡ (بحوالہ تحفۃ الاحوذی ص ۲۵۱ ج ۲) کہ تمہارا بہترین سرکہ وہ ہے جو شراب سے بنا ہو۔

اعتراض

مبارکپوری صاحبؒ علامہ زیلعیؒ کا اعتراض نقل کرتے ہیں کہ اس روایت میں مغیرہ بن زیاد ہے اور وہ قوی راوی نہیں ہے۔

اس کا جواب

اگرچہ اس پر جرح کی گئی ہے مگر وکیعؒ اور ابن معینؒ جیسے محدثین نے اس کی توثیق بھی کی ہے اور مبارکپوری صاحب اس کی سند سے ایک روایت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں فَالظَّاهِرُ اَنَّ اِسۡنَادَ هٰذَا الۡحَدِیۡثِ لَا یَحُطُّ عَنۡ دَرَجَةِ الۡحَسَنِ واللہ تعالی اعلم (تحفۃ الاحوذی ص ۳۱۹ ج ۲) ظاہر بات ہے کہ اس حدیث کی سند حسن درجہ سے کم نہیں ہے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ جرح کے باوجود اس کی روایت حسن درجہ سے کم نہیں ہے۔

تیسری دلیل

امام دار قطنیؒ نے (ج ۴ ص ۲۶۶ میں) حضرت ام سلمہؓ سے مرفوعا روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّ دِبَاغَهَا یُحِلُّ کَمَا یَحِلُّ خَلُّ الۡخَمۡرِ (بحوالہ تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۲۵۱) بے شک اس کے چمڑے کو دباغت دینا اس کو پاک کر دیتا ہے جیسا کہ شراب کا سرکہ بن جانا اس کو پاک کر دیتا ہے۔ اس میں بھی کوئی قید نہیں کہ وہ خود بخود سرکہ بن جائے یا کوئی چیز ڈال کر سرکہ بنا لیا جائے بلکہ ظاہر الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں صورتیں جائز ہیں اس لیے کہ چمڑا دھوپ میں پڑے رہنے کی وجہ سے خود بخود اس

کی دباغت حاصل ہو جائے تب بھی پاک ہو جاتا ہے یا اس کو کوئی چیز لگا کر دباغت دی جائے تو تب بھی پاک ہو جاتا ہے تو جیسے یہاں دونوں صورتوں میں چمڑا پاک ہو جاتا ہے اسی طرح خود بخود سرکہ بن جائے یا سرکہ بنا لیا جائے تو دونوں صورتوں میں وہ شراب کی حالت باقی نہ رہنے کی وجہ سے پاک ہو جاتا ہے۔

حضرت گنگوہیؒ ایک اعتراض نقل کر کے اس کا جواب دیتے ہیں۔ اعتراض یہ ہے کہ جب اصل میں شراب ناپاک ہے تو اس میں کوئی چیز ڈال کر سرکہ بنانے سے وہ کیسے پاک ہو جاتی ہے؟ اس کا جواب یہ دیا کہ جیسے مردار کا چمڑا اپنے اصل کے اعتبار سے ناپاک ہے مگر دباغت کے ساتھ پاک ہو جاتا ہے تو اسی طرح شراب اپنے اصل کے لحاظ سے ناپاک ہے مگر جب اس کا سرکہ بنا لیا جائے تو وہ پاک ہو جاتا ہے۔ (الکوکب الدری ص ۱۷۰)

اعتراض

حضرت ام سلمہؓ والی روایت پر مبارکپوری صاحبؒ اعتراض کرتے ہیں کہ اس کی سند میں فرج بن فضالہ راوی ہے جو کہ ضعیف ہے (تحفۃ الاحوذی ص ۲۵۱ ج ۲)

اس کا جواب

اس راوی کے بارہ میں امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ بعض محدثین نے اس کو حافظہ کے لحاظ سے ضعیف کہا ہے وَقَدْ رَوٰی عَنْهُ وَكِيْعٌ وَغَيْرُ وَاحِدٍ مِنَ الْاَئِمَّةِ (ترمذی ص ۴۵ ج ۲)) کہ اس سے وکیع اور دیگر بہت سے ائمہ نے روایت کی ہے تو یہ راوی اتنا گرا ہوا نہیں کہ اس کی روایت اعتبار کے لائق نہ ہو۔ اور مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ نے حضرت علیؓ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابو الدرداءؓ کے آثار نقل کیے ہیں کہ وہ شراب سے بنائے ہوئے سرکہ میں کوئی حرج نہ سمجھتے تھے۔ (اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۱۳۹)

دیگر ائمہ کی پہلی دلیل اور اس کا جواب

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ شراب کا سرکہ بنا لیا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں (مسلم ج ۲ ص ۱۶۳ وغیرہ)

اس کا جواب یہ ہے کہ جب بعض روایات سے شراب کے سرکہ بنانے کی اجازت ثابت ہوتی ہے اور بعض صحابہؓ سے بھی اس بارہ میں آثار موجود ہیں تو تطبیق کے لیے اس کی یہی تاویل کی جائے گی کہ یہ اس ابتدائی زمانہ کی روایت ہے۔ جب شراب سے نفرت دلانا

مقصود تھا یہاں تک کہ ان برتنوں کا استعمال بھی ممنوع قرار دے دیا گیا جن برتنوں میں شراب بنائی جاتی تھی اور بعد میں ان برتنوں کے استعمال کی اجازت دے دی گئی۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ آپؐ نے جو لا فرمایا ہے' اس سے نہی تنزیہی مراد ہے جو کہ جواز کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے یعنی ایسا کرنا اچھا نہیں ہے۔

دوسری دلیل اور اس کا جواب

حضرت ابو سعید الخدریؓ سے روایت ہے کہ جب سورۃ المائدہ کی شراب کے بارے میں آیت نازل ہوئی تو میں نے کہا کہ ایک یتیم بچے کی شراب ہمارے پاس ہے تو آپؐ نے فرمایا اَھَرِیْقُوْہٗ اس کو بہا دو۔ (ترمذی ص ۲۳۹ ج ۱)

اس کا جواب یہ ہے کہ روایت کے الفاظ ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی دور کی بات ہے جبکہ آپؐ نے شراب کے بارہ میں سختی فرمائی تاکہ اس کی نفرت لوگوں کے دلوں میں بیٹھ جائے۔ اسی طرح حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ ابو طلحہؓ کے ہاں کچھ یتیم پرورش پاتے تھے اور انہوں نے ان کے مال سے شراب خریدی۔ فَلَمَّا نَزَلَ تَحْرِیْمُ الْخَمْرِ اَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَذَکَرَ ذَالِکَ لَہٗ فَقَالَ اَجْعَلُہٗ خَلًّا قَالَ لَا (دارمی ج ۲ ص ۴۳) تو جب شراب کی حرمت نازل ہوئی تو وہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس بارے میں پوچھا اور کہا کہ کیا میں اس کا سرکہ بنالوں تو آپ نے منع فرمایا۔ یہ بھی ابتدائی دور کی روایت ہے جبکہ شراب سے نفرت دلانا مقصود تھا۔

اعتراض

حضرت ابو سعیدؓ والی روایت میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے یتیم کی شراب بہا دینے کا حکم فرمایا حالانکہ قرآن کریم میں تو یتیم کا مال ضائع کرنے کی ممانعت ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی مصلحت نہ ہو تو یتیم کا مال ضائع کرنا درست نہیں اور اگر مصلحت ہو تو درست ہے اور یہاں مصلحت یہ تھی کہ شراب کی اس قدر نفرت ہو جائے کہ کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے اور یہ نفرت دلانے کے لیے تھا جیسا کہ کتوں سے نفرت دلانے کے لیے ان کو مار ڈالنے کا حکم دیا گیا حالانکہ ان میں سے کئی کتے مالکوں کی ملکیت ہوتے تھے اور قیمتی ہوتے تھے جب نفرت دل میں بیٹھ گئی تو پھر ان کو مارنے سے روک دیا گیا۔

البحث الثانی۔ ذمی کے ذریعے سے بیچی گئی شراب کا حکم

اس میں اتفاق ہے کہ کوئی مسلمان براہ راست شراب کا کاروبار نہیں کر سکتا اگر شراب کی خرید و فروخت کے لیے کسی ذمی کو وکیل بنا لے تو کیا یہ کسی مسلمان کے لیے جائز ہے یا نہیں۔ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ علامہ ابن حزم کے المحلی کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جب کسی مسلمان نے کسی نصرانی کو حکم دیا کہ اس کے لیے شراب خریدے تو یہ درست ہے علامہ ابن حزم نے کہا کہ یہ امام ابو حنیفہؒ کی قبیح باتوں سے ہے جن سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

اس کے جواب میں مولانا عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ ابو عبیدہؓ نے اپنی کتاب الاموال میں صحیح سند کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت عمرؓ کو یہ اطلاع ملی کہ کچھ لوگ خنزیر کی صورت میں جزیہ وصول کرتے ہیں تو انہوں نے حضرت بلالؓ سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ ہاں لوگ ایسا کرتے ہیں تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ان سے کہو کہ ایسا نہ کریں بلکہ ان اہل ذمہ کے ہی سپرد کریں کہ وہ خود خنزیر کو بیچ کر نقدی کی صورت میں جزیہ ادا کیا کریں اور ابو عبیدہؒ نے یہ روایت بھی صحیح سند سے نقل کی ہے کہ حضرت بلالؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ آپ کی جانب سے مقرر کردہ بعض عمال خراج میں خنزیر اور شراب لے لیتے ہیں تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم ان سے خنزیر اور شراب نہ لیا کرو بلکہ ان پر ہی ذمہ داری ڈالو کہ وہ ان کو بیچیں اور تم ان کا ثمن لے لیا کرو۔ اور مولانا عثمانیؒ آگے لکھتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے اہل الذمہ کو شراب اور خنزیر بیچنے کی اجازت دی اور ان کے ثمن کو جزیہ اور خراج میں وصول کیا اور یہ صحابہؓ کی موجودگی میں تھا اور کسی نے ان پر طعن نہیں کیا اور جب اہل الذمہ کو ان چیزوں کا بیچنا جائز ہے اور مسلمانوں کو ان سے ان اثمان (قیمتوں) کو لینا جائز ہے تو پھر امام ابو حنیفہؒ پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ اگر مسلمان کسی ذمی کو ان چیزوں کی تجارت میں وکیل بنائے تو جائز ہے کیونکہ یہ چیز حضرت عمرؓ کے اس عمومی قول سے ثابت ہوتی ہے کہ ان کے بیچنے کی ذمہ داری ان پر ہی ڈالو اور ان کی قیمت تم پر وصول کر لو۔

(اعلاء السنن ۱۱۱ - ۱۱۲ ج ۱۴)

بابٌ۔ اگر کسی کا دوسرے کے ذمہ حق ہو تو کیا وہ خفیہ طور پر اپنا حق لے سکتا ہے؟

امام ترمذیؒ نے صرف بَابٌ فرمایا ہے، کوئی عنوان قائم نہیں کیا مگر تَحْتَ الْبَاب حدیث ذکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اس بات پر بحث ہے کہ اگر کوئی آدمی کسی سے خیانت کرے یا کسی آدمی کے ذمہ کسی دوسرے کا کوئی حق ہو تو کیا صاحب حق اپنے اس حق کو خفیہ طور پر یا زبردستی لے سکتا ہے یا نہیں؟

امام احمدؒ کا نظریہ

مولانا سہارنپوریؒ علامہ ابن حجر سے نقل کرتے ہیں کہ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے دوسرے سے خیانت کی ہو تو اس آدمی کو اس سے خیانت نہیں کرنی چاہیے ایسا کرنا مطلقاً ممنوع ہے۔

امام شافعیؒ کا نظریہ

اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جس قسم کا حق اس کا ہے اگر اسی کے جنس کو وصول کرنے کا موقعہ اس کو مل گیا تو لے سکتا ہے اور اس جنس کے مطابق وصول کرنا متعذر ہو تو پھر دوسری جنس سے بھی وصول کر سکتا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کا نظریہ

اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر اپنے حق کی جنس کے مطابق وصول کرنے کا موقعہ مل گیا تو کر سکتا ہے اور اس صورت میں نقدین یعنی سونا اور چاندی ایک ہی جنس ہوں گے اور اگر اپنے حق کی جنس کے مطابق نہ لے سکے تو پھر نہیں لے سکتا۔

امام مالکؒ کا نظریہ

اور امام مالکؒ سے اس بارہ میں تین روایات ہیں۔ (بذل المجہود ص ۲۹۶ ج ۵)

امام احمدؒ کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ ہے وَلَا تَأْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (سورۃ البقرہ آیت ۱۸۸) اور ترمذی شریف کی یہی روایت وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ (ج ا ص ۲۳۹) بھی امام احمدؒ کی دلیل ہے۔

اس کا جواب مبارکپوری صاحبؒ نقل کرتے ہیں کہ اس کو باطل نہیں کہتے (اس لیے کہ یہ آدمی اپنے حق کو وصول کر رہا ہے) اور حدیث میں جو نہی ہے وہ ندب پر محمول ہے (تحفۃ الاحوذی ص ۲۵۲ ج ۲) یعنی ایسا نہ کرنا بہتر ہے۔

امام شافعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ کی دلیل قرآن کریم کی آیت کریمہ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ہے (سورۃ النحل آیت نمبر ۱۲۶)

اور قرآن کریم کی آیت کریمہ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (سورۃ البقرہ آیت نمبر ۱۹۴) اور آیت کریمہ وَجَزَآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (سوۃ الشوریٰ آیت نمبر ۴۰) اور ابو سفیانؓ کی بیوی ہندؓ کی روایت ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا تھا خُذِيْ مَا يَكْفِيْكِ وَبَنِيْكِ بِالْمَعْرُوْفِ (ابو داؤد ج ۲ ص ۱۴۲) کہ تو اتنی مقدار میں خفیہ طور پر لے لیا کر جتنا مال تجھے اور تیرے بیٹے کو کافی ہو۔

مَسْئَلَةُ الظَّفَرِ

فقہ کی کتابوں اور احادیث کی شروحات میں مسئلۃ الظفر کے نام سے ایک مسئلہ معروف ہے اس کی صورت یہ ہے کہ ایک آدمی نے کسی دوسرے سے اپنا حق وصول کرنا ہے اور وہ دیتا نہیں مثلاً ملازم نے مالک سے تنخواہ لینی ہے جو اس کا حق بنتا ہے اور مالک دیتا نہیں اور کسی طرح سے مالک کا مال ملازم کے ہاتھ آگیا تو کیا یہ ملازم مالک کی اجازت کے بغیر اپنے حق جتنا اس میں سے لے سکتا ہے یا نہیں۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ملازم کے پاس یہ مال مالک کی امانت ہے اس لیے اس کے لیے ایسا کرنا درست نہیں ہے امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر جو حق بنتا ہے اسی کی جنس کا مال اس کو ملا تو لے سکتا ہے مثلاً اس نے گندم لینی ہے اور گندم ہی اس کے ہاتھ آئی تو لے سکتا ہے اور اگر کسی دوسری جنس کا مال ہاتھ آیا تو نہیں لے سکتا۔ اس صورت میں سونا یا چاندی ان کے نزدیک ایک ہی جنس ہوں گے اس لیے کہ دونوں نقدی ہونے میں ایک جیسے ہیں۔ اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ خواہ اس کے ہاتھ اسی جنس کا مال آیا جو اس نے لینا ہے یا اس کے علاوہ آیا ہر حال میں وہ اپنا حق وصول کر سکتا ہے اور فرماتے ہیں کہ اگر زبردستی چھین سکتا ہے تو تب بھی درست ہے خواہ وہ چیز منقولی ہو یا غیر منقولی ہو جیسا کہ مکان زمین وغیرہ۔ اور یہ حضرات دلیل میں هِنْد امرأة ابی سفیان کی روایت پیش کرتے ہیں اور لَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ والی روایت ان کے خلاف نہیں ہے اس لیے کہ وہ خیانت نہیں کر رہا بلکہ اپنا حق وصول کر رہا ہے۔ اس مسئلہ کو مسئلۃ الظفر سے تعبیر کیا جاتا ہے علامہ کشمیری العرف الشذی ص ۳۹۸ میں اور حضرت گنگوہی الکوکب الدری ص ۳۷۲ میں فرماتے ہیں کہ ہمارے متاخرین فقہاء اس مسئلہ میں

امام شافعیؒ کے نظریہ کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔

بَابُ مَا جَاءَ اَنَّ الْعَارِیَةَ مُؤَدَّاةٌ

صاحب ہدایہؒ عاریت کی تعریف کرتے ہیں ھِیَ تَمْلِیْکُ الْمَنَافِعِ بِغَیْرِ عِوَضٍ (ہدایہ ص ۲۳۱ ج ۳) کہ کسی دوسرے کو کسی معاوضہ کے بغیر کسی چیز کے منافع کا مالک بنانا عاریت کہلاتا ہے اور علامہ انور شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ کے نزدیک عاریت میں صرف اس چیز سے فائدہ اٹھانا اس کے لیے مباح ہوتا ہے منافع کا مالک بنانا نہیں ہوتا اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک منافع کا مالک بنانا ہوتا ہے۔ (العرف الشذی ص ۳۹۸) جو شخص اپنی مملوکہ چیز کسی معاوضہ کے بغیر دوسرے کو فائدہ اٹھانے کے لیے دیتا ہے اس کو مُعِیر اور اس چیز کو مُسْتَعَار اور جس کو وہ چیز دی جا رہی ہے اس کو مُسْتَعِیر کہتے ہیں۔

مستعار چیز کے ہلاک ہو جانے کی صورت میں ضمان ہے یا نہیں؟

اگر مستعیر نے مستعار چیز کو ہلاک اور ضائع کر دیا تو بالاتفاق اس پر ضمان ہوگی۔ اور اگر وہ چیز مستعیر کے عمل دخل کے بغیر ہلاک ہو گئی تو کیا اس میں ضمان ہے یا نہیں اس بارہ میں ائمہ فقہاء کے اقوال مختلف ہیں مولانا سہارنپوریؒ امام خطابیؒ (کی معالم السنن ص ۲۰۰ ج ۵) سے نقل کرتے ہیں کہ عاریت کی ضمان سے متعلق لوگوں کا اختلاف ہے حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ اس میں ضمان نہیں۔ قاضی شریحؒ حسن بصریؒ، ابراہیم النخعیؒ، سفیان ثوریؒ، اسحاق بن راہویہؒ اور اصحاب الرائے کا یہی نظریہ ہے اور حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ یہ دونوں حضرات اس میں ضمان کے قائل ہیں اور یہی نظریہ حضرت عطاءؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا ہے اور امام مالکؒ نے فرمایا کہ جس چیز کا ہلاک ہو جانا ظاہر ہے جیسا کہ حیوان وغیرہ تو اگر ایسی چیز ہلاک ہو جائے تو ضمان نہیں ہے اور جس چیز کا ضائع ہونا ظاہر نہیں بلکہ مخفی ہے جیسا کہ کپڑا وغیرہ تو اس کے ہلاک ہونے کی صورت میں ضمان ہوگی (بذل المجہود ص ۳۰۳ ج ۵)

اور صاحب ہدایہ احناف کا مسلک یہ بتاتے ہیں وَالْعَارِیَةُ اَمَانَةٌ اِنْ ھَلَکَتْ مِنْ غَیْرِ تَعَدٍّ لَمْ یَضْمَنْ وَقَالَ الشَّافِعِیُّ یَضْمَنُ (ہدایہ ص ۲۳۱ ج ۳) اور مستعار چیز مستعیر کے پاس امانت ہے اگر اس کی جانب سے کوتاہی یا زیادتی کے بغیر ہلاک ہو جائے تو اس پر ضمان نہیں ہوگی اور امام شافعیؒ نے فرمایا کہ ضمان ہوگی۔

امام ابو حنیفہؒ کی دلیل

ابوداؤد ص ۱۴۶ ج ۲ وغیرہ میں حضرت صفوان بن یعلی اپنے باپ یعلی سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ جب میرے قاصد تمہارے پاس آئیں تو ان کو تیس زرہیں اور تیس اونٹ دے دینا حضرت یعلیؓ کہتے ہیں کہ میں نے کہا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَعَارِیَۃٌ مَضْمُوْنَۃٌ اَوْ عَارِیَۃٌ مُؤَدَّاۃٌ کیا یہ ایسی عاریت ہے جس کے ضائع ہو جانے پر ضمان دی جائے گی یا ایسی عاریت ہے کہ اگر موجود ہو تو اس کی ادائیگی ہوگی تو آپؐ نے فرمایا بَلْ عَارِیَۃٌ مُؤَدَّاۃٌ بلکہ یہ ایسی عاریت ہے کہ اس کی ادائیگی کی جائے گی۔ اس میں آپؐ نے مضمونہ کی نفی فرمائی۔ اور مؤداۃ فرما کر اشارہ فرما دیا کہ اگر وہ چیزیں موجود ہوں گی تو اداء کی جائیں گی۔ اور حضرت سمرہؓ کی روایت جو ترمذی ج ۱ ص ۲۳۹ میں ہے کہ آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا اَلْعَارِیَۃُ مُؤَدَّاۃٌ کہ مستعار چیز ادا کی جائے گی اور اداء اسی صورت میں ہو سکتی ہے جبکہ وہ موجود ہے اور اگر ہلاک ہو جائے تو اس کے بدل کو ادا نہیں کہتے بلکہ قضاء کہتے ہیں۔ یہ روایت بھی احناف کی دلیل ہے۔ اسی طرح حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کے جن آثار کا ذکر امام خطابی کے حوالہ سے گزر چکا ہے وہ بھی امام صاحب کی دلیلیں ہیں۔

ان حضرات نے دار قطنی ج ۳ ص ۴۱ کی اس روایت کو بھی دلیل بنایا ہے جس میں یہ الفاظ ہیں لَیْسَ عَلَی الْمُسْتَعِیْرِ غَیْرِ الْمُغِلِّ ضَمَانٌ جو مستعیر اس مستعار چیز کو جان بوجھ کر ضائع کرنے والا نہ ہو تو اس پر ضمان نہیں ہے مگر مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حافظ ابن حجر نے کہا ہے کہ اس کی سند ضعیف ہے (تحفۃ الاحوذی ص ۲۵۳ ج ۲)

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کی پہلی دلیل اور اس کا جواب

ابوداؤد ج ۲ ص ۱۴۵ وغیرہ کی حضرت صفوان بن امیہؓ کی روایت ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ حنین کے موقعہ پر اس سے عاریتاً درعیں مانگیں تو اس نے کہا کہ اَغَصْبٌ یَا مُحَمَّدُ۔ اے محمد کیا آپ یہ درعیں غصب کرنا چاہتے ہیں (چونکہ صفوان اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اس لیے یہ کہا) تو آپؐ نے فرمایا لَا بَلْ عَارِیَۃٌ مَضْمُوْنَۃٌ غصب نہیں کرنا چاہتا بلکہ عاریتاً لینا چاہتا ہوں جس کی ضمان دی جائیگی۔ اس میں چونکہ کوئی قید نہیں کہ وہ ہلاک ہو جائے یا ہلاک کر دی جائے بلکہ مطلقاً فرمایا ہے تو اس سے معلوم ہوا

کہ ہر حال میں عاریت کے ضائع ہو جانے پر ضمان ہوگی۔

اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ امام ابوداؤد خود فرماتے ہیں کہ هٰذِهٖ رِوَايَةُ يَزِيْدَ بِبَغْدَادَ وَفِيْ رِوَايَتِهٖ بِوَاسِطَ تَغْيِيْرٌ عَلٰى غَيْرِ هٰذَا (ابوداؤد ص ۱۴۵ ج ۲) یزید راوی نے بغداد میں ان ہی الفاظ سے روایت کی مگر واسط کے مقام میں روایت کے الفاظ کو بدل دیا۔ تو ایسی حالت میں اس پر مدار کیسے رکھی جا سکتی ہے دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ ایک مخصوص واقعہ ہے مولانا سہارنپوریؒ فرماتے ہیں کہ وہ صفوان چونکہ ابھی تک مسلمان نہ ہوئے تھے تو آپؐ نے ان کے دل کو اطمینان دلانے کے لیے ایسا فرمایا۔ اور اس سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ مستعیر اگر از خود ضمان ادا کرنا چاہے تو کر سکتا ہے اور اگر نہ ادا کرنا چاہے تو اس پر جبر نہیں کیا جا سکتا۔ (بذل المجہود ص ۳۰۲ ج ۵) اور اس کی تائید ابوداؤد ص ۱۴۶ ج ۲ کی وہ روایت کرتی ہے جس میں ہے کہ جب حضور علیہ السلام نے درعیں واپس کرنی چاہی تو ان میں سے بعض گم تھیں تو آپؐ نے حضرت صفوان سے فرمایا جو اس وقت مسلمان ہو چکے تھے هَلْ نَغْرِمُ کیا ہم ان گم شدہ درعوں کا تاوان دیں تو انہوں نے کہا کہ نہیں یا رسول اللہ۔ اس لیے کہ آج میرے دل میں وہ کچھ ہے جو اس وقت نہ تھا۔ اگر ان گم شدہ کی ضمان واجب ہوتی تو آپ هَلْ نَغْرِمُ نہ فرماتے بلکہ ان سے پوچھے بغیر ہی ضمان دے دیتے۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ امام تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ عَارِيَةٌ مَضْمُوْنَةٌ میں ضمان سے ضمان الرد مراد ہے ضمان العین مراد نہیں یعنی ہلاکت کے بعد عینِ شیئی کا ضمان نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ اگر وہ موجود ہوگی تو واپس کر دینے کی ضمانت دی جاتی ہے۔ (تنظیم الاشتات ص ۲۷۱ ج ۳)

شوافع حضرات کی دوسری دلیل

ابو داؤد ج ۲ ص ۱۴۶ کی روایت ہے جس میں ہے کہ حضور علیہ السلام اپنی ایک بیوی (حضرت عائشہ صدیقہؓ) کے ہاں تھے تو حضور علیہ السلام کی دیگر ازواج مطہرات میں سے کسی نے کھانا ایک پیالہ میں بھیجا تو انہوں (حضرت عائشہؓ) نے ہاتھ مار کر وہ پیالہ توڑ دیا اور اس میں جو کھانا تھا وہ بھی گر گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پیالہ کے بدلہ میں پیالہ بھیجا جس سے پتہ چلتا ہے کہ عاریت کی ضمان ہوتی ہے۔

اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ روایت میں الفاظ ہیں کہ انہوں (حضرت عائشہؓ) نے ہاتھ مار کر جان بوجھ کر وہ پیالہ گرایا تھا تو اگر مستعار چیز کو مستعیر جان بوجھ کر ضائع کرے تو

اس کی ضمان تو احناف کے نزدیک بھی ہے۔ پھر یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اس پر عاریت کا اطلاق کیسے کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ آپ نے وہ پیالہ منگوایا نہیں تھا بلکہ ام المومنین نے ازخود بھیجا تھا جس پر عاریت کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا بلکہ امانت کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ مولانا سہارنپوری امام خطابی سے نقل کرتے ہیں کہ ازواج مطہرات کے زیر تصرف جو طعام وغیرہ ہوتا تھا اس میں غالب یہی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک ہی تھا (بذل المجہود ص ۳۰۴ ج ۵)

تو اس لحاظ سے آپ نے جو پیالہ بدلہ میں بھیجا تھا وہ ضمان نہ تھی بلکہ پہلا پیالہ بھی آپ کی ملک تھا اور دوسرا بھی۔ آپ نے اس لیے بھیجا تاکہ پیالہ ٹوٹ جانے کے بعد ان کو پریشانی نہ ہو اور استعمال کے لیے ان کو پیالہ اور بھیج دیا۔

تیسرا جواب۔ امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ وَفِیْ اِسْنَادِ الْحَدِیْثِ مَقَالٌ کہ سند میں کلام ہے۔ نیز فرماتے ہیں کہ میں نے فقہاء میں سے کسی سے معلوم نہیں کیا کہ وہ کیلی اور موزونی چیزوں کے علاوہ کسی اور چیز میں مثل کے واجب ہونے کا قائل ہو۔ (معالم السنن ج ۵ ص ۲۰۱)

امام مالکؒ کے پاس اپنے نظریہ کے لیے کوئی نقلی دلیل نہیں ہے۔

قَوْلَہٗ قَالَ قَتَادَۃُ ثُمَّ نَسِیَ الْحَسَنُ

اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قتادہ نے یہ سمجھا کہ حضرت حسنؒ کے دونوں اقوال میں تعارض ہے پہلے فرمایا عَلَی الْیَدِ مَا اَخَذَتْ حَتّٰی تُؤَدِّیَ جو چیز ہاتھ نے لی اس کا ادا کرنا اس کے ذمہ ہے پھر فرمایا ھُوَ اَمِیْنُکَ لَا ضَمَانَ عَلَیْہِ وہ تیرا امین ہے اس پر ضمان نہیں ہے۔

علامہ انور شاہ صاحب العرف الشذی ص ۳۹۸ میں اور حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ قتادہ کو حضرت حسن کا قول سمجھنے میں غلطی لگی ہے حضرت حسن کے قول میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ اَلْعَارِیَۃُ مُؤَدَّاۃٌ اور عَلَی الْیَدِ مَا اَخَذَتْ کا مطلب یہ ہے کہ جب تک مستعار چیز موجود ہے اس کو بعینہ واپس کیا جائے گا مستعیر نہ تو اس کو روک سکتا ہے اور نہ ہی اس کو بدل سکتا ہے اور یہ اس چیز کے بقاء کو چاہتا ہے یعنی یہ اس وقت ہے جب کہ وہ مستعار چیز موجود ہو۔ اور اگر وہ ہلاک ہو جائے تو اس پر ضمان نہیں کیونکہ وہ ید امانت ہے نہ کہ ید ضمان۔ یعنی اس پر قبضہ ضمانتی نہیں بلکہ امانت کے لحاظ

سے ہے۔
تو حضرت حسن بصریؒ کی روایت ان کے فتویٰ کے خلاف نہیں ہے بلکہ دوسرا قول پہلے قول کی وضاحت ہے مگر حضرت قتادہؒ کو سمجھنے میں غلطی لگی ہے۔ (الکوکب الدری ص ۴۷۲ ج ۱)

بَابُ مَا جَآءَ فِي الِاحْتِكَارِ

(اشیاء کو سٹاک رکھنے کا بیان)

مولانا سہارنپوریؒ بذل المجہود ص ۲۷۲ ج ۵ میں فرماتے ہیں کہ اَلحَکر لغت میں جمع کرنے اور روک رکھنے کو کہتے ہیں اور حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ شرعاً احتکار کہتے ہیں کہ آدمی کے پاس ضرورت سے زائد طعام ہو اور لوگوں کو طعام کی ضرورت بھی ہو اور یہ آدمی صرف اس لیے طعام کو روکے رکھے کہ اس کا بھاؤ زیادہ ہو جائے تو پھر بیچوں گا تو اس کے اس روک رکھنے کو احتکار یعنی ذخیرہ اندوزی کہتے ہیں۔ (فتح الباری ص ۳۴۸ ج ۴)

اور علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ احتکار حکرہ سے ہے اور وہ روکنے کو کہتے ہیں اور اس سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کو بیچنے سے اس لیے روک رکھنا کہ قحط سالی میں مہنگے داموں بیچے گا۔ (العرف الشذی ص ۳۹۸)

کن کن چیزوں کا احتکار ممنوع ہے؟

اس بارہ میں ائمہ کرامؒ کے اقوال مختلف ہیں۔ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ امام احمدؒ کا نظریہ یہ ہے کہ صرف طعام میں احتکار ممنوع ہے۔ باقی چیزوں میں ممنوع نہیں ہے۔ (فتح الباری ص ۳۴۸ ج ۴) اور امیر یمانیؒ امام شافعی کا نظریہ یہ نقل کرتے ہیں کہ آدمیوں اور مویشیوں کی خوراک میں احتکار ممنوع ہے باقی چیزوں میں ممنوع نہیں ہے (سبل السلام ص ۸۲۵ ج ۳) اور صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کا نظریہ بھی یہی ہے جو امام شافعی کا ہے۔ (ہدایہ ص ۳۹۹ ج ۴)

اور مولانا محمد زکریا صاحب امام مالک کا نظریہ یہ نقل کرتے ہیں کہ جس چیز کی بھی لوگوں کو ضرورت ہو اس کی ذخیرہ اندوزی ممنوع ہے۔ (اوجز المسالک ص ۲۵۰ ج ۱۱) اور صاحب ہدایہ نے یہی نظریہ امام ابو یوسفؒ کا بتایا ہے ۔ اور امام مالکؒ سے ایک روایت یہ ہے کہ باقی ہر چیز میں ذخیرہ اندوزی ممنوع ہے پھلوں کی ذخیرہ اندوزی کرنے والا محتکر نہیں

ہے۔ (بذل المجہود ص ۲۷۲ ج ۵)

اور صاحب ہدایہؒ نے امام محمدؒ کا یہ نظریہ بتایا کہ ان کے نزدیک کپڑوں میں احتکار ممنوع نہیں ہے باقی چیزوں میں ممنوع ہے۔

اور مولانا سہارنپوریؒ نے امام حسن بصری اور امام اوزاعی کا نظریہ نقل کیا ہے کہ جو آدمی دوسرے شہر سے طعام خرید کرلایا پھر اسکے بھاؤ بڑھ جانے کا انتظار کرتا ہے تو ایسا آدمی ذخیرہ اندوز نہیں ہے اس لیے کہ ذخیرہ اندوز وہ ہے جو مسلمانوں کے بازار سے سمیٹ کر جمع کرلے۔ (بذل المجہود ص ۲۷۲ ج ۵)

اور صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ جو آدمی اپنی زمین کا غلہ سٹاک کرتا ہے اور اس کو بیچتا نہیں یا دوسرے شہر سے لے کر آیا ہے تو ایسا آدمی ذخیرہ اندوز نہیں ہو گا۔ (ہدایہ ص ۳۹۹ ج ۴) اور اسی طرح علامہ ابن حجرؒ نے امام مالکؒ سے نقل کیا ہے۔ (فتح الباری ۴ ص ۳۴۸) اس لیے کہ احتکار سے ممانعت کی شرط یہ ہے کہ ایسی چیز ہو جس میں دوسروں کا حق متعلق ہو چکا ہو جیسا کہ شہر میں جو سودا خرید وفروخت کے لیے پہنچ چکا ہو' اس کی ذخیرہ اندوزی کرنا اور اپنی زمین کے غلہ یا دوسرے شہر سے لائے جانے والے مال کے ساتھ اس شہر کے لوگوں کا حق متعلق نہیں اس لیے ان میں احتکار (ذخیرہ اندوزی) ممنوع نہیں ہے۔

امام مالکؒ اور امام ابو یوسفؒ کی پہلی دلیل

یہ حضرات علی الاطلاق احتکار کو ممنوع قرار دیتے ہیں ان کی دلیل مسلم شریف ج ۲ ص ۳۱' ترمذی ج ۱ ص ۲۳۹ وغیرہ کی روایت ہے جس میں یہ الفاظ ہیں لَا یَحْتَکِرَ اِلَّا خَاطِیٌٔ کہ ذخیرہ اندوزی صرف خطاکار ہی کرے گا۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی قید نہیں اس لیے علی الاطلاق احتکار ممنوع ہے۔

اس کا جواب

جمہور کی جانب سے اس کا جواب خود امام ترمذیؒ نے نقل کر دیا ہے کہ اس روایت کے راوی حضرت معمرؓ خود بعض چیزوں کا سٹاک کرتے تھے اور امیر یمانی سبل السلام ص ۸۲۵ ج ۳ میں امام ابن عبد البرؒ کا قول نقل کرتے ہیں کہ حضرت سعید اور حضرت معمرؓ زیت یعنی زیتون کا تیل سٹاک کرتے تھے۔

حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ جب حضرت سعید سے کسی نے کہا کہ آپ یہ روایت

بھی بیان کرتے ہیں اور خود شاک بھی کرتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ میرے استاد حضرت معمرؒ بھی شاک کیا کرتے تھے جو کہ صحابی اور عامل بالحدیث تھے تو اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز کا احتکار ممنوع نہیں ہے۔ (الکوکب الدری ص ۴۷۳ ج ۱)

دوسری دلیل اور اس کا جواب

دارمی ج ۲ ص ۲۹۵ اور مستدرک ج ۲ ص ۱۱ کی روایت ہے جس میں الفاظ ہیں اَلْمُحْتَکِرُ مَلْعُوْنٌ کہ ذخیرہ اندوزی کرنے والا ملعون ہے یہ حضرات کہتے ہیں کہ علی الاطلاق بیان کیا گیا ہے اس لیے احتکار ہر حال میں ممنوع ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے راوی حضرت سعید بن المسیبؒ اور حضرت معمرؒ ہیں لہٰذا جو مفہوم انہوں نے سمجھا وہی راجح ہے۔ نیز قاضی شوکانی فرماتے ہیں کہ اس روایت کی سند کو حافظ ابن حجرؒ نے ضعیف قرار دیا ہے (نیل الاوطار ج ۵ ص ۲۳۴)

امام احمدؒ کی دلیل

امام احمدؒ صرف طعام یعنی انسانی خوراک میں احتکار کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔ ان کی دلیلیں وہ روایات ہیں جن میں طعام کا ذکر ہے مثلاً ابن ماجہ ص ۱۵۷ کی روایت ہے مَنِ احْتَکَرَ عَلَی الْمُسْلِمِیْنَ طَعَامًا ضَرَبَهُ اللّٰهُ بِالْجُذَامِ وَالْاِفْلَاسِ جو شخص مسلمانوں کے طعام کی ذخیرہ اندوزی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر جذام (کوڑھ کی بیماری) اور افلاس (تنگ دستی) مسلط کر دیتا ہے۔ اور اسی طرح مسند احمد ج ۲ ص ۳۳ کی روایت ہے۔ مَنِ احْتَکَرَ طَعَامًا اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً فَقَدْ بَرِیَٔ مِنَ اللّٰهِ وَبَرِیَٔ اللّٰهُ مِنْهُ اور اسی مفہوم کی روایت مستدرک ج ۲ ص ۱۲ میں بھی ہے۔ یعنی جو شخص چالیس دن طعام کی ذخیرہ اندوزی اس لیے کرتا ہے کہ مہنگا ہو جائے تو ایسا شخص اللہ سے بری ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے بری ہے۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کی دلیل

اور امام ابو حنیفہ اور امام شافعیؒ نے انسانی خوراک کے ساتھ مویشیوں کی خوراک کو بھی ملایا ہے اور دونوں میں احتکار کو ممنوع قرار دیا ہے اس لیے کہ جس طرح انسانی جان کو ضائع کرنا درست نہیں اسی طرح کسی جانور کو بھی بھوکا پیاسا رکھنا درست نہیں ہے اور پھر ابوداؤد ج ۲ ص ۱۳۲ وغیرہ کی روایت میں ہے کہ حضرت سفیان ثوری سے کَبْسَ الْقَتِّ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کَانُوْا یَکْرَهُوْنَ الْحُکْرَةَ علماء ذخیرہ اندوزی کو اچھا

نہیں سمجھتے تھے۔ اور مولانا سہارنپوریؒ فرماتے ہیں کہ کَبْسُ الْقَتِّ جانوروں کے تازہ چارے کو کہتے ہیں تو یہ بھی ممنوع احتکار میں داخل ہے۔ (بذل المجہود ص ۲۷۳ ج ۵)

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ احتکار سے ممانعت کی حکمت عام لوگوں کو ضرر سے بچانا ہے اور علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر کسی آدمی نے خوراک کی ذخیرہ اندوزی کی اور علاقہ کے لوگوں کو طعام کی ضرورت ہو اور اس کے علاوہ کسی کے پاس خوراک نہ ہو تو ایسے شخص کو ذخیرہ اندوزی سے روکا جائے گا اور اس کو یہ مال بیچنے پر مجبور کیاجائیگا تاکہ عام لوگوں کو ضرر اور تکلیف سے بچایا جاسکے۔ (نووی شرح مسلم ص ۳۱ ج ۲)

اور اگر خوراک وافر مقدار میں موجود ہو اور لوگوں کو اس کے حصول میں کوئی دقت نہیں تو اگر کوئی آدمی طعام کا سٹاک کرتا ہے تو یہ ممنوع نہیں جیسا کہ روایات سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات کو سال بھر کا غلہ اکٹھا دے دیتے تھے۔

قَوْلُهٗ قَالَ ابْنُ الْمُبَارَكِ لَا بَأْسَ بِالْاِحْتِكَارِ فِي الْقُطْنِ وَالسِّخْتِيَانِ قطن کا معنے روئی اور سختیان سے مراد چمڑا ہے۔

کتنی مدت تک روکے رکھنا احتکار ہے

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ بعض حضرات نے اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا والی راویات کے پیش نظر چالیس دن کی مدت بتائی ہے اور بعض نے ایک مہینہ بتائی ہے اور فرماتے ہیں کہ یہ مدت دنیاوی سزا کے لیے ہے کہ اتنی مدت تک لوگوں کی تکلیف کے باوجود ذخیرہ اندوزی کرنے والا سزا کا مستحق ہوگا۔ رہا معاملہ اس کے گنہگار ہونے کا تو معمولی مدت کی وجہ سے بھی وہ گنہگار ہوگا۔ (ہدایہ ص ۳۹۹ ج ۴) اس لیے کہ کسی جاندار کو بلاوجہ ستانا کسی حال میں بھی گناہ سے خالی نہیں ہے۔

بَابُ مَا جَآءَ فِيْ بَيْعِ الْمُحَفَّلَاتِ

محفلہ مصراۃ ہی کو کہتے ہیں اور اس کی تفصیل باب المصراۃ میں پہلے گزر چکی ہے امام ترمذیؒ نے یہ باب دوبارہ کیوں قائم کیا ہے؟ امام ترمذیؒ نے شمائل ترمذی میں بَابُ مَا جَآءَ فِيْ عَيْشِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دو بار ذکر کیا ہے اسکے تحت شارحین میں سے بعض نے کہا کہ امام ترمذیؒ بھول گئے کہ پہلے بھی ایسا باب قائم کیا ہے اور بھول کر دوبارہ باب قائم کر دیا۔ بعض نے کہا کہ بھولے نہیں بلکہ خاص مصلحت کے تحت ایسا کیا ہے اور بعض نے

کہا کہ پہلے باب قائم کرنے کے بعد اس کے تحت جو احادیث اس وقت مستحضر تھیں وہ ذکر کر دیں بعد میں پھر اور احادیث یاد آگئیں تو ان کو نئے سرے سے باب باندھ کر ذکر کر دیا۔
اسی تفصیل کی روشنی میں یہاں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یا تو امام ترمذی پہلے قائم کردہ باب کو بھول گئے تھے اس لیے دوبارہ باب قائم کر دیا یا اس کے تحت جو حدیث ذکر کی ہے وہ پہلے باب کے ذکر کرنے کے وقت ذہن میں نہ تھی بعد میں یاد آئی۔ اور اسکا قرینہ موجود ہے اسلیے کہ باب المصراۃ میں حضرت ابوہریرۃؓ کی روایت ذکر کی ہے اور پھر فرمایا وَفِی الْبَابِ عَنْ اَنَسٍ وَرَجُلٍ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اور باب المحفلات میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے اور پھر فرمایا وفی الباب عن ابن مسعودؓ و ابی ہریرۃؓ تو پہلے باب میں ذکر کردہ روایات سے زائد روایات کا ذکر فرمایا ہے۔
اور ہو سکتا ہے کہ دوبارہ یہ باب خاص مصلحت کے تحت ذکر کیا ہو۔ یہ مصلحت بھی ہو سکتی ہے کہ بعض محدثین کرام مصراۃ کا عنوان قائم کرتے ہیں اور بعض محفلات کا۔ تو امام ترمذیؒ نے دونوں عنوانات قائم کیے اور پھر بتلا دیا کہ محفلہ مصراۃ ہی کو کہتے ہیں اور یہ مصلحت بھی ہو سکتی ہے کہ پہلے امام ترمذیؒ نے بَابَ الْمُصَرَّاۃِ میں جو روایت ذکر کی ہے اس میں خطاب مشتری کو ہے کہ مصراۃ خریدنے والے کو فرمایا کہ ایسی صورت میں ایسا کرنے کا حکم ہے اور باب المحفلات قائم کر کے بتایا کہ ایسا عمل نہیں کرنا چاہیے جس میں خطاب بائع کو ہے۔ واللہ اعلم۔

بَابُ مَا جَآءَ فِی الْیَمِیْنِ الْفَاجِرَۃِ یُقْتَطَعُ بِھَا مَالُ الْمُسْلِمِ
(جھوٹی قسم اٹھا کر کسی مسلمان کا مال لینے کا بیان)

جھوٹی قسم ویسے بھی جرم ہے اور جب اس کے ذریعہ سے کسی کا مال ضائع کرنا ہو تو یہ زیادہ جرم ہے۔

قَوْلُہٗ مَنْ حَلَفَ عَلٰی یَمِیْنٍ

مبارکپوری صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہاں یمین سے مراد وہ مال ہے جس پر قسم اٹھائی جائے۔ (تحفۃ الاحوذی ص ۲۵۴ ج ۲) اس لحاظ سے معنی یہ ہوگا کہ جس نے مال پر قسم اٹھائی۔

قَوْلُہٗ کَانَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ رَجُلٍ مِنَ الْیَھُوْدِ اَرْضٌ فَجَحَدَنِیْ

(مسلمان قاضی غیر مسلموں کا فیصلہ کیسے کرے؟)

حضرت اشعثؓ بن قیس فرماتے ہیں کہ میرا یہود کے ایک آدمی کے ساتھ زمین کا جھگڑا تھا اس نے میری زمین واپس کرنے سے انکار کر دیا تھا جب میں اس کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ نے مجھے فرمایا کہ تیرے پاس بینہ (گواہ) ہے (اس لیے کہ یہ مدعی تھے) تو میں نے کہا کہ نہیں تو آپ نے یہودی سے فرمایا کہ تو قسم اٹھا (اس لیے کہ وہ مدعا علیہ تھا) اس روایت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے متعلق فیصلہ جات بھی قاضی اپنے قانون کے مطابق کریں گے اور حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ دعویٰ کی صورت میں فیصلہ کا مدار بینہ یا قسم پر ہے خواہ فریقین مسلمان ہوں یا کافر۔ (الکوکب الدری ص ۳۷۳ ج ۱)

روایت پر اشکال اور اس کا جواب

مولانا سہارنپوریؒ علامہ ابن حجرؒ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ بعض روایات میں ہے کہ حضرت اشعث کا یہودی کے ساتھ جھگڑا کنویں کے بارہ میں تھا اور بعض روایات میں ہے کہ زمین کے بارہ میں تھا تو فرماتے ہیں کہ ان دونوں قسم کی روایات میں تطبیق یوں ہے کہ کنویں کی زمین کے بارہ میں جھگڑا تھا۔ اسی طرح بعض روایات میں ہے کہ حضرت اشعث نے کہا کہ ایک یہودی سے جھگڑا تھا اور بعض روایات میں ہے کہ اپنے چچا زاد سے جھگڑا تھا تو فرماتے ہیں کہ ان میں بھی کوئی تعارض نہیں اس لیے کہ یمن کے کچھ لوگ یہودی ہو چکے تھے تو ان میں سے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کر لیا اور کچھ اسی حالت پر باقی رہے (بذل المجہود ص ۲۱۷ ج ۵) تو ہو سکتا ہے کہ وہ یہودی حضرت اشعث کا چچا زاد ہو۔

ترمذی ج ۱ ص ۲۴۰ اور ابوداؤد ج ۲ ص ۱۵۴ کی روایت میں ہے کہ حضرت اشعث بن قیس الکندی مدعی تھے اور دوسرا آدمی مدعا علیہ تھا اور ابوداؤد ہی کی ایک روایت حضرت اشعث بن قیس سے ہے کہ حضرمی اور کندی کا جھگڑا حضور علیہ السلام کے پاس پیش ہوا اور حضرمی مدعی تھا تو مولانا سہارنپوری فرماتے ہیں کہ یہ دونوں واقعات علیحدہ علیحدہ ہیں اس لیے کہ ایک روایت میں صراحت ہے کہ مدعی حضرت اشعث کندی تھے اور دوسری روایت میں صراحت ہے کہ مدعی الحضرمی تھا۔ (بذل المجہود ص ۲۱۸ ج ۵)

بَابُ مَا جَآءَ اِذَا اخْتَلَفَ الْبَيِّعَانِ

(بائع اور مشتری کے اختلاف کی صورت میں کیا ہونا چاہیے؟)

بیعان سے مراد بائع اور مشتری ہیں (نیل الاوطار ص ۲۳۸ ج ۵)
یہاں چند ابحاث ہیں۔

البحث الاول۔ بائع اور مشتری کے درمیان کس قسم کے اختلاف کی صورت میں تحالف ہوگا؟

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ بائع اور مشتری کے درمیان اختلاف اگر مقدار مبیعہ یا مقدار ثمن کے بارہ میں ہو تو تحالف (یعنی ایک دوسرے سے قسم لینے) کا معاملہ ہو گا اگر اس کے علاوہ کسی اور چیز مثلا اجل یا شرط خیار وغیرہ میں ہو تو تحالف نہ ہو گا اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ بائع اور مشتری کے درمیان جس نوعیت کا اختلاف بھی ہوگا اس میں تحالف ہو گا۔ قاضی شوکانی فرماتے ہیں کہ یہاں روایت میں یہ واضح نہیں کیا گیا کہ کس معاملہ میں اختلاف ہو تو اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عام ہے خواہ اختلاف ثمن اور مبیعہ میں ہو یا کسی اور ایسے معاملہ میں ہو جو ثمن اور مبیعہ کی طرف لوٹتا ہو۔ (نیل الاوطار ص ۲۳۸ ج ۵)

امام صاحب کی دلیل

صاحب ہدایہؒ امام صاحبؒ کی جانب سے دلیل دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اجل یا شرط خیار وغیرہ میں اختلاف نہ تو معقود علیہ میں ہے اور نہ ہی معقود بہ میں اس لیے یہ اختلاف ایسے ہی ہے جیسا کہ ثمن کا کچھ حصہ معاف کر دینے یا بری کر دینے کا اختلاف ہے تو جیسے ان میں تحالف نہیں۔ اسی طرح اجل وغیرہ میں بھی تحالف نہیں۔ اور ہدایہ کے حاشیہ میں ہے کہ روایت کے الفاظ ہیں اِذَا اخْتَلَفَ الْمُتَبَايِعَانِ تو اس میں تحالف کو مُتَبَايِعَيْن کے اختلاف کے ساتھ معلق کیا گیا ہے اور مُتَبَايِعَيْن مشتق ہے بَیْعٌ سے تو تحالف کا وجوب اس وقت ہوگا جبکہ ان کا اختلاف ایسی چیز میں ہو جس کے ساتھ بیع ثابت ہوتی ہے اور وہ مبیعہ اور ثمن ہی ہیں تو گویا یوں کہا گیا کہ جب بائع اور مشتری مبیعہ اور ثمن میں اختلاف کریں تو تحالف ہوگا۔

امام شافعیؒ کی دلیل

امام شافعیؒ کی جانب سے ہدایہ کے حاشیہ میں دلیل دی گئی ہے کہ اجل میں اختلاف ایسے ہی ہے جیسا کہ ثمن کی مالیت میں اختلاف۔ اس لیے کہ ثمن موجل ثمن حالی سے کم درجہ ہوتا ہے تو اجل میں اختلاف وصف ثمن میں اختلاف ہوا لہٰذا اس میں تحالف ہوگا۔

اس کا جواب

اجل کو ثمن کی وصف نہیں بنایا جا سکتا اس لیے کہ ثمن بائع کا حق بنتا ہے جبکہ اجل مشتری کا حق بنتا ہے اگر اجل ثمن کا وصف ہوتا تو اپنے اصل کے تابع ہوتا اور اس کا فائدہ بائع کو پہنچتا حالانکہ اس کا فائدہ مشتری کو پہنچتا ہے اس لیے اجل کو ثمن کا وصف نہیں قرار دیا جا سکتا۔ (ہدایہ ص ۲۱۷ ج ۳ حاشیہ نمبر۱۔۲) علامہ ابن حزم فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں کے نزدیک متبایعان کے درمیان اختلاف کی صورت میں صرف بائع کا قول معتبر ہوگا اور ان کے درمیان تحالف نہ ہوگا اور یہ نظریہ ہے حضرت ابن مسعودؓ امام شعبیؒ اور امام احمدؒ کا اور ان کی دلیل حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت اشعث بن قیسؓ کے درمیان جھگڑے والی روایت ہے جس میں ہے اِذَا اخْتَلَفَ الْبَيِّعَانِ فَالْقَوْلُ مَا قَالَ الْبَائِعُ اَوْ يَتَرَادَّانِ الْبَيْعَ کہ جب بائع اور مشتری کے درمیان اختلاف ہو تو بائع کا قول معتبر ہوگا یا وہ دونوں بیع کو چھوڑ دیں۔ اس میں تحالف یعنی ایک دوسرے سے قسم لینے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ (المحلیٰ ج ۵ ص ۴۲۴) اور یہ روایت ابو داؤد ج ۲ ص ۱۴۰ میں بھی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب تفصیلی روایات میں تحالف کا ذکر موجود ہے تو ان کے مطابق عمل کیا جائے گا۔

البحث الثانی

اگر بائع اور مشتری کے درمیان مقدار مبیعہ یا ثمن میں اختلاف ہو اور مبیعہ موجود ہو تو اس اختلاف کے حل کی صاحب ہدایہ نے چار صورتیں بیان کی ہیں۔

۱۔ اگر اختلاف ثمن میں ہو کہ بائع کہتا ہے کہ ثمن زیادہ مقرر ہوا تھا اور مشتری کہتا ہے کہ ثمن اس سے کم مقرر ہوا تھا یا بائع کہتا ہے کہ مبیعہ اتنی مقدار میں متعین ہوا تھا اور مشتری اس سے زائد کا دعویٰ کرتا ہو تو ان میں سے جس نے بھی اپنے دعوی پر بینہ قائم کر دیا اس کے حق میں فیصلہ ہوگا۔ اس لیے کہ ہر ایک دعویدار ہے اور جس نے بھی اپنا دعویٰ بینہ کے ساتھ مبرہن کر دیا اس کا اعتبار نہ ہوگا۔

۲۔ اگر اختلاف ثمن یا مقدار مبیعہ میں ہو اور بائع اور مشتری میں سے ہر ایک نے بینہ قائم

کر دیا تو جس کا بینہ زیادتی کو ثابت کرے گا وہ معتبر ہوگا مثلاً مقدار ثمن میں بائع زیادتی کا دعویدار ہے تو اس کا بینہ معتبر ہوگا اور مقدار مبیعہ میں مشتری زیادتی کا دعویدار ہے تو اس کا بینہ معتبر ہوگا۔

۳۔ اگر دونوں میں سے کسی کے پاس بینہ نہ ہو تو مشتری سے کہا جائے گا کہ بائع کے بتائے ہوئے ثمن پر راضی ہو جا ورنہ بیع کو فسخ کر دیا جائے گا اور بائع سے کہا جائیگا کہ مشتری کے بتائے ہوئے مقدار مبیعہ پر راضی ہو جا ورنہ بیع کو فسخ کر دیا جائے گا اس لیے کہ مقصود جھگڑے کو ختم کرنا ہے۔ اگر یہ آپس میں راضی ہو جائیں تو ٹھیک ورنہ حاکم ان دونوں میں سے ہر ایک سے دوسرے کے دعوی کے خلاف قسم لے گا اگر دونوں نے قسم اٹھالی تو قاضی ان کے درمیان بیع کو فسخ کر دے گا۔ اور اگر ان دونوں میں سے کوئی قسم اٹھانے سے انکار کرے تو دوسرے کے قول کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔ اور تحالف اس صورت میں جبکہ مشتری نے مبیعہ پر قبضہ نہ کیا ہو تو یہ قیاس کے موافق ہے اس لیے کہ بائع ثمن میں زیادتی کا دعویدار ہے اور مشتری اس سے انکاری ہے اسی طرح مشتری مقدار مبیعہ جو اس کے ذمہ واجب تھی اس کو بائع کے حوالے کر دینے کا دعویدار ہے اور بائع اس کا منکر ہے (کہ جتنی مقدار ذمہ میں تھی، وہ پوری مجھے نہیں ملی) تو ان میں سے ہر ایک منکر ہے اس لیے ہر ایک سے قسم لی جائے گی۔

اور جب مشتری نے مبیعہ پر قبضہ کر لیا ہو اور پھر مقدار ثمن میں اختلاف ہو تو اس صورت میں تحالف خلاف القیاس ہے اس لیے کہ اس صورت میں مشتری کسی چیز کا دعویدار نہیں اس لیے کہ اس نے مبیعہ لے لیا ہوا ہے اور بائع کا ثمن میں زیادتی کا دعوی باقی ہے اور مشتری اس سے انکاری ہے تو قیاس کے مطابق صرف مشتری سے قسم لینی چاہیے مگر چونکہ روایت میں دونوں سے قسم لینے کا ذکر ہے اس لیے قیاس کو ترک کر دیا گیا۔

۴۔ اگر اختلاف مقدار مبیعہ اور مقدار ثمن دونوں میں ہو مثلاً بائع کہتا ہے کہ ثمن دس روپے مقرر ہوا تھا اور مشتری کہتا ہے کہ آٹھ روپے مقرر ہوا تھا اور اسی معاملہ میں مشتری کہتا ہے کہ مبیعہ ڈیڑھ کلو مقرر ہوا تھا اور بائع کہتا ہے کہ ایک کلو مقرر ہوا تھا اور دونوں نے اپنے اپنے دعویٰ پر بینہ قائم کر دیا تو ثمن کے معاملہ میں بائع کا اور مبیعہ کے معاملہ میں مشتری کا بینہ معتبر ہوگا۔ (ہدایہ ص ۱۷۱۔ ۱۷۲ ج ۳)

البحث الثالث

اگر بائع اور مشتری کے درمیان اختلاف اس وقت ہوا جبکہ مبیعہ موجود نہ ہو بلکہ ہلاک ہو چکا ہو تو اس کے حل میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ ایسی صورت میں مشتری کا قول مَعَ یَمِیْنِہٖ معتبر ہوگا۔ یعنی مشتری اپنے قول کو قسم اٹھا کر پختہ کرے تو اس کا اعتبار ہوگا۔ امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ یہی نظریہ ہے امام اوزاعیؒ، سفیان ثوریؒ اور امام نخعیؒ کا۔ (معالم السنن ص ۱۴۳ ج ۵)

اور امام شافعیؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ خواہ مبیعہ موجود ہو یا ہلاک ہو چکا ہو ہر صورت میں بائع کا قول مع یمینہ معتبر ہوگا۔ پھر اس کے بعد اگر راضی ہو گئے تو بہتر ورنہ بیع کو فسخ کر دیں گے۔

امام ابو حنیفہؒ کا نظریہ اور دلیل

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ جب مشتری مبیعہ پر قبضہ کر لے اور پھر بائع کے ساتھ مقدار ثمن کے بارہ میں اختلاف ہو تو قیاس یہ چاہتا ہے کہ صرف مشتری سے قسم لی جائے اس لیے کہ مشتری بائع کے خلاف کسی چیز کا دعویدار نہیں اور بائع ثمن میں زیادتی کا دعوے دار ہے اور مشتری اس سے انکار کر رہا ہے تو قیاس کے مطابق صرف مشتری سے قسم لینی چاہیے مگر چونکہ روایت موجود ہے کہ اِذَا اخْتَلَفَ الْبَيِّعَانِ وَالسِّلْعَةُ قَائِمَةٌ وَلَا بَيِّنَةَ لِاَحَدِهِمَا تَحَالَفَا جب بائع اور مشتری کے درمیان اختلاف ہو اور مبیعہ موجود ہو اور ان دونوں میں سے کسی کے پاس بینہ نہ ہو تو دونوں قسم اٹھائیں گے تو اس روایت کی وجہ سے سودا موجود ہونے کی حالت میں قیاس کو ترک کر دیا گیا اور قاعدہ یہ ہے جو حکم خلاف القیاس ثابت ہو اس کو اپنے مورد پر بند رکھا جاتا ہے اس پر کسی اور کو قیاس نہیں کرتے تو جب روایت میں وَالسِّلْعَةُ قَائِمَةٌ کے الفاظ ہیں تو اس حکم کو اسی کے ساتھ رکھیں گے اور جب مبیعہ موجود نہ ہو بلکہ ہلاک ہو چکا ہو تو اس حالت کو اس پر قیاس نہیں کر سکتے اور اس والا حکم اس میں ثابت نہیں کر سکتے۔ (ہدایہ ص ۱۷۲ ج ۳) اور یہ روایت دارمی ج ۲ ص ۱۲۶ میں یوں ہے۔ اَلْبَيِّعَانِ اِذَا اخْتَلَفَا وَالْمَبِيْعُ قَائِمٌ بِعَيْنِهٖ وَلَيْسَ بَيْنَهُمَا بَيِّنَةٌ فَالْقَوْلُ مَا قَالَ الْبَائِعُ اَوْ يَتَرَادَّانِ الْبَيْعَ کہ بائع اور مشتری جب باہمی اختلاف کریں اور مبیعہ بعینہٖ موجود ہو اور ان میں سے کسی کے پاس بینہ نہ ہو تو بائع کی بات معتبر ہوگی یا پھر بیع کو رد کر دیں گے۔ اور اسی مفہوم کی روایت ابن ماجہ ص ۱۵۹ اور دار قطنی ج ۳ ص ۲۱ میں بھی ہے

مگر ان روایات میں تحَالَفَا نہیں بلکہ فَالقَولُ مَا قَالَ البَائِعُ کے الفاظ ہیں۔

اعتراض

قاضی شوکانی نیل الاوطار ص ۲۳۸ ج ۵ میں فرماتے ہیں کہ امام خطابی نے (معالم السنن ص ۱۴۳ ج ۵) میں کہا ہے کہ والسلعۃ قائمۃ کے الفاظ نقل کے لحاظ سے صحیح نہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ الفاظ تَغلِیبًا ذکر کر دیے ہوں اس لیے کہ اکثر جھگڑا اسی صورت میں ہوتا ہے جبکہ مبیعہ موجود ہو۔

جواب

انوار المحمود ص ۳۴۷ ج ۲ میں ہے کہ بعض روایات میں وَالسِّلعَۃُ قَائِمَۃٌ کے الفاظ ہیں اور بعض روایات میں وَالمُبتَاعُ بِالخِیَارِ کے الفاظ ہیں اور بعض روایات میں اَو یَتَرَادَّانِ کے الفاظ ہیں تو ان کا مفہوم ایک ہی ہے اگرچہ ان کی اسانید میں کلام ہے مگر مجموعی طور پر یہ حسن درجہ کی ہیں اور ان سے احتجاج درست ہے۔
باقی امام خطابیؒ کا یہ کہنا کہ یہ ہو سکتا ہے کہ وَالسِّلعَۃُ قَائِمَۃٌ کے الفاظ تَغلِیبًا کہہ دیئے ہوں تو یہ محض خیال ہے' اس کو دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔

امام شافعیؒ کی پہلی دلیل

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے جس میں یہ الفاظ ہیں اِذَا اختَلَفَ البَیِّعَانِ فَالقَولُ قَولُ البَائِعِ وَالمُبتَاعُ بِالخِیَارِ (ترمذی ج ۱ ص ۲۴۰) فرماتے ہیں کہ اس میں حکم علی الاطلاق ہے خواہ مبیعہ قائم ہو یا ہلاک ہو چکا ہو ہر حال میں حکم ایک ہی ہوگا۔

اس کا پہلا جواب

خود امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ روایت مرسل ہے (اور ایسی مرسل روایت تو شوافع کے نزدیک حجت نہیں ہوتی)

دوسرا جواب

دارمی ج ۲ ص ۱۶۶' ابن ماجہ ص ۱۵۹ اور ابوداؤد شریف ج ۲ ص ۱۴۰ میں روایت ہے جس میں وَیَتَرَادَّانِ البَیعَ کے الفاظ ہیں کہ پھر وہ آپس میں سودا ایک دوسرے پر رد کر دیں اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ مبیعہ موجود ہو اور ان روایات میں وَالمَبِیعُ قَائِمٌ

بِعَيْنِهٖ کے الفاظ بھی موجود ہیں۔

تیسرا جواب

ترمذی شریف کی یہ روایت مطلق ہے اور دارمی وغیرہ کی روایت مقید ہے جس میں الفاظ ہیں وَالسِّلْعَةَ قَائِمَةٌ کہ مبیع موجود ہو اور قاعدہ ہے کہ اگر مطلق اور مقید دونوں ایک ہی حادثہ اور ایک ہی حکم میں ہوں تو مطلق کو مقید پر محمول کیا جاتا ہے اور یہاں ایک ہی حادثہ ہے لہٰذا مطلق کو مقید پر محمول کریں گے اور شوافع حضرات کے نزدیک تو ہر حالت میں مطلق کو مقید پر محمول کیا جاتا ہے تو یہاں بھی محمول کر کے یہ مفہوم لیا جائیگا کہ مبیعہ موجود ہو تو اختلاف میں مسئلہ کے حل کی یہ صورت ہوگی۔ اور امام ابوداوٗدؒ نے تو باب ہی اس طرح قائم کیا ہے بَابُ اِذَا اخْتَلَفَ الْبَيِّعَانِ وَالْمَبِيْعُ قَائِمٌ (ابوداوٗد ج ۲ ص ۱۳۹) تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ صورت مبیعہ کے موجود ہونے کی صورت میں ہے۔

احناف پر اعتراض

دار قطنی ج ۳ ص ۲۱ کی روایت میں ہے اِذَا اخْتَلَفَ الْبَيِّعَانِ وَالْمَبِيْعُ مُسْتَهْلَكٌ فَالْقَوْلُ قَوْلُ الْبَائِعِ۔ کہ جب بائع اور مشتری میں اختلاف ہو جائے اور مبیعہ موجود نہ ہو تو بائع کا قول معتبر ہے اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں بائع کا قول معتبر ہے جبکہ احناف اس صورت میں مشتری کا قول معتبر قرار دیتے ہیں۔

اس کا جواب

امیر یمانیؒ فرماتے ہیں وَاَمَّا رِوَايَةُ وَالْمَبِيْعُ مُسْتَهْلَكٌ فَهِيَ ضَعِيْفَةٌ (سبل السلام ص ۴۷) یعنی یہ روایت ضعیف ہے۔ اور قاضی شوکانی فرماتے ہیں کہ اس روایت کا راوی ابو وائل اس روایت میں متفرد ہے اور جب وہ متفرد ہو تو اس کی روایت قابل احتجاج نہیں وَعَلٰى هٰذَا فَلَا يُقْبَلُ مَا تَفَرَّدَ بِهٖ اَبُوْ وَائِلٍ الْمَذْكُوْرُ (نیل الاوطار ص ۲۳۸ ج ۵) یعنی جس ابو وائل کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے متفرد ہونے کی وجہ سے یہ روایت قبول نہیں کی جا سکتی۔

امام شافعیؒ کی دوسری دلیل

مسند احمد ج ۱ ص ۴۶۶ اور نسائی ج ۲ ص ۲۲۹ میں روایت ہے کہ حضرت ابو عبیدہؓ کے پاس دو آدمی اپنا جھگڑا لے کر آئے اور اور ان کا ثمن کے بارہ میں جھگڑا تھا تو حضرت ابو عبیدہؓ

نے فرمایا کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے پاس اسی قسم کا معاملہ پیش ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ میری موجودگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جیسے معاملہ کا فیصلہ فرمایا تھا اور وہ اس طرح کے بائع کے بارہ میں فرمایا کہ اس کو قسم دی جائے پھر مشتری کو خیار ہے کہ چاہے لے لے یا چھوڑ دے۔

اس کا جواب

قاضی شوکانیؒ نے اس روایت کو مجروح قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو نیل الاوطار ص ۲۳۷ ج ۵)

احناف پر اعتراض

امام خطابیؒ احناف کا نظریہ ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں وَيُقَالُ اَنَّ هٰذَا خِلَافُ الْاِجْمَاعِ مَعَ مُخَالِفَةِ الْحَدِيْثِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ (معالم السنن ص ۱۴۵ ج ۵) کہا جاتا ہے کہ یہ نظریہ حدیث کے مخالف ہونے کے ساتھ ساتھ اجماع کے بھی خلاف ہے۔

اس کا جواب

جب اس مسئلہ میں امام ابو حنیفہؒ کے ساتھ امام اوزاعیؒ، امام نخعیؒ، سفیان ثوری اور ایک روایت کے مطابق امام مالکؒ اور ایک روایت کے مطابق امام احمدؒ (عینی شرح ہدایہ ص ۴۴۰ ج ۳) بھی ہیں تو امام ابو حنیفہؒ کا نظریہ خلاف اجماع کیسے ہو گیا؟ باقی رہا مخالفت حدیث کا الزام تو قاضی شوکانیؒ نے فرمایا ہے فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَمْ يَذْهَبْ اِلَى الْعَمَلِ بِهٖ فِيْ جَمِيْعِ صُوَرِ الْاِخْتِلَافِ اَحَدٌ فِيْمَا اَعْلَمُ (نیل الاوطار ص ۲۳۹ ج ۵) کہ میری معلومات کے مطابق اختلاف کی تمام صورتوں میں اس حدیث کے مطابق کسی کا عمل نہیں ہے۔ تو جب بعض صورتوں میں دوسرے فقیہ حضرات کی جانب سے بھی مخالفت پائی جاتی ہے تو صرف احناف پر کیوں طعن کیا جاتا ہے اور احناف صرف اس صورت میں اختلاف کرتے ہیں جن میں مسلمہ اصول کی خلاف ورزی ہوتی ہے اس لیے کہ مسلمہ اصول ہے اَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِيْ وَالْيَمِيْنُ عَلٰى مَنْ اَنْكَرَ تو سودا موجود نہ ہونے کی صورت میں منکر صرف مشتری ہے تو قسم بھی صرف اسی سے لی جائیگی۔ اور اصول کو پیش نظر رکھ کر حدیث کا مفہوم متعین کرنے کو حدیث کی مخالفت نہیں کہتے۔

بَابُ مَا جَآءَ فِیْ بَیْعِ فَضْلِ الْمَاءِ
(زائد پانی بیچنے کے بارے میں)

اہل ظاہر کے نزدیک پانی کا بیچنا بالکل جائز نہیں ہے جیسا کہ علامہ ابن حزمؒ نے لکھا ہے کہ پانی کا بیچنا کسی صورت میں جائز نہیں ہے البتہ آدمی اگر کنواں بیچے یا وہ برتن بیچے جس میں پانی ہے تو تبعاً اس کا بیچنا جائز ہوگا۔ (محلی ص ۸ ج ۶)

اور مولانا ظفر احمد عثمانی فرماتے ہیں قَالَ الْاِمَامُ اَبُوْ یُوْسُفَ فِی الْخِرَاجِ لَہٗ لَا بَأْسَ بِبَیْعِ الْمَاءِ اِذَا کَانَ فِی الْاَوْعِیَۃِ (اعلاء السنن ص ۴۰ ج ۱۴) کہ امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں فرمایا ہے کہ جب پانی کسی نے برتن میں محفوظ کیا گیا ہو تو اس کو بیچنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اور علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ پانی کی تین اقسام ہیں ایک وہ پانی جس میں کسی آدمی کا دخل نہ ہو جیسا کہ جاری نہر وغیرہ تو اس میں ہر ایک کا حق ہے خود بھی پی سکتا ہے جانوروں کو بھی پلا سکتا ہے اور اگر اس پر پن چکی وغیرہ لگانا چاہے تو لگا سکتا ہے۔ دوسرا وہ پانی جو ایک جماعت نے مشترکہ طور پر محنت کر کے نہر وغیرہ کھودی ہو تو یہ پانی ہر آدمی خود بھی پی سکتا ہے اور جانوروں کو بھی پلا سکتا ہے مگر اس جماعت کی مرضی کے بغیر زمین کو سیراب نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی اس پر پن چکی وغیرہ بنا سکتا ہے۔

اور تیسرا وہ پانی جو برتنوں میں محفوظ ہو تو اس سے صرف ضرورت کے وقت آدمی پی سکتا ہے اگر آدمی انتہائی پیاس میں ہو اور اس پانی کے علاوہ کوئی اور پانی مہیا نہ ہو اور جس کے پاس پانی ہے وہ اس کو پینے سے روکتا ہے تو یہ آدمی اس سے لڑ کر بھی پانی لے سکتا ہے۔ اور پینے کے علاوہ کسی اور ضرورت کے لیے یہ پانی لینے کے لیے مالک کی اجازت ضروری ہے اس لیے کہ وہ برتن میں محفوظ ہونے کی وجہ سے اس کی ملکیت ہے۔ (العرف الشذی ص ۳۹۸)

مجبور آدمی کے لیے پانی لینے کے لیے حضرت ابن عمرؓ کا فرمان ہے کہ جب ان سے کہا گیا کہ لوگوں نے ہم کو پانی سے روک لیا اور قریب تھا کہ ہم میں سے کچھ لوگ پیاس کی وجہ سے ہلاک ہو جاتے تو انہوں نے فرمایا ھَلَّا وَضَعْتُمْ فِیْھِمُ السَّیْفَ کہ تم نے ان پر تلوار کیوں نہ چلائی۔

قَوْلُہٗ لَا یُمْنَعُ فَضْلُ الْمَاءِ لِیُمْنَعَ بِہِ الْکَلَأُ

زائد پانی کو نہ روکا جائے تاکہ گھاس میں کمی نہ ہو۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس بیع فضل الماء سے مراد یہ ہے کہ کسی انسان کا مملوکہ کنواں ہو اور اس میں پانی ہو اور اس کی حاجت سے زائد ہو اور اس کے آس پاس ارض موات یعنی ایسی زمین ہے جو کسی کی ملکیت نہیں اور اس میں گھاس وغیرہ ہو مگر پانی نہ ہو تو یہ کنویں والا اپنی ضرورت سے زائد پانی نہ بیچے بلکہ اس گھاس چرانے والوں کو روکے نہیں کہ وہ اپنے جانوروں کو وہ پانی پلائیں اور اگر یہ روکے گا تو اس صورت میں جانوروں کو نقصان ہے اس لیے کہ پانی کے بغیر ان لوگوں کا اپنے جانوروں کو چرانا مشکل ہے۔ (شرح مسلم ص ۱۸ ج ۲) اور علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں وَاِلٰی ھٰذَا التَّفْسِیْرِ ذَھَبَ الْجَمْھُوْرُ (فتح الباری ص ۳۲۹ ج ۵) کہ جمہور یہی تفسیر کرتے ہیں۔

اور مولانا ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ پانی کو جب تک برتن میں محفوظ نہ کیا ہو اس وقت تک پانی کسی کی ملکیت نہیں ہوتا بے شک کنواں یا حوض اس کی ملکیت ہو جس میں پانی ہے۔ (اعلاء السنن ص ۱۹۰ ج ۱۴)

اہل ظاہر کے نزدیک پانی بیچنے کی ممانعت حرام درجہ کی ہے جیسا کہ علامہ ابن حزم نے لکھا ہے اور علامہ ابن حجر فرماتے ہیں قَالَ الْخَطَّابِیْ وَالنَّھْیُ عِنْدَ الْجَمْھُوْرِ لِلتَّنْزِیْہِ (فتح الباری ص ۳۲۹ ج ۵) کہ امام خطابیؒ نے فرمایا کہ جمہور کے نزدیک اس میں نہی تنزیہی ہے۔ اہل ظاہر کے جواب میں کہا گیا ہے کہ جب پانی برتن میں محفوظ ہو تو وہ اس کی ملکیت ہے اور جیسے دیگر مملوکہ چیزوں کا بیچنا جائز ہے تو اس کا بیچنا بھی جائز ہوگا۔ اور پھر وہ روایت بھی ہے کہ حضور علیہ السلام جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو میٹھے پانی کا کنواں بئر رومہ ایک یہودی کے قبضہ میں تھا تو آپ نے فرمایا جو اس کو خرید کر مسلمانوں پر وقف کر دے گا اس کو اللہ تعالیٰ جنت عطا فرمائیں گے تو حضرت عثمانؓ نے وہ کنواں خرید کر وقف کر دیا۔ (ترمذی ج ۲ ص ۲۱۱) تو جب اس کا خریدنا جائز ہے تو بیچنا بھی جائز ہوگا۔

بَابُ مَا جَاءَ فِیْ کَرَاھِیَۃِ عَسْبِ الْفَحْلِ

(اجرت لے کر نر جانور جفتی کے لیے دینے کی ممانعت کا بیان)

قَوْلُہٗ عَسْبَ الْفَحْلِ۔ قاضی شوکانی نیل الاوطار ص ۱۵۵ ص ج ۵ میں اور علامہ ابن حجرؒ فتح الباری ص ۳۶۸ ج ۵ میں فرماتے ہیں کہ عسب عین کا فتحہ اور سین کے سکون کے

ساتھ ہے اور اس کو عَسِیب بھی کہا جاتا ہے اور اَلفَحل نر جانور کو کہتے ہیں۔ عَسبَ الفَحل کا معنے بعض حضرات نے کیا کہ ثمن ماء الفحل کہ نر جانور جفتی کے وقت جو پانی مادہ جانور میں پھینکتا ہے اس پانی کی قیمت لینا۔ اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ نر جانور جفتی کے لیے دیا جائے تو اس کے جماع کی اجرت کو عسب الفحل کہا جاتا ہے۔ علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے اس میں اسی دوسرے معنیٰ کو اختیار کیا ہے اور اس کی تائید وہ حدیث کرتی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں نَهٰى عَنْ بَيْعِ ضِرَابِ الْجَمَلِ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کے جماع کی بیع سے منع فرمایا ہے۔

اور مبارکپوریؒ صاحب تحفۃ الاحوذی ص ۲۵۶ ج ۲ میں فرماتے ہیں وَوَجْهُ الْحَدِيثِ اَنَّهٗ نَهٰى عَنْ كِرَاءِ عَسْبِ الْفَحْلِ فَحَذَفَ الْمُضَافَ وَهُوَ كَثِيرٌ فِي الْكَلَامِ یعنی عسب الفحل میں الفحل کا مضاف کراء محذوف ہے اور مضاف کا محذوف ہونا کلام میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ تو اس لحاظ سے اصل عبارت ہو گی كَرَاهِيَةُ كِرَاءِ عَسْبِ الْفَحْلِ کہ نر جانور جفتی کے لیے کرایہ پر دینا مکروہ ہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ نر جانور کو کرایہ پر دینے کو ہی عسب کہا جاتا ہے تو اس لحاظ سے مضاف محذوف ماننے کی ضرورت نہ ہو گی۔

اور امام نووی شرح مسلم ص ۱۹ ج ۲ میں فرماتے ہیں کہ وَنَهٰى عَنْ ضِرَابِ الْجَمَلِ کا معنے یہ ہے نَهٰى عَنْ اُجْرَةِ ضِرَابِهٖ یعنی اس نر جانور کے جفتی کرنے کی اجرت لینے سے منع فرمایا ہے نیز امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جفتی کے لیے نر جانور کرایہ پر دینا حرام ہے اور اگر اس کی اجرت مقرر کر لی گئی ہو تو وہ لازم نہیں ہوتی اور اس میں ممانعت کی وجہ علامہ ابن حجر فتح الباری ص ۳۶۸ ج ۵ میں اور قاضی شوکانی نیل الاوطار ص ۱۵۵ ج ۵ میں فرماتے ہیں کہ نر جانور کا وہ پانی غیر متقوم ہے نیز غیر متقوم ہونے کے ساتھ ساتھ غیر معلوم بھی ہے اور بائع کو مشتری کے حوالہ کرنے کی قدرت بھی نہیں۔ اور جس بیع میں ایسی علتیں پائی جائیں وہ بیع ممنوع ہے۔

امام خطابی معالم السنن ص ۷۶ ج ۵ میں فرماتے ہیں کہ حرمت کا قول اکثر فقہاء کا ہے۔ ایک روایت کے مطابق امام شافعی، امام احمد اور امام مالک، حسن بصری اور ابن سیرین فرماتے ہیں کہ اگر ایک معلوم مدت کے لیے نر جانور کرایہ پر جفتی کے لیے دیا جائے تو جائز ہے اس لیے کہ اس میں ضرورت بھی ہے اور فائدہ بھی کہ اس سے آگے نسل باقی رہتی ہے ان حضرات نے نہی کو کراہت تنزیہی پر محمول کیا ہے۔

قاضی شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ بعض حضرات نے ضِرَابَ الْفَحْلِ کو تَلْقِيْحَ النَّخْلِ پر قیاس کر کے اس کو بھی جائز قرار دیا ہے یعنی جس طرح کھجور کے مادہ خوشوں پر نر خوشے عوض لے کر ڈالنا جائز ہے تو اسی طرح نر جانور جفتی کے لیے عوض لے کر دینا بھی جائز ہے) مگر قاضی شوکانی فرماتے ہیں کہ یہ قیاس درست نہیں ہے اس لیے کہ تَلْقِيْحَ النَّخْلِ کی تسلیم پر بائع کو قدرت حاصل ہے جبکہ ماء الفحل کی تسلیم پر وہ قادر نہیں ہے (نیل الاوطار ص ۱۵۶ ج ۵)

علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں وَاَمَّا عَارِيَةُ ذَالِكَ فَلَا خِلَافَ فِيْ جَوَازِهٖ (فتح الباری ص ۳۶۸ ج ۵) یعنی نر جانور جفتی کے لیے عاریتاً" (بلا اجرت) دینے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اَلْكَرَامَةُ کا معنی اور حکم

قَوْلُهٗ وَقَدْ رَخَّصَ قَوْمٌ فِيْ قُبُوْلِ الْكَرَامَةِ عَلٰى ذَالِكَ۔ اور ایک جماعت نے اس میں کرامۃ کو قبول کرنے کی اجازت دی ہے۔ اور کرامۃ سے مراد یہ ہے کہ اگر کسی نے نر جانور عاریۃ کسی دوسرے کو دیا اور اس کا کوئی عوض مقرر نہیں کیا اور دوسرا آدمی اپنی جانب سے خوشی کے ساتھ کوئی ہدیہ نر جانور کے مالک تو دیتا ہے تو اس کو کرامۃ کہتے ہیں اور یہ جائز ہے اور اس کی دلیل ترمذی شریف ج ۱ ص ۲۴۰ کی روایت ہے جس میں الفاظ ہیں فَرَخَّصَ لَهٗ فِي الْكَرَامَةِ کہ مقرر کیے بغیر ہدیہ کو لینے کی اجازت اس کو دی۔ حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ الکرامۃ کا قبول کرنا اس وقت جائز ہے جبکہ کسی علاقہ یا کسی قوم میں یہ عادتاً" نہ ہو اگر یہ کسی علاقہ یا کسی قوم کے ہاں معروف ہو تو یہ مشروط کی طرح ہو جائے گا اور ناجائز ہوگا۔ (الکوکب الدری ص ۳۷۵ ج ۱) قَوْلُهٗ اِنَّا نُطْرِقُ الْفَحْلَ فَنُكْرَمُ مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اطراق کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو نر جانور جفتی کے لیے عَارِيَةً دینا۔ اور الکرامۃ کا مطلب یہ ہے کہ ہدیہ کے طور پر کوئی چیز دینا جو کہ معاوضہ کے طور پر نہ ہو۔ (تحفۃ الاحوذی ص ۲۵۶ ج ۲) اس لحاظ سے اس جملہ کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نر جانور جفتی کے لیے دیتے ہیں تو ہدیہ قبول کر لیتے ہیں جو کہ طے نہیں ہوتا۔

بَابُ مَا جَآءَ فِيْ ثَمَنِ الْكَلْبِ

(بیچے گئے کتے کی قیمت کے بارہ میں)

کس قسم کے کتے کی خرید و فروخت ہو سکتی ہے؟

مبارکپوری صاحبؒ علامہ طیبیؒ سے نقل کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جس کتے میں منفعت ہو اس کی بیع جائز ہے اور اگر کسی نے وہ کتا ہلاک کر دیا تو ہلاک کرنے والے پر اس کی قیمت واجب ہو گی اور امام مالکؒ سے اس بارہ میں تین روایات ہیں ایک روایت کے مطابق وہ امام ابو حنیفہؒ کے ساتھ ہیں اور ایک روایت میں جمہور کے ساتھ ہیں کہ کتے کی بیع بالکل درست نہیں ہے اور ایک روایت میں ان کا نظریہ یہ ہے کہ اس کی بیع تو درست نہیں مگر اس کو ضائع کرنے والے پر اس کی قیمت واجب ہو گی (تحفۃ الاحوذی ص ۲۵۷ ج ۲) امام نووی فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ایسا کتا جس میں منفعت ہو اس کی بیع جائز ہے اور اگر کسی نے ضائع کر دیا تو اس کی قیمت واجب ہوگی۔ اور امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ کتے کی بیع مطلقاً ممنوع ہے اور اس کا ثمن حرام ہے۔ اور امام مالکؒ سے اس بارہ میں تین روایات ہیں اور امام ابراہیم النخعی کے نزدیک شکاری کتے کی بیع جائز ہے۔ (نووی شرح مسلم ص ۱۹ ج ۲)

امام ابراہیم النخعیؒ کا نظریہ اور دلیل

امام ابراہیم النخعیؒ فرماتے ہیں کہ شکاری کتے کی خرید وفروخت جائز ہے اور ان کی دلیل نسائی ج ۲ ص ۲۳۰ وغیرہ کی روایت ہے جو حضرت جابرؓ سے ہے جس میں یہ الفاظ ہیں نَهٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلّی اللہ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ وَالسِّنَّوْرِ اِلَّا كَلْبَ صَيْدٍ اور ایک روایت میں اِلَّا الْكَلْبَ الْمُعَلَّمَ (مسند احمد ج ۳ ص ۳۱۷) کے الفاظ ہیں۔

شوافع حضرات کا نظریہ اور پہلی دلیل

شوافع حضرات کے نزدیک ہر قسم کے کتے کی بیع ممنوع ہے اور ان کی پہلی دلیل وہ روایات ہیں جن میں نَهٰى عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ کے الفاظ ہیں جیسا کہ ابو داؤد ج ۲ ص ۱۳۶ اور ترمذی ج ۱ ص ۲۴۰ اور وہ راویات جن میں ثَمَنُ الْكَلْبِ خَبِيْثٌ کے الفاظ ہیں جیسا کہ ترمذی ج ۱ ص ۲۴۰ اور ابو داؤد ج ۲ ص ۱۳۰ میں ہے۔

اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ امام طحاوی ج ۲ ص ۱۸۸ فرماتے ہیں کہ نہی کی روایات اس وقت کی ہیں جبکہ کتے سے نفرت دلانا مقصود تھا اور جب بعد میں اس کے ذریعہ سے شکار وغیرہ کی اجازت دے دی گئی تو نہی کا حکم منسوخ ہو گیا۔

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ نہی سے کراہت تنزیہی مراد ہے اور خَبِيْثٌ سے لَيْسَ بِطَيِّبٍ

یعنی مکروہ مراد ہے اور اس کا قرینہ اسی روایت میں موجود ہے کہ فرمایا کَسْبُ الْحَجَّامِ خَبِیْثٌ کہ حجام کی کمائی خبیث ہے اس میں خبیث سے بالاتفاق حرمت مراد نہیں ہے جیسا کہ قاضی شوکانی کسب الحجام کی بحث میں لکھتے ہیں کہ کسب الحجام میں نہی کو تنزیہ پر محمول کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حجام کو اجرت دی تھی اگر یہ حرام ہوتی تو آپ ہرگز نہ دیتے۔ (نیل الاوطار ص ۳۰۱ ج ۵)

اور تیسرا جواب یہ ہے کہ امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عمروؓ نے ایسے آدمی پر قیمت واجب کی تھی جس نے دوسرے کے قیمتی کتے کو قتل کر دیا تھا اگر یہ حرام ہوتا تو حضرت عبد اللہ بن عمروؓ ایسا ہرگز نہ کرتے۔ (طحاوی ج ۲ ص ۱۸۸)

شوافع حضرات کی دوسری دلیل اور اس کا جواب

شوافع حضرات کی طرف سے وہ روایت بھی پیش کی جاتی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں نَهٰی عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ وَاِنْ كَانَ ضَارِيًا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے کے ثمن سے منع فرمایا ہے اگرچہ شکاری کتا ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ علامہ ابن حجر نے اس روایت کو نقل کر کے کہا ہے وَسَنَدُهٗ ضَعِيْفٌ قَالَ اَبُوْ حَاتِمٍ هُوَ مُنْكَرٌ یعنی اس کی سند کمزور ہے اور ابو حاتم نے کہا کہ یہ منکر روایت ہے۔ (فتح الباری ص ۳۳۱ ج ۵)

نیز علامہ ابن حجرؒ امام قرطبیؒ سے نقل کرتے ہیں کہ جب کتے کو رکھنے کی اجازت ہے تو اس کی بیع باقی مبیعات کی طرح ہو گی مگر شریعت نے چونکہ اس سے منع کیا ہے اس لیے اس میں کراہت تنزیہی ہو گی اس لیے کہ لَيْسَ مِنْ مَكَارِمِ الْاَخْلَاقِ یہ اعلیٰ اخلاق میں سے نہیں ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے نظریہ پر دلائل ان جوابات کے ضمن میں واضح ہو جاتے ہیں جو فریق مخالف کو دیے گئے ہیں۔

قَوْلُهٗ قَالَ كَسْبُ الْحَجَّامِ خَبِيْثٌ

حجام سے مراد وہ ہے جو منہ میں نالی لگا کر دوسرے کا خون نکالتا ہے۔ قاضی شوکانی فرماتے ہیں کہ جمہور کا نظریہ یہ ہے کہ حجام کی کمائی حلال ہے اور انہوں نے نہی کو کراہت تنزیہی پر محمول کیا ہے اس لیے کہ حجام کی کمائی میں دناءت یعنی حقارت ہے اور اللہ تعالیٰ

بلند امور کو پسند فرماتا ہے۔ نیل الاوطار ص ۳۰۱ ج ۵) اور مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک حجام کی کمائی حلال ہے چونکہ یہ گھٹیا کسب ہے اس لیے اس بارہ میں زجر کو کراہت تنزیہی پر محمول کرتے ہیں (تحفۃ الاحوذی ص ۲۵۷ ج ۲)

اور امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ نہی کا حکم منسوخ ہے اور ناسخ وہ روایت ہے جس میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خود حجام کو اجرت دی۔ علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ حجام کی کمائی پسندیدہ نہیں ہے اور یہ فعل مروت کے خلاف ہے۔ (العرف الشذی ص ۳۹۹)

امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ غلام کے لیے یہ کسب جائز ہے اور آزاد کے لیے ناجائز ہے اس لیے کہ حضور علیہ السلام نے غلام کو اجرت دی تھی۔

احناف کے نزدیک یہ کسب جائز ہے اس لیے کہ حضور علیہ السلام نے خود اس کی اجرت دی تھی جیسا کہ بخاری ج ۱ ص ۲۸۳ اور مسلم ج ۲ ص ۲۲ وغیرہ میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے اگر یہ کسب جائز نہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا نہ کرتے اور امام ترمذیؒ نے بَابُ مَا جَاءَ فِی کَسْبِ الْحَجَّامِ کے تحت ایک روایت نقل کی ہے جس میں الفاظ ہیں فَلَمْ یَزَلْ یَسْأَلُہٗ وَیَسْتَاذِنُہٗ حَتّٰی قَالَ اَعْلِفْہُ نَاضِحَکَ وَاَطْعِمْہُ رَقِیْقَکَ کہ آپؐ سے اس کی اجازت طلب کرنے میں اصرار کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ اجرت لے کر اپنے اونٹ کو چارہ ڈال دے یا اپنے غلام کو کھانا کھلا دے تو اس روایت سے بھی جواز ثابت ہوتا ہے اس لیے کہ حرام کا تو وصول کرنا ہی درست نہیں جبکہ آپؐ نے جانور کو چارہ ڈالنے یا غلام کو کھانا کھلانے کی اجازت دی ہے۔

قَوْلُہٗ مَھْرَ الْبَغِیِّ خَبِیْثٌ

اگر کوئی عورت زنا کی اجرت لیتی ہے تو اس کی یہ کمائی حرام ہے اور یہاں اس کو مجازاً" مہر کہا گیا ہے اگر ایسی عورت کوئی جائز کام بھی کرتی ہے مثلاً لوگوں کے گھروں میں برتن وغیرہ دھو کر یا کپڑے سی کر اجرت حاصل کرتی ہے تو اس کی یہ کمائی جائز ہے اور اس مال سے اس کا صدقہ کرنا بھی جائز ہے علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام ابوداؤدؒ نے حضرت رفاعہ بن رافعؓ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے جس میں الفاظ ہیں نَھٰی عَنْ کَسْبِ الْاَمَۃِ اِلَّا مَا عَمِلَتْ بِیَدِھَا وَقَالَ ھٰکَذَا بِیَدِہٖ نَحْوَ الْغَزْلِ وَالنَّفْشِ یعنی لونڈی کی کمائی سے منع فرمایا ہاں وہ کمائی جائز ہے جو وہ سوت کات کر یا اون درست کر کے یا اس کے علاوہ کوئی اور کام

ہاتھ سے کر کے اس کی مزدوری لے۔ اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ لونڈی کی کمائی ہر قسم کی ممنوع ہے اور اس سے مقصد یہ ہے کہ لونڈی پر اس کا مالک یومیہ خراج نہ مقرر کر دے تاکہ اس کے حصول کے لیے وہ حرام کاری کو ہی ذریعہ نہ بنا لے اور یہ سَدًّا لِلذَّرَائِعِ کے طور پر ہے۔ (فتح الباری ص ۳۳۲ ج ۵)

قَوْلُهٗ وَحُلْوَانِ الْکَاهِنِ

کاہن اس کو کہتے ہیں جو غیب کی خبریں بتانے کا دعویدار ہو ایسے آدمی کے پاس غیب کی خبریں معلوم کرنے کے لیے جانا حرام ہے اور اس کی جو اجرت وہ لیتا ہے وہ بھی حرام ہے۔

بَابُ مَا جَآءَ فِیْ کَرَاهِیَةِ ثَمَنِ الْکَلْبِ وَالسِّنَّوْرِ

(کتے اور بلی کی قیمت کے مکروہ ہونے کا بیان)

قاضی شوکانی فرماتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک بلی کا بیچنا جائز ہے اور حضرت ابو ہریرہؓ طاؤس اور مجاہد کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ (نیل الاوطار ص ۱۵۴ ج ۵)

امام نووی فرماتے ہیں کہ جس روایت میں ثَمَنَ السِّنَّوْرَ سے منع کیا گیا ہے وہ یا تو ایسی بلی ہے جو نفع دینے والی نہ ہو یا اس میں ممانعت کراہت تنزیہی پر محمول ہے تاکہ لوگ بلی ایک دوسرے کو فائدہ اٹھانے کے لیے مفت عاریتاً دیتے رہیں۔ (نووی شرح مسلم ص ۲۰ ج ۲)

جو حضرات بلی کی بیع اور اس کے ثمن کو جائز قرار نہیں دیتے وہ اس حدیث سے دلیل پکڑتے ہیں جو حضرت جابرؓ سے ہے جس میں یہ الفاظ ہیں نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ثَمَنِ الْکَلْبِ وَالسِّنَّوْرِ (ترمذی ج ۱ ص ۲۴۱)

اس کا جواب یہ ہے کہ خود امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ اس روایت میں اضطراب ہے۔ اور قاضی شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ جمہور اس روایت کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ روایت ضعیف ہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس میں نہی کراہت تنزیہی پر محمول ہے (نیل الاوطار ج ۵ ص ۱۵۴)

اور دوسری روایت جس میں الفاظ ہیں نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَکْلِ الْهِرِّ وَثَمَنِهٖ یعنی نبی کریم ﷺ نے بلی اور اس کی قیمت کھانے سے منع فرمایا ہے۔ تو

اس کے بارہ میں امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ اس میں ایک راوی عمر بن زید ہے اور اس سے صرف عبد الرزاق روایت کرتے ہیں اور کوئی بڑا محدث روایت نہیں کرتا اس لیے یہ روایت غریب ہے۔

امام خطابی فرماتے ہیں کہ بیع سے ممانعت اس لیے ہے تاکہ لوگ اس کو مملوک نہ بنا لیں اور ہر ایک اس سے فائدہ اٹھاتا رہے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ وحشی جانوروں کی طرح ہے جیسے دیگر وحشی جانوروں کی بیع درست نہیں اسی طرح اس کی بیع بھی درست نہیں۔ اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ وحشی بلی کی بیع درست نہیں اور گھریلو بلی کی بیع جائز ہے۔ (معالم السنن ص ۱۳۵ ج ۵)

بَابٌ (شکاری کتے کی بیع کا جواز)

امام ترمذیؒ نے بَابٌ کہا اور کوئی عنوان قائم نہیں کیا مگر تحت الباب روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کلب صید یعنی شکاری کتے کی بیع کا جواز ہے۔

اس باب میں امام ترمذیؒ نے ایک روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے کی ہے جس میں الفاظ ہیں قال نَهٰی عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ اِلَّا كَلْبَ الصَّيْدِ مگر اس پر جرح کی ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں اس لیے کہ اس کا راوی ابو المھزم جس کا نام یزید بن سفیان ہے اس پر امام شعبہؒ نے جرح کی ہے۔

اس کے جواب میں مولانا ظفر احمد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت کرنے میں ابو المھزم متفرد نہیں بلکہ ولید اور مثنی نے اس کی متابعت کی ہے اور یہ اسناد ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اس مفہوم کو مضبوط کر دیتی ہیں۔ (اعلاء السنن ص ۳۲۵ ج ۱۴) اور امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ اس قسم کی روایت حضرت جابرؓ سے بھی مروی ہے اور اس کی سند بھی صحیح نہیں ہے۔

اس کے جواب میں مولانا ظفر احمد صاحب فرماتے ہیں کہ امام نسائی نے اس روایت کو منکر کہا ہے مگر ان کا اس کو منکر قرار دینا درست نہیں۔ اور اس روایت کو مرفوع بیان کرنے میں حجاج متفرد نہیں بلکہ الهيثم بن جميل عن حماد اور اسی طرح الحسن بن ابی جعفر اس کے متابع موجود ہیں اور ان کی روایات دار قطنی میں ہیں (اعلاء السنن ص ۳۲۴ ج ۱۴)

بَابُ مَا جَاءَ فِی کَرَاهِیَۃِ بَیْعِ الْمُغَنِّیَاتِ
(گانے بجانے والی لونڈیوں کی بیع کے مکروہ ہونے کا بیان)

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ گانے بجانے والی عورتیں یا نوحہ کرنے والی عورتوں کا ان افعال پر اجرت لینا حرام ہے اس پر اجماع ہے۔ اور مسلم شریف کے علاوہ حدیث کی بعض کتابوں میں جو یہ روایت ہے کہ نَھٰی عَنْ کَسْبِ الْاِمَاءِ کہ آپؐ نے لونڈیوں کی کمائی سے منع فرمایا تو اس سے بھی زنا اور اس کے مشابہ کسب مراد ہے مطلقاً اس کی کمائی مراد نہیں ہے اس لیے کہ اس کے سوت کاتنے یا کپڑے سینے وغیرہ کی اجرت بالاتفاق جائز ہے۔ (نووی شرح مسلم ص ۱۹ ج ۲)

قَوْلُہٗ قَالَ لَا تَبِیْعُوا الْقَیْنَاتِ

اَلْقَیْنَاتُ قَیْنَۃٌ کی جمع ہے۔

مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ قینہ مطلق لونڈی کو کہتے ہیں خواہ گانے بجانے والی ہو یا نہ ہو اور التورپشتیؒ نے فرمایا کہ یہاں حدیث میں قینہ سے مراد مغنیہ یعنی گانے بجانے والی ہے (تحفہ الاحوذی ص ۲۵۹ ج ۲) اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ قَیْنَۃ گانے بجانے والی عورت کو کہتے ہیں۔ (اشعۃ اللمعات ج ۳ ص ۱۰)

قَوْلُہٗ وَثَمَنُھُنَّ حَرَامٌ

ثمن سے مراد یا تو ان کے گانے بجانے کی اجرت ہے اور یہ بالاتفاق حرام ہے یا اس سے مراد یہ ہے کہ اس لونڈی کو خریدنے والے نے گانے بجانے کے لیے ہی خریدا تو آلہ معصیت ہونے کی وجہ سے اس کا ثمن حرام ہوگا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حرام تشدیداً فرمایا ہو اور اس سے مراد کراہت تنزیہی ہو اس لیے کہ اس کا تحفظ مالک کے لیے دشوار ہوگا اور ہو سکتا ہے کہ وہ لونڈی اس فعل سے باز نہ آئے تو اس کو خریدنے سے ہی منع فرما دیا۔

بَابُ مَا جَاءَ فِی کَرَاهِیَۃِ اَنْ یُّفَرَّقَ بَیْنَ الْاَخَوَیْنِ اَوْ بَیْنَ الْوَالِدَۃِ وَوَلَدِھَا فِی الْبَیْعِ
(بیع میں دو بھائیوں یا ماں بیٹے میں تفریق ڈالنے کی کراہت کا بیان)

یہاں تین بحثیں ہیں۔

البحث الاول

قاضی شوکانی فرماتے ہیں کہ احناف کے نزدیک دو چھوٹے غلام ہوں یا ان میں سے ایک چھوٹا اور ایک بڑا ہو تو ان کے درمیان قرابتداری خواہ کیسی بھی ہو ان کے درمیان جدائی ڈالنا ممنوع ہے والدہ اور اس کے بچے کے درمیان اور دو بھائیوں کے درمیان جدائی ڈالنے سے ممانعت پر روایات موجود ہیں اور باقی قرابت داروں کو ان پر قیاس کرتے ہوئے حکم لگائیں گے۔ (نیل الاوطار ص ۱۷۲ ج ۵) اور حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ مجتہدین نے ان احادیث سے یہ استنباط کیا ہے کہ ممانعت کی وجہ قرابت مطلقہ ہے ماں بیٹے کا رشتہ ہونے کے ساتھ یہ مخصوص نہیں ہے اور اس میں وجہ رحم کھانا ہے اور یہ ان کے چھوٹے ہونے ہی کی وجہ سے ہو سکتا ہے اور اگر بڑے ہوں تو ان میں تفریق ڈالنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (الکوکب الدری ص ۳۷۶ ج ۱)

اور مبارکپوری صاحب امام شافعیؒ کا نظریہ یہ نقل کرتے ہیں کہ اگر غلاموں کو دار حرب سے دارالاسلام کی جانب قید کر کے لا گیا ہو تو ایسی حالت میں ایسے دو غلاموں کو جن کے درمیان قرابتداری ہو ان کو جدا جدا بیچنا ممنوع ہے اور جو دارالاسلام ہی میں پیدا ہوئے تو ان کو جدا جدا بیچنا ممنوع نہیں ہے۔ (تحفہ الاحوذی ص ۲۵۹ ج ۲) اور بعض شوافع نے کہا ہے کہ ماں بیٹے، باپ بیٹے اور دو بھائیوں کے درمیان تفریق ممنوع ہے باقی قرابتداروں میں ممنوع نہیں ہے۔

اور امام ترمذیؒ نے امام ابراہیم النخعیؒ کا یہ نظریہ بتایا ہے کہ اگر ماں بیٹا دونوں کسی ایک کی ملکیت میں ہوں اور ماں اپنے بیٹے یا بیٹی کو اپنے سے علیحدہ بیچنے کی مالک کو اجازت دے دے تو جائز ہے۔

قاضی شوکانی فرماتے ہیں کہ بعض فقہاء نے کہا ہے کہ باپ اور بیٹے کو جدا جدا بیچنا ممنوع نہیں ہے (نیل الاوطار ص ۱۷۲ ج ۵) مگر یہ نظریہ درست نہیں ہے اس لیے کہ جس طرح کی قرابتداری ماں بیٹے کے درمیان ہے اسی طرح باپ بیٹے کے درمیان ہے تو اس کو بھی اس پر قیاس کریں گے نیز قاضی شوکانی نے ابن ماجہ اور دار قطنی کے حوالہ سے حضرت ابو موسیٰؓ کی روایت نقل کی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں لَعَنَ رَسُوْلَ اللّٰہ صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ فَرَّقَ بَیْنَ الْوَالِدِ وَ وَلدہ وَ بَیْنَ الاَخِ وَاَخِیْہِ اس سے بھی ممانعت ثابت ہوتی

ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر لعنت فرمائی ہے جو والد اور اس کے بیٹے اور دو بھائیوں کے درمیان تفریق ڈالتا ہے قاضی شوکانی اس روایت کے بارہ میں فرماتے ہیں وَحَدِیْثُ اَبِیْ مُوْسٰی اِسْنَادُہٗ لَابَأْسَ بِہٖ (نیل الاوطار ص ۱۷۱ ج ۵) یعنی اس حدیث کی سند میں کوئی خرابی نہیں ہے۔

مبارکپوری صاحب قاضی شوکانی سے نقل کرتے ہیں کہ ان چھوٹے دو غلاموں یا ایک چھوٹے ایک بڑے کے درمیان تفریق خواہ بیع کی وجہ سے ہو یا کسی اور وجہ سے ہو ہر حال میں ممنوع ہے۔ ہاں اگر کوئی ایسی صورت ہو جس میں تفریق ڈالنے والا مجبور ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں (تحفۃ الاحوذی ص ۲۴۰ ج ۲) اور اس کی مثال یوں سمجھیں کہ ایک آدمی کی ملکیت میں دو غلام ہیں جو آپس میں قرابت دار ہیں ان میں ایک چھوٹا اور ایک بڑا ہو اور وہ مالک مر جائے اور یہ غلام ورثاء میں تقسیم کر دیے جائیں تو ایسی صورت میں ان کے درمیان تفریق کی وجہ سے کوئی حرج نہیں ہے۔

البحث الثانی

جن دو غلاموں کے درمیان تفریق سے منع کیا گیا ہے' اگر ان میں سے کسی ایک کو بیچ دیا جائے یا دونوں کو جدا جدا مالکوں پر بیچ دیا جائے تو کیا یہ بیع جائز ہوگی یا نہیں؟ قاضی شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ایسی بیع مع الکراہت درست ہوگی اور امام شافعیؒ کے اس بارہ میں دو قول ہیں۔ ایک قول کے مطابق بیع درست ہوگی اور ایک قول کے مطابق درست نہ ہوگی (نیل الاوطار ج ۵ ص ۱۷۲)

امام شافعیؒ کی دلیل حضرت علیؓ کی روایت ہے جو ترمذی ج ۱ ص ۲۴۱ وغیرہ میں ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام نے مجھے دو غلام دیے جو آپس میں بھائی تھے تو ان میں سے ایک کو میں نے بیچ دیا تو آپ ﷺ نے مجھ سے پوچھا کہ تو نے اپنے غلام کے ساتھ کیا کیا؟ تو میں نے آپ کو بتایا کہ میں نے بیچ دیا ہے تو آپ نے فرمایا رُدَّہٗ رُدَّہٗ اس کو واپس لے' اس کو واپس لے۔ فرماتے ہیں کہ اگر بیع جائز ہوتی تو آپ واپس لینے کا نہ فرماتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ نے کراہت سے بچنے کے لیے رد کا حکم فرمایا یا ان غلاموں پر ترس کی وجہ سے ایسا فرمایا تو یہ امر ترحم کے لیے ہے نہ کہ وجوب کے لیے۔

البحث الثالث

کتنی عمر کے قرابت دار غلاموں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ممنوع ہے؟ مبارک

پوری صاحب امام شافعیؒ کا نظریہ لکھتے ہیں کہ جب وہ سات یا آٹھ سال کے ہو جائیں تو اس کے بعد کوئی حرج نہیں۔ امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ جب بچہ اپنے باپ سے مستغنی ہو جائے یعنی خود کو سنبھال سکے تو اس کے بعد کوئی حرج نہیں۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ جب بچے کے دانت نکل آئیں تو اس کے بعد کوئی حرج نہیں۔ اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ بالغ ہونے تک تفریق ممنوع ہے اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ بالغ بھی ہو جائیں تو تب بھی ان کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ پھر مبارک پوری صاحب آگے لکھتے ہیں کہ بالغ ہونے کے بعد جدائی ڈالنے کے جواز میں حضرت سلمہؓ بن اکوع کی روایت ہے جو مسند احمد، مسلم اور ابو داؤد میں ہے۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۲۵۹، ۲۶۰)

بَابُ مَا جَآءَ فِي مَنْ يَشْتَرِي الْعَبْدَ وَيَسْتَغِلُّهُ ثُمَّ يَجِدُ بِهِ عَيْبًا

علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ مالک اپنے غلام پر جو یومیہ مقرر کرتا ہے کہ اتنا ہر روز کما کر مجھے لا کر دے تو اس کو ضریبہ کہتے ہیں اور اسی کو خراج اور غلہ کہا جاتا ہے۔ (فتح الباری ج ۴ ص ۴۵۸) اس لحاظ سے عنوان کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر کوئی آدمی کسی سے غلام خریدتا ہے اور اس کو کام پر لگا کر اس کی کمائی حاصل کرتا ہے اور پھر اس کے بعد معلوم ہوا کہ اس غلام میں ایسا عیب پایا جاتا ہے جو بائع کے ہاں تھا تو کیا اس غلام کو مشتری واپس کر سکتا ہے یا نہیں اور اگر واپس کرے تو کیا اس کے ذریعہ سے جو کمائی حاصل کی ہے، وہ بھی بائع کو واپس کرے گا یا صرف غلام ہی واپس کرے گا۔ ایسی صورت میں بالاتفاق غلام کو بائع پر رد کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے جو غلہ حاصل ہوا ہے، وہ مشتری کا ہوگا۔ غلام یا لونڈی کے ذریعہ سے کمائی کے علاوہ اگر مبیعہ میں کوئی اضافہ مشتری کے ہاں ہو گیا مثلاً لونڈی یا جانور نے بچہ دے دیا یا درخت پر پھل لگا تھا، وہ مشتری نے استعمال کر لیا تو اس میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے۔ اس کی تفصیل کرتے ہوئے مبارک پوری صاحب شرح السنہ سے نقل کرتے ہیں کہ امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ مشتری کے قبضہ میں آنے کے بعد مبیعہ میں جو بھی اضافہ ہوا، خواہ جانور یا لونڈی نے بچہ دیا ہو یا جانور کا دودھ دوہا گیا ہو یا اس کی اون اتاری گئی ہو یا درخت پر لگا ہوا پھل حاصل کیا ہو تو ہر صورت میں یہ اضافہ مشتری کا ہوگا اور بائع کو عیب کی وجہ سے صرف اصل مبیعہ ہی مشتری واپس کرے گا۔

اور احناف کہتے ہیں کہ اگر مشتری کے قبضہ میں مبیعہ جانور یا لونڈی نے بچہ دیا یا درخت پر پھل لگ گیا تو ایسی صورت میں مبیعہ میں عیب معلوم کرنے کی وجہ سے مبیعہ کو

بائع پر رد نہیں کیا جا سکتا بلکہ عیب کی وجہ سے اس مبیعہ کی جو قیمت کم بنتی ہے' وہ بائع سے واپس لے گا (مثلاً اگر مبیعہ میں وہ عیب نہ ہو تو اس کی قیمت دس درہم بنتی ہے اور اس عیب کی صورت میں اس کی قیمت چھ درہم بنتی ہے تو بائع نے اس سے چار درہم زائد لیے ہیں' مشتری وہ واپس لے' مبیعہ کو رد نہیں کر سکتا) اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر مبیعہ نے بچہ دیا ہو تو وہ بچہ اپنی ماں کے ساتھ واپس کیا جائے گا اور اگر اس کی اون اتاری ہو تو اون کو واپس نہیں کیا جائے گا اس لیے کہ وہ مشتری کے لیے ہوگی اور مبیعہ رد کیا جائے گا۔

اور اگر لونڈی خریدی جو مشتری کے پاس آنے سے پہلے ثیبہ تھی اور مشتری کے قبضہ میں آنے کے بعد اس لونڈی سے وطی بالشبہ کی گئی اور اس کا مہر لیا گیا اور اس کے بعد معلوم ہوا کہ اس لونڈی میں عیب ہے جو بائع کے ہاں پایا جاتا تھا تو اس لونڈی کو مشتری واپس کرے گا اور وطی بالشبہ کی وجہ سے اس کا جو مہر حاصل ہوا ہے' وہ مشتری کا ہوگا اس لیے کہ لونڈی اس وقت اس کی ضمان میں ہے۔ اور اگر اس نے خود اس لونڈی کے ساتھ وطی کی ہو تو بھی اس لونڈی کو واپس کر سکتا ہے اور وطی کرنے کی وجہ سے اس پر کچھ لازم نہیں آتا اس لیے کہ اس وقت لونڈی اس کی ضمان میں ہے۔ اور اگر لونڈی باکرہ ہو اور مشتری کے قبضہ میں آنے کے بعد مشتری نے خود اس کے ساتھ وطی کر کے اس کو ثیبہ کر دیا یا اس لونڈی کے ساتھ وطی بالشبہ کی گئی اور وہ لونڈی ثیبہ ہو گئی اور اس کے بعد معلوم ہوا کہ اس لونڈی میں عیب ہے جو بائع کے ہاں بھی اس میں پایا جاتا تھا تو ایسی صورت میں مشتری اس لونڈی کو واپس نہیں کر سکتا بلکہ اس عیب کی وجہ سے اس کی قیمت جو کم بنتی ہے' وہ بائع سے واپس لے گا۔ اس صورت میں واپس اس لیے نہیں کر سکتا کہ زوال بکارت کی وجہ سے اس میں ایسا نقص پیدا ہو گیا ہے جو مشتری کے ہاں ہوا ہے اور اس نقص کے ساتھ لونڈی کو واپس نہیں کر سکتا اور یہی قول ہے امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کا (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۲۴۰) اور اسی کے مثل مولانا سہارنپوریؒ نے امام خطابیؒ سے نقل کیا ہے (بذل المجہود ج ۵ ص ۲۸۹) اور احناف کے نزدیک اگر مشتری نے لونڈی کے ساتھ وطی کر لی تو اس کو واپس نہیں کر سکتا بلکہ اس میں جو عیب معلوم کیا ہے' اس کی تلافی بائع سے کرائے اور جتنی قیمت کم بنتی ہے' وہ واپس لے۔ اس کی دلیل وہ روایت ہے جو کتاب الاثار لمحمد ص ۱۴۳ میں ہے کہ حضرت علیؓ سے ایسی لونڈی کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا لَا یَسْتَطِیْعُ رَدَّھَا وَلٰکِنَّہٗ یَرْجِعُ بِنُقْصَانِ الْعَیْبِ کہ مشتری اس کو واپس نہیں کر سکتا۔ ہاں عیب کی وجہ سے جو نقصان ہوا

ہے' وہ بائع سے لے سکتا ہے۔ اس طرح کی روایت امام بیہقیؒ نے اپنی سنن میں بھی نقل کی ہے مگر وہ مرسل ہے اس لیے کہ علی بن حسین نے حضرت علیؓ کو نہیں پایا اور ایک روایت میں علی بن حسین عن حسین بن علی کا واسطہ موجود ہے اور اس طرح روایت مرسل نہیں رہتی مگر اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ روایت محفوظ نہیں ہے۔ مولانا ظفر احمد صاحب فرماتے ہیں کہ مرسل روایت کے ساتھ جب موصول مل جائے خواہ ضعیف سند سے ہی کیوں نہ ہو' یہ سب کے نزدیک حجت ہوتی ہے۔ (اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۱۰۱) اس لحاظ سے اس روایت کو دلیل بنایا جا سکتا ہے۔

اور امام خطابی احناف' شوافع اور مالکیہ کا یہی نظریہ نقل کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ احناف کے مطابق نظریہ ہے امام سفیان ثوریؒ اور اسحاق بن راہویہؒ کا۔ اور امام ابن ابی لیلی فرماتے ہیں کہ اس لونڈی کو بھی واپس کرے اور اس کے ساتھ اس کا مہر مثل بھی واپس کرے۔ نیز لکھتے ہیں کہ اصحاب الرائے (یعنی احناف) کے نزدیک اگر مبیعہ کے ذریعہ سے کمائی کی ہو تو جیسے اس صورت میں اس کمائی کو بائع پر رد نہیں کیا جاتا' اسی طرح اگر غاصب نے مغصوبہ چیز کے ذریعہ سے کمائی حاصل کی ہو تو غاصب پر بھی اس کمائی کا رد لازم نہیں آتا۔ صرف مغصوبہ چیز کو واپس کرے گا اور انہوں نے حدیث اَلْخَرَاجُ بِالضَّمَانِ اور اس کے عموم کو دلیل بنایا ہے۔ پھر اس کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ قیاس درست نہیں ہے اس لیے کہ یہ حدیث بیع کے بارے میں آئی ہے اور بیع میں عقد متعاقدین کی رضا سے ہوتا ہے جبکہ غصب میں متعاقدین کی رضا نہیں ہوتی۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ یہ حدیث فی نفسہ قوی نہیں ہے اس لیے اس کو بیوع کے معاملہ میں ہی موقوف رکھیں گے اور اسی میں احتیاط ہے (معالم السنن ج ۵ ص ۱۵۹' ۱۶۰)

مولانا محمد صدیق نجیب آبادی علامہ ابن الہمام کی فتح القدیر سے نقل کرتے ہیں کہ مبیعہ میں اضافہ کی چار صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) اِضَافَةٌ مُتَّصِلَةٌ مُتَوَلِّدَةٌ مِنَ الْمَبِيعِ یعنی وہ اضافہ جو مبیعہ سے ہی پیدا ہوا ہو اور اس مبیعہ کے ساتھ متصل ہو جیسا کہ مبیعہ کا موٹا ہو جانا اور پہلے کی بہ نسبت خوبصورت ہو جانا۔ غلام اور لونڈی پہلے جاہل تھے' پھر ان کا علم سے آراستہ ہو جانا وغیرہ۔ تو ایسی صورت میں اگر اس اضافہ کے بعد اس مبیعہ میں عیب کا علم ہوا کہ یہ ایسا عیب ہے جو بائع کے ہاں پایا جاتا تھا تو مبیعہ بائع کو واپس کیا جائے گا اور یہ اضافہ اصل کے تابع ہوگا اور مسئلہ کی یہ

صورت بالاتفاق ہے۔

(۲) اِضَافَۃٌ مُتَّصِلَۃٌ غَیْرُ مُتَوَلِّدَۃٍ مِنَ الْمَبِیْعِ یعنی ایسا اضافہ جو مبیع سے پیدا نہ ہوا ہو بلکہ مشتری نے اس میں اضافہ کیا اور یہ اضافہ مبیع کے ساتھ متصل ہو جیسا کہ بائع نے سفید کپڑا مشتری کو دیا اور مشتری نے اس کو سرخ رنگ کر دیا پھر اس کے بعد معلوم ہوا کہ اس کپڑے میں ایسا عیب تھا جو بائع کے ہاں تھا۔ اسی طرح ستو بائع سے لیے اور مشتری نے اس میں گھی ملا دیا یا کپڑا لیا اور اس کو سی دیا یا درخت لیا اور اس کو گاڑ دیا' گندم لی اور اس کو آٹا بنا دیا وغیرہ تو ان صورتوں میں جمہور کے نزدیک عیب کی وجہ سے مبیع رد نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ بائع اس حالت میں لینے اور مشتری دینے پر راضی بھی ہو جائے تب بھی رد درست نہیں ہے اس لیے کہ ربا (سود) پایا جاتا ہے اور ربا سے شریعت نے منع کیا ہے اور شریعت کا حق مقدم ہے اس لیے ان کے آپس میں راضی ہو جانے سے شریعت کے حق کو ضائع نہیں کر سکتے۔ اور امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ مبیع رد کیا جا سکتا ہے۔

(۳) اِضَافَۃٌ مُنْفَصِلَۃٌ غَیْرُ مُتَوَلِّدَۃٍ مِنَ الْمَبِیْعِ یعنی ایسا اضافہ جو مبیع کے اندر سے نہ ہوا ہو اور مبیع سے جدا ہو جیسا کہ غلام سے کمائی کرائی گئی تو اس صورت میں بالاتفاق مبیع رد کیا جا سکتا ہے اور اضافہ مشتری کا ہوگا اس لیے کہ اس وقت مبیع اس کی ضمان میں ہے۔

(۴) اِضَافَۃٌ مُنْفَصِلَۃٌ مُتَوَلِّدَۃٌ مِنَ الْمَبِیْعِ یعنی ایسا اضافہ جو مبیع کے اندر سے ہو اور مبیع سے جدا ہو جیسا کہ مبیع جانور یا لونڈی کا بچہ جننا' جانور کا دودھ' درخت کا پھل وغیرہ تو اس صورت میں جمہور کے نزدیک رد متعذر ہے۔ اس لیے کہ عقد اس پر نہیں ہوا تھا اور اضافہ کے جدا ہونے کی وجہ سے اس کو تابع بھی نہیں بنایا جا سکتا اس لیے عیب کی وجہ سے جو قیمت کا فرق ہوگا' وہ بائع سے مشتری لے گا اور امام شافعیؒ کے نزدیک یہ اضافہ مشتری کا ہوگا اور عیب کی وجہ سے مبیع کو رد کیا جا سکتا ہے۔ (انوار المحمود ج ۲ ص ۳۲۱)

اس بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ مبیع میں اضافہ کی دو صورتیں یعنی اضافہ متصلۃ متولدۃ من المبیع اور اضافہ منفصلۃ غیر متولدۃ من المبیع اتفاقی ہیں اور دو صورتیں یعنی اضافہ متصلۃ غیر متولدۃ من المبیع اور اضافہ منفصلۃ غیر متولدۃ من المبیع میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے۔

شوافع حضرات ان اختلافی صورتوں میں بھی اَلْخَرَاجُ بِالضَّمَانِ کو دلیل بناتے ہیں۔

احناف اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ تفصیلی روایت میں واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے غلام خریدا اور کچھ عرصہ اس کے پاس رہا اور وہ آدمی اس کا غلہ حاصل کرتا رہا پھر اس میں عیب معلوم ہوا تو یہ معاملہ حضور علیہ السلام کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے غلام بائع کو واپس کر دیا۔ تو بائع نے کہا یا رسول اللہ یہ آدمی میرے غلام کا غلہ لیتا رہا ہے تو آپ نے فرمایا اَلْخَرَاجُ بِالضَّمَانِ مبیعہ جس کی ضمان میں ہو' خراج بھی اسی کا ہوتا ہے (ابو داؤد ج ۲ ص ۱۳۹) تو اس روایت میں اَلْخَرَاجَ بِالضَّمَانِ کا تعلق اضافہ منفصلہ غیر متولدۃ من المبیع سے ہے اس لیے احناف اس کو اسی پر محمول کرتے ہیں چنانچہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں قَالَ الْاَحْنَافُ اَنَّ حَدِیْثَ اَلْخَرَاجِ بِالضَّمَانِ مَحْمُوْلٌ عَلَی الزِّیَادَۃِ الْمُنْفَصِلَۃِ غَیْرِ الْمُتَوَلِّدَۃِ (العرف الشذی ص ۳۹۹) یعنی احناف کے نزدیک اَلْخَرَاجَ بِالضَّمَانِ والی حدیث اضافہ منفصلہ غیر متولدۃ من المبیع کی صورت پر محمول ہے۔

پھر امام خطابی کے حوالہ سے گزرا ہے کہ یہ حدیث قوی نہیں ہے اس لیے اس کو بیوع پر موقوف رکھیں گے' غصب کو اس پر قیاس نہیں کریں گے تو احناف کی جانب سے کہا جا سکتا ہے کہ جب یہ حدیث اضافہ منفصلہ غیر متولدۃ من المبیع کے بارے میں ہے تو اس پر دوسری صورت کو قیاس نہیں کر سکتے اور شوافع حضرات بھی اَلْخَرَاجَ بِالضَّمَانِ والی روایت کو تمام صورتوں میں نہیں لیتے جیسا کہ مصراۃ کے باب میں یہ حضرات اس کو ترک کر دیتے ہیں اسی لیے حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے فرمایا کہ احناف اَلْخَرَاجَ بِالضَّمَانِ والی روایت کی وجہ سے حدیث مصراۃ میں صاع من تمر کو جائز نہیں کہتے مگر شوافع وہاں اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ (تقریر ترمذی ص ۶۹۷) احناف کے نزدیک اضافہ متصلہ متولدۃ من المبیع میں مبیعہ رد کرنے کی وجہ سے ربا لازم آتا ہے تو ربا کی وجہ سے رد نہیں ہو سکتا اور اضافہ منفصلہ غیر متولدۃ من المبیع میں اضافہ کو اصل کے تابع نہ کر سکنے کی وجہ سے مبیعہ کا رد نہیں ہو سکتا اس لیے عیب کی وجہ سے جو قیمت کا فرق ہوگا' وہ بائع سے مشتری لے گا۔

اعتراض اور اس کا جواب

اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ شوافع حدیث مصراۃ کی وجہ سے اَلْخَرَاجَ بِالضَّمَانِ والی حدیث کو ترک کرتے ہیں اس لیے کہ حدیث مصراۃ اس کی بہ نسبت قوی ہے۔

تو اس کا جواب علامہ ظفر احمد صاحب دیتے ہیں کہ اگر اصول و قواعد حدیث کو دیکھا جائے تو حدیثِ مُصَرَّاۃ اَلْخَرَاجُ بِالضَّمَانِ والی حدیث سے کوئی زیادہ صحیح نہیں ہے اس لیے کہ حدیث مصراۃ میں اضطراب ہے اور الخراج بالضمان والی حدیث متن اور سند دونوں میں اضطراب سے سالم ہے اور اسے امام حاکمؒ نے مستدرک میں کئی سندوں سے نقل کیا ہے اور اس کو صحیح کہا ہے اور امام ذہبیؒ نے اس کی تائید کی ہے اور ابن القطانؒ اور ترمذیؒ نے اس کو صحیح کہا ہے اور اصحاب سنن اور امام احمد وشافعی نے اس کو روایت کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ الخراج بالضمان والی روایت صحیحین میں نہیں اور حدیث مصراۃ صحیحین میں ہے تو محققین محدثین کے نزدیک یہ کوئی وجہ ترجیح نہیں ہے۔ (اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۷۶ تا ۷۸ ملخصاً)

قَوْلُهٗ وَاسْتَغْرَبَ مُحَمَّدُ بْنُ اِسْمَاعِیْلَ هٰذَا الْحَدِیْثَ

حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے اس حدیث کو اس لیے غریب قرار دیا ہے کہ ان کے خیال کے مطابق اس میں عمر بن علی متفرد ہے مگر امام بخاریؒ کا یہ خیال درست نہیں ہے اس لیے کہ ہشام سے یہ روایت مسلم بن خالد اور جریر بھی کرتے ہیں لہٰذا عمر بن علی اس میں متفرد نہ رہے۔ اگر جریر کی روایت پر تدلیس کی وجہ سے جرح ہے تو مسلم بن خالد کی روایت تو جرح سے سالم ہے۔ (الکوکب الدری ج ۱ ص ۳۷۶) اور مبارک پوری صاحبؒ حافظ ابن حجرؒ سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس روایت کو امام بخاریؒ اور امام ابو داؤد نے ضعیف کہا ہے اور امام ترمذیؒ، ابن خزیمہؒ، ابن الجارودؒ، ابن حبانؒ، امام حاکمؒ اور ابن القطانؒ نے صحیح کہا ہے۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۲۹۰)

بَابُ مَا جَآءَ مِنَ الرُّخْصَةِ فِیْ اَكْلِ الثَّمَرَةِ لِلْمَارِّ بِهَا

(گزرنے والے کے لیے درخت سے پھل کھانے کی اجازت کا بیان)

اگر کوئی آدمی پھل دار درختوں کے پاس سے گزرتا ہے تو کیا ان درختوں سے پھل مالک کی اجازت کے بغیر کھا سکتا ہے یا نہیں؟ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک ثمن کے بغیر مسافر بغیر ضرورت کے پھل نہیں کھا سکتا۔ اگر مجبوری ہو تو کھا لے اور مالک کو اس کا تاوان ادا کرے۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس باغ کے ارد گرد دیوار ہو تو دیوار سے اندر جا کر اس کے لیے کھانا درست نہیں ہے اور اگر دیوار نہیں ہے تو ایسی صورت میں امام احمدؒ

سے دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت کے مطابق مطلقاً کھا سکتا ہے اور ایک روایت کے مطابق مجبوری اور محتاج ہونے کی وجہ سے کھا سکتا ہے۔ نیز امام نووی فرماتے ہیں کہ بعض سلف نے کہا ہے کہ مسافر مجبوری اور محتاج ہونے کی وجہ سے جو پھل کھائے گا، اس کا تاوان اس پر نہیں ہے مگر جمہور کے نزدیک اس پر اس کا تاوان ہوگا۔ (نووی شرح مسلم)

قَوْلُہٗ مَنْ دَخَلَ حَائِطًا فَلْیَأْکُلْ وَلَا یَتَّخِذْ خُبْنَةً

یعنی جو شخص باغ میں داخل ہوتا ہے، تو وہ وہاں تو کھا سکتا ہے مگر جھولی میں ڈال کر لے جا نہیں سکتا۔ حضرت گنگوہی الکوکب الدری ج ۱ ص ۳۷۷ میں اور علامہ کشمیری العرف الشذی ص ۳۹۹ میں فرماتے ہیں کہ ایسی صورت لوگوں کے عرف پر محمول ہے۔ یعنی اگر ایسے لوگ ہیں جو عام طور پر منع نہیں کرتے تو یہ اجازت ہوگی اور کھانا درست ہوگا۔ اور اگر عموماً لوگ منع کرتے ہیں تو مالک کی اجازت کے بغیر کھانا جائز نہیں ہے۔ حضرت مدنی تقریر ترمذی ص ۲۹۷ میں فرماتے ہیں کہ ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر اس کا خون، مال اور عزت و آبرو حرام ہے اور یہ روایت بھی ہے لَا یَحِلُّ لِامْرِءٍ مَالُ اَخِیْہِ اِلَّا عَنْ طِیْبِ نَفْسٍ مِّنْہُ (مسند احمد ج ۵ ص ۱۱۳) یعنی مالک کی اجازت کے بغیر کسی کے لیے اس کا مال حلال نہیں ہے۔

قَوْلُہٗ فَلَا شَیْءَ عَلَیْہِ

یعنی اگر ضرورت کے تحت درخت سے پھل کھا لیتا ہے اور کپڑے میں ڈال کر لے جاتا نہیں تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ مبارک پوری صاحب ابن الملک سے نقل کرتے ہیں کہ فلا شیء کا معنیٰ ہے فلا اثم علیہ کہ اس پر گناہ نہیں لیکن اس پر ضمان ہوگی۔ یا یہ صورت ابتداء اسلام میں تھی، بعد میں منسوخ کر دی گئی۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۲۶۱)

قَوْلُہٗ وَکُلْ مَا وَقَعَ

یعنی جو پھل درخت سے گر گیا ہو، اس کو کھا لے۔ حدیث سے بظاہر اجازت معلوم ہوتی ہے کہ گرا ہوا پھل کھایا جا سکتا ہے مگر اس کو بھی اسی پر محمول کریں گے کہ اگر مالک کی جانب سے حالی یا قولی اجازت ہو تو درست ہے ورنہ نہیں۔

بَابُ مَا جَاءَ فِی النَّهْیِ عَنِ الثُّنْیَا

ثُنْیَا بروزن دنیا ہے، اس کا معنیٰ ہے بیع میں کسی چیز کی استثناء کرنا۔ حضرت گنگوہی فرماتے ہیں کہ ثُنْیَا کی کئی اقسام ہیں۔

۱۔ مبیع کے جزو شائع یعنی نصف یا ثلث یا ربع کی استثناء کی جائے تو یہ جائز ہے۔
۲۔ مبیع کے افراد میں سے کسی فرد کو مستثنیٰ کیا جائے جیسا کہ کئی درخت بیچے اور ان میں سے ایک یا دو متعین درختوں کی استثناء کردی جائے تو یہ بھی جائز ہے۔
۳۔ مبیع میں سے ایک متعین مقدار کی استثناء کی جائے' اگر یہ واضح ہو جائے کہ اس متعین مقدار کے بعد مشتری کے لیے مبیع باقی رہتا ہے تو یہ بھی جائز ہے (مثلاً گندم کا ڈھیر ہے اور بائع کہتا ہے کہ اس میں سے ایک من گندم مستثنیٰ ہے' باقی بیچتا ہوں۔ اگر گندم کا ڈھیر اتنا ہو کہ ایک من گندم نکالنے کے بعد گندم باقی رہ جاتی ہے تو یہ استثناء بھی جائز ہے) اور اگر یہ یقین نہیں کہ مستثنیٰ مقدار کے بعد مبیع باقی بھی رہتا ہے یا نہیں تو یہ جائز نہیں ہے۔
۴۔ اگر مبیع میں سے غیر متعین مقدار کی استثناء کی جائے تو یہ جائز نہیں ہے اور حدیث میں الا ان تعلم کے الفاظ کا یہی مفہوم ہے (مثلاً بائع کہتا ہے کہ یہ گندم بیچتا ہوں اور اس میں سے کچھ گندم نہیں بیچتا تو چونکہ یہ مقدار متعین نہیں' اس لیے جائز نہیں ہے) (الکوکب الدری ص ۳۷۷) امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ اس میں ممانعت کی وجہ یہ ہے لِاَنَّ اَلْمَبِيْعَ حِيْنَئِذٍ يَكُوْنُ مَجْهُوْلاً (معالم السنن ج ۵ ص ۴۶) یعنی ایسی صورت میں مبیع مجہول ہو جاتا ہے اور مجہول مبیع کی بیع درست نہیں ہے اور اسی کے مثل قاضی شوکانی نے نیل الاوطار ج ۵ ص ۱۴۰ میں لکھا ہے۔ نیز شوکانی کہتے ہیں کہ ابن الجوزیؒ کو مغالطہ ہوا ہے کہ اس نے اس ثنیا والی روایت کو متفق علیہ کہا ہے اس لیے کہ امام بخاریؒ نے تو اس روایت کو اپنی کتاب میں ذکر ہی نہیں کیا۔ اس کو متفق علیہ کہنا ابن الجوزی کی غلطی ہے۔

قَوْلُهٗ نَهٰى عَنِ الْمُحَاقَلَةِ وَالْمُزَابَنَةِ وَالْمُخَابَرَةِ وَالثُّنْيَا اِلَّا اَنْ تَعْلَمَ

محاقلہ کے بارے میں بحث بَابُ مَا جَاءَ فِي النَّهْيِ عَنِ الْمُحَاقَلَةِ میں گزر چکی ہے اور "مُزَابَنَةٌ" زَبْنٌ سے ہے اور زَبْنٌ کا لغوی معنی ہے دفع کرنا اور اصطلاح میں مزابنہ کہتے ہیں درخت پر لگے ہوئے پھلوں کو اتارے ہوئے معلوم المقدار پھلوں کے بدلے میں بیچنا جیسا کہ امام ابو داؤد نے باب فی المزابنہ قائم کر کے اس کے تحت حضرت ابن عمرؓ کی روایت ذکر کی ہے۔ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ بَيْعِ الثَّمَرِ بِالتَّمْرِ كَيْلاً وَعَنْ بَيْعِ الْعِنَبِ بِالزَّبِيْبِ كَيْلاً وَعَنْ بَيْعِ الزَّرْعِ بِالْحِنْطَةِ كَيْلاً (ابو داؤد ج ۲ ص ۱۳۱) کہ نبی کریم ﷺ نے درخت پر لگے ہوئے پھل کو اتاری ہوئی کھجوروں کے بدلہ میں اور درخت

پر لگے ہوئے انگور کے پھل کو زبیب کے بدلہ میں اور کھڑی کھیتی کی گندم کی فصل کو اتاری ہوئی گندم کے بدلہ میں کیلا" بیچنے سے منع فرمایا ہے۔ اور اس کی وجہ مولانا سہارنپوری" یہ بیان فرماتے ہیں فَاِنَّ مَا عَلَى النَّخْلِ لَا يُمْكِنُ اَنْ يُّكَالَ بے شک درخت پر لگے ہوئے پھل کو کیل سے نہیں ناپا جا سکتا۔ نیز فرماتے ہیں کہ یہ مسئلہ ائمہ کے درمیان متفق علیہا ہے (بذل المجہود ج ۵ ص ۲۴۹)

اور مخابرہ کے معنی ہے زراعت جیسا کہ امام ابو داؤد نے حضرت زید بن ثابت" کی روایت نقل کی ہے قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْمُخَابَرَةِ قُلْتُ وَمَا الْمُخَابَرَةُ قَالَ اَنْ تَاْخُذَ الْاَرْضَ بِنِصْفٍ اَوْ ثُلُثٍ اَوْ رُبُعٍ (ابو داؤد ص ۱۳۸ ج ۲) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مخابرہ سے منع فرمایا۔ میں نے کہا کہ مخابرہ کیا ہے تو فرمایا کہ تو زمین کو (اس سے نکلنے والی فصل کے) نصف یا ثلث یا ربع کے بدلے میں لے۔

مزارعت کے بارے میں بحث پہلے گزر چکی ہے کہ امام ابو حنیفہ" اور امام النخعی" کے نزدیک مخابرہ یعنی مزارعت اور مساقاۃ دونوں مکروہ ہیں اور امام مالک" اور امام شافعی" کے نزدیک مساقاۃ جائز ہے اور مزارعت صرف اس صورت میں جائز ہے جبکہ مساقاۃ کے تابع ہو' اصل عقد نہ ہو۔ اور امام احمد اور امام ابو یوسف" اور امام محمد" کے نزدیک مخابرہ اور مساقاۃ دونوں جائز ہیں۔ حضرت گنگوہی" فرماتے ہیں کہ اس بارے میں زیادہ احتیاط والا قول امام ابو حنیفہ" کا ہے مگر مزارعت کی جانب احتیاجی ہے اس لیے فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے (الکوکب الدری ج ۱ ص ۳۷۷)

بَابُ مَا جَاءَ فِيْ كَرَاهِيَةِ بَيْعِ الطَّعَامِ حَتّٰى يَسْتَوْفِيَهٗ

(طعام پر قبضہ سے پہلے اس کی بیع مکروہ ہونے کا بیان)

علامہ عینی" فرماتے ہیں اَنَّ الْقَبْضَ وَالْاِسْتِيْفَاءَ بِمَعْنًى وَّاحِدٍ (عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۲۵۰) یعنی قبض اور استیفاء کا ایک ہی معنی ہے۔ اس لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ جب تک طعام پر مشتری قبضہ نہ کرلے' اس وقت تک آگے اس کی بیع مکروہ ہے۔ امام خطابی معالم السنن ج ۵ ص ۱۳۸ میں اور علامہ ابن حجر فتح الباری ج ۵ ص ۲۵۳ میں اور مولانا محمد صدیق نجیب آبادی انوار المحمود ج ۲ ص ۳۳۷ میں فرماتے ہیں کہ مختلف اشیاء میں قبضہ کی نوعیت مختلف ہوگی۔ اور انوار المحمود کی عبارت کا مفہوم یوں ہے کہ کسی چیز میں اشارہ کر دینا

کافی ہوگا (جیسا کہ درخت وغیرہ کی بیع) اور کسی میں مبیع ہاتھ میں دینا ہوگا جیسا کہ بیع صرف میں ہوتا ہے اور کسی میں مبیعہ اور مشتری کے درمیان تخلیہ کافی ہوگا جیسا کہ اعیانی اشیاء کی بیع میں۔ (تخلیہ کا مطلب یہ ہے کہ بائع بیع ہو جانے کے بعد مشتری کو اس میں تصرف سے نہ روکے) اور کسی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا ہوتا ہے جیسا کہ طعام کی بیع اگر کیل یا وزن کے ساتھ نہ ہو بلکہ جزافاً" (تخمینہ سے) ہو اور کسی میں کیل یا وزن کر کے قبضہ لیا جاتا ہے جیسا کہ طعام کی بیع میں جو کیلاً یا وزناً ہو۔

علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ احادیث میں تین الفاظ آتے ہیں۔ حَتّٰی یَسْتَوْفِیَهٗ حَتّٰی یَنْقُلَهٗ حَتّٰی یَقْبِضَهٗ ۔ شوافع نے کہا ہے کہ ان میں اصل حَتّٰی یَنْقُلَهٗ ہے اور باقی دو قسم کے الفاظ کو اسی پر محمول کریں گے۔ اور احناف نے کہا ہے کہ یہ سب قبضہ کی صورتیں ہیں یا یہ ہے کہ یہ الفاظ قبضہ سے کنایہ ہیں۔ (العرف الشذی ص ۴۰۰)

کن اشیاء کو قبضہ سے پہلے بیچا جا سکتا ہے؟

مولانا سہارنپوریؒ امام خطابی کی معالم السنن (ج ۵ ص ۱۳۱ تا ۱۳۳) سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ طعام کی بیع قبل القبض کی ممانعت پر سب کا اتفاق ہے اور باقی اشیاء میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ مکانات اور اراضی کے علاوہ باقی اشیاء طعام کی طرح ہیں۔ مکانات اور اراضی کی بیع قبل القبض جائز ہے' باقی کسی چیز کی جائز نہیں ہے۔ اور امام شافعیؒ اور امام محمدؒ نے فرمایا کہ کسی چیز کی بیع بھی قبل القبض جائز نہیں' خواہ طعام ہو یا مکان وغیرہ۔ اور امام مالکؒ نے فرمایا کہ ماکول اور مشروب کے علاوہ باقی چیزوں کی بیع قبل القبض جائز ہے اور امام احمدؒ اور امام اوزاعیؒ اور امام اسحاقؒ نے فرمایا کہ کیلی اور موزونی چیزوں کے علاوہ باقی چیزوں کی بیع قبل القبض جائز ہے (بذل المجہود ج ۵ ص ۲۸۴) اور علامہ ابن القیم فرماتے ہیں کہ امام احمد سے ایک روایت امام شافعیؒ اور امام محمدؒ کی طرح ہے کہ قبضہ سے پہلے کسی چیز کی بیع درست نہیں ہے (تہذیب سنن ابی داؤد ج ۵ ص ۱۳۲)

امام مالکؒ کا نظریہ اور دلیل

امام مالکؒ کے نزدیک صرف طعام کی بیع قبل القبض درست نہیں اور وہ ان روایات سے استدلال کرتے ہیں جن میں طعام کا ذکر آیا ہے جیسا کہ بخاری ج ۱ ص ۲۸۶ اور مسلم ج ۲ ص ۵ اور ابو داؤد ج ۲ ص ۱۳۷ وغیرہ۔

جواب

علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں اَنَّ قَیْدَ الطَّعَامِ اِتِّفَاقِیٌّ (العرف الشذی ص ۴۰۰) کہ طعام کی قید اتفاقی ہے۔ اور یہی بات درست ہے اس لیے کہ حضرت زید بن ثابتؓ کی روایت ہے کہ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَھٰی اَنْ تُبَاعَ السِّلَعَ حَیْثُ تُبْتَاعُ حَتّٰی یَحُوْزَھَا التُّجَّارُ اِلٰی رِحَالِھِمْ (ابو داؤد ج ۲ ص ۱۳۸۔ دار قطنی ج ۳ ص ۱۳) یعنی نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ تاجر لوگ جہاں سودا خریدیں، وہاں ہی اس کو نہ بیچا کریں یہاں تک کہ ان کو اپنے ٹھکانوں میں منتقل کر لیں۔ اس میں طعام نہیں بلکہ مطلق سلع کا ذکر ہے۔ اسی طرح حضرت حکیم بن حزامؓ کی روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ میں خرید و فروخت کرتا ہوں تو کون سی بیع میرے لیے حلال اور کون سی حرام ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا فَاِذَا اشْتَرَیْتَ بَیْعًا فَلَا تَبِعْہُ حَتّٰی تَقْبِضَہٗ کہ جب تو کوئی چیز خریدے تو اس پر قبضہ سے پہلے اس کو نہ بیچ (مسند احمد ج ۳ ص ۴۰۲) اس میں بھی طعام کا ذکر نہیں بلکہ مطلق شے کا ذکر ہے۔

قاضی شوکانیؒ ان روایات کو ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت حکیم بن حزامؓ کی حدیث امام طبرانیؒ نے بھی المعجم الکبیر میں نقل کی ہے اور اس کی سند میں ایک راوی علاء بن خالد الواسطی ہے۔ اس کو ابن حبان نے ثقہ اور موسیٰ بن اسماعیل نے ضعیف کہا ہے۔ اور حضرت زید بن ثابتؓ کی روایت امام حاکم اور ابن حبان نے اپنی کتابوں میں نقل کر کے اس کو صحیح کہا ہے (نیل الاوطار ج ۵ ص ۱۴۸) اور علامہ ابن القیمؒ حضرت حکیم بن حزامؓ کی روایت کے بارے میں فرماتے ہیں ھٰذَا اِسْنَادٌ عَلٰی شَرْطِھِمَا سِوٰی عَبْدِ اللہِ بْنِ عَصْمَۃَ وَقَدْ وَثَّقَہُ ابْنُ حِبَّانَ وَاحْتَجَّ بِہِ النَّسَائِیُّ (تہذیب سنن ابی داؤد ج ۵ ص ۱۳۱) یہ سند بخاری اور مسلم کی شرط کے مطابق ہے سوائے ایک راوی عبد اللہ بن عصمہ کے۔ اور اس کو ابن حبان نے ثقہ کہا ہے اور امام نسائی نے اس سے دلیل پکڑی ہے۔

قاضی شوکانیؒ امام مالک کے جواب میں لکھتے ہیں کہ وَیَکْفِیْ فِیْ رَدِّ ھٰذَا الْمَذْھَبِ حَدِیْثُ حَکِیْمٍ فَاِنَّہٗ یَشْمَلُ بِعُمُوْمِہٖ غَیْرَ الطَّعَامِ (نیل الاوطار ج ۵ ص ۱۴۹) اس مذہب کے جواب میں حضرت حکیمؓ کی حدیث ہی کافی ہے جو کہ اپنے عموم کے لحاظ سے طعام کے علاوہ باقی چیزوں کو بھی شامل ہے۔

امام احمدؒ جنہوں نے ممانعت کی علت کیل و وزن کو بنایا ہے، ان کا جواب بھی اس

مذکورہ بحث سے ہو جاتا ہے۔

امام شافعیؒ اور امام محمدؒ کا نظریہ اور دلیل

ان حضرات کے نزدیک قبضہ سے پہلے ہر چیز کی بیع ممنوع ہے اور وہ حضرت حکیم بن حزامؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ کی روایات سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قبل القبض ہر چیز کی بیع ممنوع ہے اس لیے کہ ان میں حکم عام ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کا نظریہ اور دلیل

اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ غیر منقولہ (دار اور زمین) جائیداد کا قبضہ سے پہلے بیچنا جائز ہے۔ اس کی وجہ علامہ عینیؒ یہ بیان کرتے ہیں کہ لِاَنَّ النَّهْيَ مَعْلُوْلٌ بِضَرَرِ انْفِسَاخِ الْعَقْدِ لِخَوْفِ الْهَلَاكِ وَهُوَ فِي الْعِقَارِ وَغَيْرِهِ نَادِرٌ وَفِي الْمَنْقُوْلَاتِ غَيْرُ نَادِرٍ (البنایہ شرح الہدایہ) کہ نہی کی علت اس چیز کے ہلاک ہو جانے کے خوف سے عقد کے فسخ ہو جانے کا ضرر ہے اور یہ عقار وغیرہ میں نادر ہے (اس لیے کہ زمین اور مکان کا ہلاک ہونا نادر ہے) اور منقولی اشیاء میں ہلاک ہونا نادر نہیں اس لیے یہ علت منقولی اشیاء میں پائی جاتی ہے' غیر منقولہ میں نہیں۔ مگر آج کے دور میں چونکہ غیر منقولہ میں بھی جعلی رجسٹری کروا لینے کا خطرہ موجود ہوتا ہے اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ پہلے قبضہ لیا جائے اور پھر اس کے بعد اس کو بیچا جائے اور یہ احتیاطی طور پر ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي النَّهْيِ عَنِ الْبَيْعِ عَلٰى بَيْعِ اَخِيْهِ
(کسی دوسرے کے سودے کے دوران سودا کرنے کی ممانعت کا بیان)

علامہ ابن حجرؒ اس کی صورت یہ لکھتے ہیں کہ بائع اور مشتری کے درمیان بشرط الخیار سودا طے ہوا ہو اور کوئی دوسرا آدمی مدت خیار میں بائع سے کہے کہ اپنا سودا واپس لے کر مجھے اس سے زیادہ ثمن کے بدلے دے دے یا مشتری سے کہے کہ تم سودا واپس کر کے مجھ سے اس سے کم قیمت پر لے لو۔ (مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ یہ صورت اتفاقی ہے اور بعض شوافع نے شرط لگائی ہے کہ یہ حرام تب ہوگا جبکہ مشتری کے ساتھ غبن فاحش نہ ہوا ہو۔ اگر ایسا ہو تو اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ کی حدیث کی رو سے بیع علی البیع اور سوم علی السوم جائز ہے۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۲۴۲)

نیز علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ بِاَخِیہِ کی قید سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف مسلمان کے ساتھ مختص ہے اور یہی قول ہے امام اوزاعی کا۔ اور جمہور فرماتے ہیں کہ اس بارہ میں مسلمان اور ذمی میں کوئی فرق نہیں اور اخیہ کی قید صرف غالب کے لیے آئی ہے (یعنی چونکہ زیادہ تر مسلمان آپس ہی میں بیع کرتے ہیں اس لیے یہ قید ذکر کر دی ہے) (فتح الباری ج ۵ ص ۲۵۶، ۲۵۷)

قَوْلَہٗ لَا یَبِیعَ بَعْضُکُمْ عَلٰی بَیْعِ بَعْضٍ

اس میں بیع سے مراد سوم یعنی بھاؤ چکانا ہے اور اس میں ممانعت اس وقت ہوگی جبکہ بائع اور مشتری کسی ایک نرخ پر راضی ہو جائیں یا ان کے راضی ہو جانے کا ظن غالب ہو۔ اور اگر ان کے ایک دوسرے کے بتائے ہوئے نرخ پر راضی ہو جانے کا ظن غالب نہ ہو تو پھر دوسرے آدمی کا بھاؤ بتانا منع نہیں ہے جیسا کہ نیلامی کی صورت میں بیع میں ہوتا ہے کہ بائع ایک کے بتائے ہوئے نرخ پر راضی نہیں ہوتا تو دوسرا نرخ بتا دیتا ہے اور یہ بالاتفاق جائز ہے۔ اس کی تفصیلی بحث باب ما جاء فی بیع من یزید میں گزر چکی ہے۔

قَوْلَہٗ وَلَا یَخْطُبَ بَعْضُکُمْ عَلٰی خِطْبَۃِ اَخِیہِ

اس سے مراد بھی یہی ہے کہ اگر کسی عورت اور مرد کے رشتہ کی بات چل رہی ہے اور رشتہ طے ہو جانے کی امید اور ظن غالب ہو تو دوسرا آدمی مداخلت نہ کرے اور اگر رشتہ طے نہیں ہوا، صرف پیغامات بھیجنے کا معاملہ ہو تو پھر کئی آدمی ایک عورت کے لیے پیغام نکاح بھیج سکتے ہیں۔ آگے عورت کی مرضی، جس کا پیغام چاہے قبول کر لے۔ اور اس کی دلیل حضرت فاطمہ بنت قیسؓ کی روایت ہے کہ جب ان کو ان کے خاوند ابو عمرو بن حفص نے طلاق دے دی اور یہ عدت گزارنے لگیں تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جب تو عدت گزار لے تو مجھے بتانا۔ جب انہوں نے عدت پوری کر لی تو حضور علیہ السلام کو بتایا کہ مجھے عدت کے دوران حضرت معاویہؓ اور حضرت ابو جہمؓ نے نکاح کا پیغام بھیجا ہے۔ (ترمذی ج ۱ ص ۲۱۵۔ ابو داؤد ج ۱ ص ۳۱۹) اس سے معلوم ہوا کہ جب تک بات مکمل نہ ہو جائے، اس سے پہلے پہلے پیغام بھیجنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور جب بات پختہ ہو جائے یا پختہ ہونے کے قریب ہو تو پھر دوسرا آدمی اپنے لیے پیغام نہیں بھیج سکتا۔

بَابُ مَا جَاءَ فِی بَیْعِ الْخَمْرِ وَالنَّهْیِ عَنْ ذَالِکَ

(شراب کے کاروبار کی ممانعت)

مسلمان کا براہ راست یا بالواسطہ شراب کی خرید وفروخت کرنا یا شراب سے سرکہ بنانا وغیرہ کی تفصیلی بحث بَابَ مَا جَآءَ فِی النَّهْیِ لِلْمُسْلِمِ اَنْ یَدْفَعَ اِلَی الذِّمِّیِّ الْخَمْرَ یَبِیْعُهَا لَهٗ میں گزر چکی ہے۔

قَوْلُهٗ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِی الْخَمْرِ عَشْرَةً کہ نبی ﷺ نے شراب کے کاروبار میں ملوث دس آدمیوں پر لعنت فرمائی ہے۔ عَاصِرَهَا اس شراب کو نچوڑنے والا۔ مُعْتَصِرَهَا نچڑوانے والا۔ شَارِبَهَا اس کو پینے والا۔ حَامِلَهَا اس کو اٹھانے والا۔ وَالْمَحْمُوْلَةَ اِلَیْهِ جس کے لیے اٹھائی جائے۔ سَاقِیَهَا پلانے والا۔ بَائِعَهَا اس کو بیچنے والا۔ اٰکِلَ ثَمَنِهَا اس کی قیمت کھانے والا۔ وَالْمُشْتَرِیَ لَهَا اس کو خریدنے والا۔ وَالْمُشْتَرَاةَ لَهٗ جس کے لیے خریدی گئی۔ لعنت کہتے ہیں دوری کو اور اس سے مراد یہ ہے کہ یہ اللہ کی رحمت سے دور ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پر اس کے جرم کے مطابق درجہ بدرجہ لعنت ہوگی۔ جتنا جرم ہوگا' اس کے مطابق لعنت ہوگی۔

بَابَ مَا جَآءَ فِی احْتِلَابِ الْمَوَاشِیْ بِغَیْرِ اِذْنِ الْاَرْبَابِ
(مالکوں کی اجازت کے بغیر جانوروں کا دودھ دوہنے کا بیان)

اگر کوئی آدمی دودھ والے جانور کو چرتا ہوا دیکھتا ہے تو کیا وہ اس جانور کے مالک کی اجازت کے بغیر اس کا دودھ دوہ کر پی سکتا ہے یا نہیں؟

جمہور فقہاء کا نظریہ

جمہور فقہاء فرماتے ہیں کہ مالک کی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے اور اگر مجبور ہو تو وقتی طور پر استعمال کر لے اور بعد میں مالک کو اس کا تاوان ادا کرے۔

امام احمدؒ کا نظریہ اور دلیل

امام احمدؒ اور اسحاق بن راہویہؒ فرماتے ہیں کہ اس کے لیے اس جانور کا دودھ دوہ کر پینا ہر حالت میں جائز ہے خواہ مضطر ہو یا نہ ہو۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب حدیث سے اس کے لیے اجازت ہے تو اس کے لیے جائز ہے اور کسی قسم کا تاوان اس پر نہیں ہوگا۔

امام احمدؒ اور امام اسحاقؒ نے ترمذی شریف کی اسی تحت الباب روایت جو حضرت سمرۃ بن جندبؓ سے ہے' اس کو دلیل بنایا ہے جس کے الفاظ ہیں۔ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ

وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا أَتَى أَحَدُكُمْ عَلَى مَاشِيَةٍ فَإِنْ كَانَ صَاحِبُهَا فَلْيَسْتَأْذِنْهُ فَإِنْ أَذِنَ لَهُ فَلْيَحْتَلِبْ وَلْيَشْرَبْ وَإِنْ لَمْ يَكُنْ فِيهَا أَحَدٌ فَلْيُصَوِّتْ ثَلَاثًا فَإِنْ أَجَابَهُ أَحَدٌ فَلْيَسْتَأْذِنْهُ فَإِنْ لَمْ يُجِبْهُ أَحَدٌ فَلْيَحْتَلِبْ وَلْيَشْرَبْ وَلَا يَحْمِلْ

بے شک نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی آدمی کسی چرتے ہوئے جانور کے پاس سے گزرے تو اگر اس کا مالک موجود ہو تو اس سے اجازت لے کر دودھ دوہ کر پی لے اور اگر وہاں کوئی نہ ہو تو تین دفعہ آواز لگائے تو اگر اس کو کسی نے جواب دیا تو اس سے اجازت لے کر دودھ دوہ کر پی لے۔ اور اگر کسی نے اس کی آواز کا جواب نہ دیا تو دودھ دوہ کر پی لے اور ساتھ نہ لے جائے۔

امام احمدؒ اور امام اسحاقؒ فرماتے ہیں کہ اس سے اجازت ثابت ہوتی ہے اور اس میں کوئی ذکر نہیں کہ وہ مضطر ہو یا نہ ہو۔

جمہورؒ کی دلیل

جمہور فقہاء اپنے نظریہ پر اس روایت کو دلیل بناتے ہیں جو حضرت ابن عمرؓ سے ہے

أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَحْلُبَنَّ أَحَدٌ مَاشِيَةَ امْرِءٍ بِغَيْرِ إِذْنِهِ أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ تُؤْتَى مَشْرُبَتُهُ فَتُكْسَرَ خِزَانَتُهُ فَيُنْتَقَلَ طَعَامُهُ فَإِنَّمَا تَخْزُنُ لَهُمْ ضُرُوعُ مَوَاشِيهِمْ أَطْعِمَاتِهِمْ فَلَا يَحْلُبَنَّ أَحَدٌ مَاشِيَةَ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِهِ (بخاری ج ۱ ص ۳۲۹۔ مسلم ج ۲ ص ۸۰)

بے شک نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہرگز کسی کے جانور کا دودھ اس کی اجازت کے بغیر کوئی نہ دوہے۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ کسی کے مشربہ (پینے پلانے کا کمرہ) میں جا کر اس کی الماری توڑ کر اس کا طعام لے جائے۔ پس بیشک ان جانوروں کے تھن ان (مالکوں) کی خوراک کی الماریاں ہیں اس لیے اس کی اجازت کے بغیر کوئی اس کے جانور کا دودھ نہ دوہے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے جانور کے تھنوں کو خزانے والی الماری کی طرح قرار دیا ہے تو جیسے الماری توڑ کر مال نکالنا چوری ہے اور ممنوع ہے' اسی طرح مالک کی اجازت کے بغیر جانور کا دودھ دوہ کر استعمال کرنا بھی منع ہے۔

امام احمدؒ کی دلیل کا جواب

مبارک پوری صاحبؒ جمہور کی طرف سے امام احمدؒ کی دلیل کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نہی کی حدیث زیادہ صحیح ہے اس لیے اس پر عمل کرنا بہتر ہے۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ امام احمد جس روایت کو دلیل بناتے ہیں' وہ قواعد قطعیہ سے معارض ہے اس لیے اس کو نہیں لیا جائے گا اور قواعد قطعیہ میں سے ہے کہ مسلمان کا مال اس کی اجازت کے بغیر لینا حرام ہے۔

روایات کی توجیہات

مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ ان دونوں روایتوں میں کئی طرح سے توجیہات کر کے بعض حضرات نے ان دونوں قسم کی احادیث کو جمع کیا ہے۔

پہلی توجیہ کہ اجازت اس صورت میں ہے جبکہ اس کے مالک کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ خوش دلی سے اجازت دے دے گا اور ممانعت اس وقت ہے جبکہ یہ معلوم نہ ہو۔ دوسری توجیہ کہ اجازت صرف مسافر یا مضطر کے لیے ہے' ان کے علاوہ ممانعت ہے۔ اور ابن العربیؒ نے کہا ہے کہ یہ لوگوں کی عادت پر محمول ہے۔ جہاں کے لوگ اس کو برا نہیں جانتے' اس علاقہ میں جائز ہے اور جہاں کے لوگ برا جانتے ہیں' وہاں ممانعت ہے۔ اور امام طحاویؒ نے کہا ہے کہ یہ اجازت والی روایت اس دور کی ہے جبکہ مسافر کی ضیافت علاقہ والوں پر واجب تھی' جب وہ منسوخ ہو گئی تو یہ حکم بھی منسوخ ہو گیا ہے (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۲۴۴)

اور حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ یہ اجازت انصار کے عرف کے مطابق ہے اس لیے کہ وہ مسافر کو اس سے نہیں روکتے تھے اور یہ دلالۃً اجازت ہے اور جن علاقوں میں ایسا طریق کار نہیں' وہاں جائز نہیں ہے۔ ہاں مضطر (مجبور آدمی جو کہ بھوک یا پیاس سے نڈھال ہو) اس کو وقتی طور پر استعمال کر لے اور پھر اس کی ضمان دے۔ (الکوکب الدری ج ۱ ص ۳۷۸)

"قَوْلُہٗ وَقَدْ تَکَلَّمَ بَعْضُ اَھْلِ الْحَدِیْثِ فِیْ رِوَایَۃِ الْحَسَنِ عَنْ سَمُرَۃَ"

مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام ترمذیؒ نے خود بَابُ کَرَاھِیَۃِ بَیْعِ الْحَیْوَانِ بِالْحَیْوَانِ نَسِیْئَۃً میں الحسن عن سمرۃ کی روایت کو حَسَنٌ صَحِیْحٌ کہا ہے اور فرمایا ہے کہ حسن کا سماع سمرۃؓ سے صحیح اور ثابت ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِیْ بَیْعِ جُلُوْدِ الْمَیْتَةِ وَالْاَصْنَامِ

(مردار کے چمڑے اور بتوں کی خرید و فروخت کا بیان)

اصنام، صنم کی جمع ہے جس کا معنی ہے بت۔ شیخ العرب والعجم حضرت مدنیؒ فرماتے ہیں کہ حرام چیز جب تک اپنی حالت پر رہے، اس وقت تک اس سے نفع اٹھانا درست نہیں ہے اور اگر اس میں تبدیلی آجائے تو اس کا استعمال درست ہے جیسا کہ مردار کا چمڑہ دباغت سے پہلے اس کا استعمال ممنوع ہے مگر دباغت کے بعد درست ہے۔ (تقریر ترمذی للمدنیؒ ص ۱۹۸)

اسی طرح جب اصنام اپنی حالت پر ہوں تو ان کی بیع درست نہیں۔ اگر ان کا حلیہ بگاڑ کر لکڑی یا تانبے وغیرہ کی حیثیت سے بیچا جائے تو درست ہے جیسا کہ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں۔ وَالْعِلَّةُ فِیْ مَنْعِ بَیْعِ الْاَصْنَامِ عَدَمُ الْمَنْفَعَةِ الْمُبَاحَةِ فَعَلٰی هٰذَا اِنْ كَانَتْ بِحَیْثُ اِذَا كُسِرَتْ یُنْتَفَعُ بِرُضَاضِهَا جَازَ بَیْعُهَا عِنْدَ بَعْضِ الْعُلَمَاءِ مِنَ الشَّافِعِیَّةِ وَغَیْرِهِمْ وَالْاَكْثَرُ عَلَی الْمَنْعِ حَمْلًا لِلنَّهْیِ عَلٰی ظَاهِرِهٖ وَالظَّاهِرُ اَنَّ النَّهْیَ عَنْ بَیْعِهَا لِلْمُبَالَغَةِ فِی التَّنْفِیْرِ عَنْهَا وَیَلْتَحِقُ بِهَا فِی الْحُكْمِ الصُّلْبَانُ الَّتِیْ تُعَظِّمُهَا النَّصَارٰی۔ (فتح الباری ج ۵ ص ۳۳۰)

اور اصنام کی بیع کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ ان میں کوئی جائز منفعت نہیں ہے۔ تو اس بنا پر جب ان کو توڑ پھوڑ دیا جائے اور ان کے سکریپ سے فائدہ اٹھایا جائے تو شوافع وغیرہم بعض علماء کے نزدیک ان کی بیع جائز ہے اور اکثر حضرات نہی کو اپنے ظاہر پر رکھتے ہوئے منع ہی کرتے ہیں۔ اور ظاہر یہ ہے کہ ان کی بیع کی ممانعت ان سے نفرت دلانے میں مبالغہ کے لیے ہے اور ان کے ساتھ ان صلیبوں کا بھی وہی حکم ہوگا جن کی عیسائی تعظیم کرتے ہیں۔ اور حضرت گنگوہیؒ بھی فرماتے ہیں کہ جب تک وہ اصنام ہیں، ان کا بیچنا حرام ہے اور جب ان کو لکڑی کی حیثیت سے بیچا جائے تو جائز ہے۔ نیز فرماتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرامؓ نے حضور علیہ السلام سے مردار کی چربی کے بارے میں اس لیے پوچھا تھا کہ مردار کے بعض اجزاء مثلاً دباغت کے بعد چمڑے اور اس کی ہڈیوں کا استعمال جائز ہے تو انہوں نے سمجھا کہ شاید چربی کا حکم بھی اسی طرح ہے جبکہ وہ بہت سی ضروریات میں اس کی طرف محتاج تھے۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ شریعت نے بعض نجاسات کو جلانے کی اجازت دی ہے جیسا کہ گوبر جلایا جاتا ہے اور اسی طرح اس تیل سے چراغ جلانا جائز ہے جس میں

نجاست گر جائے اس لیے ان کو پوچھنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ نجس چیز سے انتفاع کا مدار اس پر ہے کہ اس میں سے نجس رطوبات ختم ہو جائیں اور چربی سے نجس رطوبتیں چونکہ زائل نہیں ہوتیں' اس لیے اس سے انتفاع درست نہیں ہے۔ (الکوکب الدری ج ۱ ص ۳۷۸ و ص ۳۷۹)

مردار کی چربی کا حکم

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ کے نزدیک مردار کی چربی کھانے کے سوا باقی معاملات میں استعمال کرنا جائز ہے جیسا کہ دباغت دیا ہوا چمڑا۔ (نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۲۳) اور علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ جانور کے جن اجزاء میں حیات نہیں ہوتی' وہ چیزیں اس جانور کے مرنے کے بعد بھی طاہر ہوتی ہیں جیسا کہ بال اور اون۔ اور یہی قول ہے اکثر مالکیہ اور حنفیہ کا۔ اور بعض نے کہا کہ ہڈی اور دانت اور سینگ اور کھر بھی پاک ہیں۔ (فتح الباری ج ۵ ص ۳۳۱)

نجاست ملے ہوئے تیل کا حکم

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اگر پاک تیل میں کوئی نجاست گر جائے تو کھانے کے علاوہ باقی ضروریات میں اس کا استعمال درست ہے یا نہیں؟ احناف اور شوافع کے نزدیک درست ہے اور احناف اور امام لیث وغیرہ کے نزدیک اس کا بیچنا بھی جائز ہے بشرطیکہ مشتری کو بتا دے کہ اس میں نجاست گری ہوئی ہے۔ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اس کا استعمال کسی طور پر بھی درست نہیں ہے۔ (نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۲۳)

تو خلاصہ یہ ہوا کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مردار کی چربی کا استعمال درست نہیں اس لیے کہ وہ نجس العین ہے اور پگھلانے سے اس کا مادہ تبدیل نہیں ہوتا اور پاک تیل جس میں نجاست گر جائے' اس کا استعمال کھانے کے علاوہ درست ہے اس لیے کہ وہ نجس عین نہیں ہے۔

اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کا استعمال کھانے کے علاوہ جائز ہے اس لیے امام نووی فرماتے ہیں کہ اَلصَّحِیْحُ مِنْ مَذْھَبِنَا جَوَازُ جَمِیْعِ ذَالِکَ یعنی ہمارا (شوافع کا) صحیح مذہب یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا استعمال درست ہے۔ اور امیر یمانی فرماتے ہیں وَجَوَازُ جَمِیْعِ ذَالِکَ مَذْھَبُ الشَّافِعِیْ (سبل السلام ج ۳ ص ۱۷) اور امام

احمدؒ کے نزدیک نہ مردار کی چربی کا استعمال درست ہے اور نہ ہی نجاست گرے ہوئے تیل کا استعمال درست ہے۔

قَوْلُہٗ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ اَنَّہٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَامَ الْفَتْحِ وَھُوَ بِمَکَّۃَ

اشکال اور اس کا جواب

حضرت جابر بن عبد اللہؓ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام فتح مکہ کے موقعؓ پر مکہ میں ہی تھے تو میں نے ان سے سنا۔

اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ خمر وغیرہ کی حرمت کا اعلان آپ نے فتح مکہ کے موقع پر کیا جو کہ ۸ھ میں ہوا۔ حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ اس کی حرمت اس سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔

اس اشکال کا جواب مبارک پوری صاحب دیتے ہیں کہ ان اشیاء کی حرمت تو پہلے ہی ہو چکی تھی تو ہو سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر اس کا اعادہ فرمایا ہو تا کہ وہ لوگ بھی سن لیں جنہوں نے پہلے نہ سنا تھا (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۲۶۴)

قَوْلُہٗ اِنَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ حَرَّمَ

اس میں حرم مفرد لایا گیا ہے حالانکہ قاعدہ کے مطابق تثنیہ کا صیغہ حرما ہونا چاہئے جیسا کہ بعض روایات میں ایسا ہی ہے۔ اس کے جواب میں علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نبی کا امر اللہ تعالیٰ کے امر ہی سے ناشی ہوتا ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسے قرآن کریم میں ہے وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْہُ (سورہ التوبہ آیت ۶۲) اور سیبویہؒ کے نزدیک اس جیسے موقع پر پہلے جملہ میں حذف ہوتا ہے جس پر دوسرا جملہ دلالت کرتا ہے تو اس کے نزدیک اصل عبارت اس طرح ہے اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ وَرَسُوْلَہٗ حَرَّمَ (فتح الباری ج ۵ ص ۳۲۹)

قَوْلُہٗ اَرَاَیْتَ شُحُوْمَ الْمَیْتَۃِ فَاِنَّہٗ یُطْلٰی بِہِ السُّفُنَ

آپ کا مردار کی چربی کے بارے میں کیا خیال ہے اس لیے کہ وہ تو کشتیوں کو ملی جاتی ہے۔

اشکال اور اس کا جواب

ابو داؤد ج ۲ ص ۱۳۷ کی روایت میں یُطْلٰی بِھَا السُّفُنُ کے الفاظ ہیں، اس پر کوئی اشکال نہیں اور ترمذی شریف میں یُطْلٰی بہ کے الفاظ ہیں، اس پر اشکال ہے کہ بہ میں ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ شُحُوم میں جو شَحم مفہوم ہے، وہ اس کا مرجع ہے۔ اور علامہ طیبیؒ نے فرمایا کہ یہ علیٰ تاویل المذکور ہے یعنی جو ذکر کیا گیا ہے، اس کو کشتیوں پر ملا جاتا ہے۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۲۹۴) اور یہ سوال کرنے کی ضرورت ان کو کیوں پیش آئی، اس کے بارے میں حضرت گنگوہیؒ کے حوالہ سے بحث ہو چکی ہے۔

قَوْلُہٗ لَا ھُوَ حَرَامٌ

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ تم اس کو نہ بیچو اس لیے کہ یہ حرام ہے تو ھو ضمیر انتفاع کی طرف نہیں بلکہ بیع کی طرف لوٹتی ہے اسی لیے شوافع کے نزدیک اس سے انتفاع درست ہے اور جمہور کہتے ہیں کہ ضمیر کا مرجع انتفاع ہے اس لیے ان کے نزدیک اس سے انتفاع درست نہیں ہے۔

مبارک پوری صاحبؒ امام خطابیؒ سے نقل کرتے ہیں کہ جیسے مردار کا گوشت اپنے کتے کو کھلانا درست ہے، اسی طرح مردار کی چربی کا استعمال کشتیوں کو ملنے وغیرہ کے لیے جائز ہے (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۲۹۵) مگر امام خطابیؒ کا یہ استدلال درست نہیں ہے اس لیے کہ کتا مکلف نہیں ہے اور انسان مکلف ہے اور مکلف کے زیرِ استعمال ہر چیز کے لیے انتفاع اس کا انتفاع سمجھا جائے گا اس لیے کشتیوں کو ملنا بھی اس کے مالک کے حق میں اس سے انتفاع سمجھا جائے گا اور نجس العین سے انتفاع درست نہیں ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِیْ کَرَاھِیَۃِ الرُّجُوْعِ مِنَ الْھِبَۃِ
(ہبہ واپس لینے کی کراہیت کا بیان)

ہبہ کا معنی ہے اِیْصَالُ الشَّیْءِ لِلْغَیْرِ بِمَا یَنْفَعُہٗ مَالًا کَانَ اَوْ غَیْرَہٗ؛ کسی کو ایسی چیز دینا جو اس کو نفع پہنچائے خواہ وہ مال ہو یا کوئی اور چیز ہو۔ اور شریعت کی اصطلاح میں کہتے ہیں تَمْلِیْکُ الْمَالِ بِلَا عِوَضٍ کسی کو عوض کے بغیر مال کا مالک بنانا۔ اور اس کا رکن ایجاب و قبول ہیں اور قبضہ اس کی شرط ہے۔

حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں ہبہ مصدر ہے اور کبھی مبنی للمفعول ہو کر اس چیز پر بولا جاتا ہے جو ہبہ کی جائے۔ اگر یہ مِنْ کے ساتھ استعمال ہو جیسا کہ ترجمۃ الباب میں ہے تو اس

وقت یہ مصدر ہوتا ہے اور اگر فی کے ساتھ استعمال ہو جیسا کہ روایت کے متن میں ہے تو اس صورت میں یہ مفعول ہوگا۔ (الکوکب الدری ص ۳۷۹)

یہاں تین بحثیں ہیں۔

البحث الاول

اگر کسی نے کوئی چیز ہبہ کی ہو تو وہ ہبہ کی ہوئی چیز کون واپس لے سکتا ہے اور کون واپس نہیں لے سکتا۔ اس میں ائمہ کرام کے اقوال مختلف ہیں۔

مبارک پوری صاحبؒ فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ کے نزدیک صرف باپ اپنے بیٹے سے وہ چیز واپس لے سکتا ہے جو اس نے اس کو ہبہ کی ہو۔ اس کے علاوہ کسی اور کے لیے واپس لینا حرام ہے۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ باپ اپنے بیٹے سے واپس نہیں لے سکتا اور اس کے علاوہ کسی نے اپنے ذا رحم محرم (قریبی رشتہ دار) کو ہبہ کیا ہو تو وہ بھی واپس نہیں لے سکتا۔ اسی طرح میاں بیوی نے ایک دوسرے کو جو ہبہ کیا ہو' وہ بھی واپس نہیں لے سکتے۔ اور اجنبی کو یا ذا رحم محرم کے علاوہ کسی اور رشتہ دار کو ہبہ کیا ہو تو واپس لے سکتا ہے (یعنی ان سے واپس لینا حرام نہیں بلکہ مکروہ ہے) اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ میاں بیوی نے آپس میں ایک دوسرے کو جو ہبہ کیا ہو' وہ واپس نہیں لے سکتے۔ اس کے علاوہ اگر کسی نے کسی کو کچھ ہبہ کیا ہو تو واپس لے سکتا ہے (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۲۶۵)

قاضی شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ ماں نے اگر اپنے بیٹے کو کوئی چیز ہبہ کی ہو تو اس کے بارے میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔ بعض نے کہا کہ اس کا حکم بھی باپ کی طرح ہے اور بعض نے کہا ہے کہ باپ اپنے بیٹے کو دیا ہوا ہبہ واپس لے سکتا ہے تو یہ حکم خلاف القیاس ہے اس لیے اس پر کسی اور کو قیاس نہیں کر سکتے۔ اور مالکیہ نے کہا کہ اگر اس بیٹے کا باپ زندہ ہو تو ماں اپنے کیے ہوئے ہبہ کو واپس لے سکتی ہے ورنہ نہیں۔ (نیل الاوطار ج ۶ ص ۱۳)

اور امام احمد کا نظریہ قاضی شوکانی یہ نقل کرتے ہیں وَقَالَ اَحْمَدَ لَا یَحِلُّ لِلْوَاهِبِ اَنْ یَرْجِعَ فِیْ هِبَتِهٖ مُطْلَقاً (نیل الاوطار ج ۶ ص ۱۴) اور امام احمد نے فرمایا کہ ہبہ کرنے والے کے لیے بالکل اپنا ہبہ واپس لینا درست نہیں ہے۔

علامہ کشمیری العرف الشذی ص ۱۰۲ میں اور مولانا محمد صدیق نجیب آبادی انوار المحمود ج ۲ ص ۳۵۵ میں فرماتے ہیں کہ احناف کے نزدیک بعض صورتوں میں ہبہ واپس لینا ممنوع

ہے جن کی جانب دمع خزقة کے حروف میں اشارہ کیا گیا ہے۔ دال سے مراد ہے زیادتی یعنی موہوب لہ (جس کو ہبہ کیا گیا ہو) نے اس ہبہ کی گئی چیز میں زیادتی کرلی ہو جیسا کہ خالی جگہ تھی اور اس نے مکان تعمیر کرلیا وغیرہ۔ امام خطابی فرماتے ہیں کہ اگر موہوبہ چیز میں تغیر ہو گیا ہو تو امام مالکؒ کے نزدیک رجوع نہیں ہو سکتا۔ (معالم السنن ج ۵ ص ۱۸۹) اور میم سے مراد موت ہے یعنی واہب (ہبہ کرنے والا) یا موہوب لہ میں سے کوئی مرجائے۔ عین سے مراد ہے عوض یعنی واہب نے اس موہوبہ چیز کا عوض موہوب لہ سے لیا ہو۔ اور خاء سے مراد ہے خروج عن ملک الموہوب لہ یعنی جب واہب نے اس ہبہ کی گئی چیز کی واپسی کا مطالبہ کیا تو اس وقت وہ چیز موہوب لہ کی ملکیت سے نکل چکی ہو خواہ اس نے بیچ دی ہو یا کسی کو ہبہ کر دی ہو۔ اور زاء سے مراد ہے زوجیت یعنی اگر میاں بیوی نے آپس میں ایک دوسرے کو ہبہ کیا ہو تو واپس نہیں لے سکتے۔ اور قاف سے مراد ہے قرابت یعنی ہبہ کرنے والے اور موہوب لہ کے درمیان قرابت ذا رحم محرم کی ہو اور ہاء سے مراد ہے ہلاک ہونا یعنی جب واہب نے ہبہ کی ہوئی چیز کی واپسی کا مطالبہ کیا تو اس وقت موہوبہ چیز ہلاک ہو چکی ہو۔ ان صورتوں میں ہبہ واپس نہیں لیا جا سکتا)

امام ابو حنیفہؒ کا نظریہ اور دلیل

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے اپنے ذا رحم محرم کو کوئی چیز ہبہ کی تو وہ اس سے واپس نہیں لے سکتا۔ اور ان کی پہلی دلیل حضرت سمرہؓ کی مرفوع روایت ہے جس میں یہ الفاظ ہیں إِذَا كَانَتِ الْهِبَةُ لِذِيْ رَحِمٍ مَحْرَمٍ لَمْ يَرْجِعْ حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں، رواہ البیہقی والدار قطنی والحاکم (الکوکب الدری ج ۱ ص ۳۷۹)

اعتراض اور اس کا جواب

اس روایت پر اعتراض ہے کہ قاضی شوکانی فرماتے ہیں کہ ابن الجوزی نے کہا کہ سمرہؓ کی حدیث ضعیف ہے۔ (نیل الاوطار ج ۶ ص ۴)

اس کے جواب میں حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ حافظ ابن حجرؒ کی الدرایہ سے نقل کرتے ہیں کہ قَالَ الْحَاكِمُ صَحِيْحٌ وَقَالَ الدَّارَقُطْنِيُّ تَفَرَّدَ بِهٖ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ جَعْفَرٍ عَنِ ابْنِ الْمُبَارَكِ عَنْ حَمَّادِ بْنِ سَلَمَةَ عَنْ قَتَادَةَ عَنْهُ وَظَنَّ ابْنُ الْجَوْزِيِّ أَنَّهُ ابْنُ الْمَدِيْنِيِّ فَضَعَّفَهُ وَلَيْسَ كَمَا ظَنَّ بَلْ هُوَ الرَّقِّيُّ وَهُوَ ثِقَةٌ (حاشیہ ۲ الکوکب الدری ج ۱ ص ۳۷۹)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ حضرت سمرہ کی حدیث کو امام حاکم نے صحیح کہا ہے اور امام دار قطنی نے کہا ہے کہ اس روایت کو عبد اللہ بن المبارکؒ سے نقل کرنے میں عبد اللہ بن جعفر متفرد ہے اور ابن الجوزی نے یہ خیال کر کے کہ یہ ابن المدینی ہے' اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ الرقی ہے جو کہ ثقہ ہے۔

امام صاحبؒ کی دوسری دلیل

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں وَالْعَمَلُ عَلٰی هٰذَا عِنْدَ بَعْضِ اَهْلِ الْعِلْمِ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَغَيْرِهِمْ قَالُوْا مَنْ وَهَبَ هِبَةً لِذِيْ رَحِمٍ مَحْرَمٍ فَلَيْسَ لَهُ اَنْ يَّرْجِعَ فِيْ هِبَتِهٖ جب امام ترمذیؒ نے فرمادیا کہ بعض صحابہؓ کا اس کے مطابق عمل اور نظریہ تھا تو یہ بھی امام صاحب کی دلیل ہے۔ اور علامہ عینیؒ نے فرمایا ہے کہ جو قول امام ابو حنیفہؒ کا ہے' وہی قول سعید بن المسیبؒ' عمر بن عبد العزیزؒ' شریح القاضیؒ الاسود بن یزیدؒ' الحسن البصریؒ' امام نخعیؒ' امام شعبیؒ' حضرت عمرؓ حضرت علیؓ حضرت ابن عمرؓ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت فضالہ بن عبید کا ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۱۳ ص ۱۴۸)

امام شافعیؒ کا نظریہ اور دلیل

امام شافعیؒ کے نزدیک باپ اپنے بیٹے کو دیا ہوا ہبہ واپس لے سکتا ہے او ان کی پہلی دلیل حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے جس میں یہ الفاظ ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا لَا يَحِلُّ لِاَحَدٍ اَنْ يُّعْطِيَ عَطِيَّةً فَيَرْجِعَ فِيْهَا اِلَّا الْوَالِدَ فِيْمَا يُعْطِيْ وَلَدَهٗ (ترمذی ج ۱ ص ۲۴۳۔ ابو داؤد ج ۲ ص ۱۴۳) حلال نہیں ہے کہ کوئی آدمی اپنا ہبہ واپس لے' ہاں باپ اپنے بیٹے کو دیا ہوا ہبہ واپس لے سکتا ہے۔

جواب

حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ اِلَّا الْوَالِدَ استثناء منقطع ہے اور باپ جو اپنے بیٹے کو دی ہوئی چیز لیتا ہے' اس کو رجوع نہیں کہتے اس لیے کہ بیٹے کی دیگر املاک کی طرح یہ بھی اس کی ملکیت ہو گئی اور بیٹے کی ملکیت سے باپ کو لینا جائز ہے۔ (الکوکب الدری ج ۱ ص ۳۷۹) اور قاضی شوکانیؒ احناف کی تردید کرنے کے باوجود لکھتے ہیں وَيُؤَيِّدُ مَا ذَهَبَ اِلَيْهِ الْجُمْهُوْرُ الْاَحَادِيْثُ الْاٰتِيَةُ فِي الْبَابِ الَّذِيْ بَعْدَهٗ هٰذَا الْمُصَرِّحَةُ بِاَنَّ الْوَلَدَ وَمَا مَلَكَ لِاَبِيْهِ فَلَيْسَ رُجُوْعُهٗ فِي الْحَقِيْقَةِ رُجُوْعًا (نیل الاوطار ج ۶ ص ۱۳) اور جمہور کی تائید

وہ روایات کرتی ہیں جو اگلے باب میں آ رہی ہیں جن میں صراحت ہے کہ بیٹا بھی اور جو کچھ اس کی ملکیت میں ہے وہ اس کے باپ کی ہے تو اس کا رجوع (دی ہوئی چیز کو واپس لینا) دراصل رجوع نہیں ہے۔

اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں فَجَوَابُهُ اَنَّ فِیْ مَالِ الْوَلَدِ حَقًّا لِلْوَالِدِ اَيْضًا فَاِذَا اَخَذَ شَيْءً وَلَدِهٖ فَلَيْسَ بِرَجُوْعٍ عَنِ الْهِبَةِ فِي الْوَاقِعِ وَالْحَقِيْقَةِ (العرف الشذی ص ۴۰۱) تو اس کا جواب یہ ہے کہ بیٹے کے مال میں باپ کا بھی حق ہے تو جب وہ اپنے بیٹے کے مال ہی سے کچھ لے رہا ہے تو یہ حقیقت اور واقع میں ہبہ سے رجوع نہیں ہے یعنی بیٹا بھی ذا رحم محرم میں شامل ہے اس لیے باپ اپنے بیٹے کو دیے ہوئے ہبہ کو واپس نہیں لے سکتا اور مجبوری کی وجہ سے وہ اپنے بیٹے کے مال سے جو لے گا' اس پر رجوع کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

اعتراض اور اس کا جواب

اس پر اعتراض ہے کہ اگر اِلَّا الْوَالِدِ کی استثناء متصل نہیں تو اس کو یہاں کیوں بیان کیا گیا ہے؟

تو جواب میں حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ جب حضور علیہ السلام نے اپنے ہبہ کو واپس لینے والے کے بارے میں فرمایا کہ وہ ایسے ہے جیسے قے کر کے چاٹنے والا تو ظاہر الفاظ کو دیکھ کر صحابہ کو پریشانی ہو سکتی تھی اس چیز کے بارے میں جو وہ اپنے بیٹوں کو ہبہ کرتے تھے تو آپؐ نے یہ استثناء فرما کر ان کی پریشانی کو دور کر دیا گویا کہ ان کے لیے اپنے بیٹوں کی ملکیت کو اپنی ملکیت میں لانا جائز قرار دیا اگرچہ یہ ہبہ میں رجوع کی صورت میں ہی ہو۔ (الکوکب الدری ج ۱ ص ۳۷۹)

اعتراض اور اس کے جوابات

حضرت سمرہؓ کی روایت میں ہے کہ ذا رحم محرم کو اگر ہبہ کیا ہو تو رجوع نہیں کر سکتا اور ترمذی شریف وغیرہ کی حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں ہے کہ باپ نے اگر اپنے بیٹے کو ہبہ کیا ہو تو رجوع کر سکتا ہے حالانکہ بیٹا بھی ذا رحم محرم ہے تو دونوں روایتوں میں تعارض ہے۔

پہلا جواب: حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ اِلَّا الْوَالِدِ کی استثناء منقطع ہے لہٰذا ذا رحم

محرم کو دیے ہوئے ہبہ میں رجوع نہیں ہو سکتا۔

دوسرا جواب: حضرت سمرہؓ والی روایت کو امام حاکمؒ نے صحیح علیٰ شرط البخاری کہا ہے۔ (مستدرک ج ۲ ص ۵۲) اور علامہ ابن حجرؒ نے بھی ابن الجوزیؒ کا رد کر کے اس کو صحیح تسلیم کیا ہے جبکہ حضرت ابن عمرؓ والی روایت عمروؒ بن شعیب کی سند سے ہے جو اگرچہ صحیح ہے مگر تعارض کی صورت میں حضرت سمرہؓ والی روایت کا ہی اعتبار ہوگا۔

امام شافعیؒ کی دوسری دلیل اور اس کا جواب

حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت ہے کہ میرے باپ نے مجھے ایک غلام دیا تو حضور علیہ السلام نے اس سے پوچھا کہ کیا تو نے اپنے دوسرے بیٹوں کو بھی اسی طرح دیا ہے تو اس نے کہا نہیں تو آپؐ نے فرمایا فَارْجِعْهُ اس کو واپس لے لے (بخاری ج ۱ ص ۳۵۲) جب آپ نے فَارْجِعْهُ فرمایا تو اس سے معلوم ہوا کہ باپ اپنے بیٹے کو دیا ہوا ہبہ واپس لے سکتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تفصیلی روایت میں ہے۔ حضرت نعمانؓ فرماتے ہیں کہ آپ نے میرے باپ سے فرمایا اَيَسُرُّكَ اَنْ يَكُوْنُوْا فِي الْبِرِّ سَوَاءً؟ قَالَ بَلٰى قَالَ فَلَا اِذًا (بخاری ج ۱ ص ۳۵۲ وغیرہ) کیا تجھے یہ بات اچھی لگتی ہے کہ تیرے سارے بیٹے تیرے ساتھ اچھا سلوک کرنے میں برابر ہوں تو اس نے کہا کیوں نہیں؟ تو آپ نے فرمایا تو پھر ایسا نہ کر۔ (یعنی ان میں سے کسی کو ہبہ میں فضیلت نہ دے) اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے فرمایا فَاِنِّيْ لَا اَشْهَدُ عَلٰى جَوْرٍ (بخاری ج ۲ ص ۳۵۲۔ مسلم ج ۲ ص ۳۷) پس بیشک میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا۔

قاضی شوکانی فرماتے ہیں کہ اس روایت کا کئی طرح سے جواب دیا گیا ہے۔ ایک جواب یہ ہے کہ باپ نے سارا مال حضرت نعمان کو دے دیا تھا۔ یہ جواب ابن عبد البر سے منقول ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ ابھی تک مشورہ کی حد تک تھا' ہبہ نہیں کیا تھا تو آپؐ نے مشورہ دیا کہ ایسا نہ کر۔ یہ طبری سے منقول ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ حضرت نعمان بالغ تھے اور انہوں نے ابھی تک ہبہ پر قبضہ نہیں کیا تھا تو باپ کے لیے رجوع جائز تھا۔ یہ امام طحاویؒ سے منقول ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی جوابات قاضی شوکانیؒ نے نقل کیے ہیں۔ (نیل الاوطار ج ۶ ص ۹)

اس ساری بحث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کا فَارْجِعْهُ فرمانا خاص حکمت کے

پیش نظر تھا اور وہ یہ کہ دوسرے بیٹوں کے دل میں باپ کے بارے میں کوئی برا خیال نہ آئے۔ علامہ عینی فرماتے ہیں کہ فَارْجِعْهُ میں امر وجوب کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک آدمی حضور علیہ السلام کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو اس کا بیٹا آیا تو اس آدمی نے اس کو بوسہ دے کر گود میں بٹھا لیا اور پھر اس کی بیٹی آئی تو اس نے اپنے سامنے بٹھا دیا تو آپ نے فرمایا اَلاَّ سَوَّيْتَ بَيْنَهُمَا تو نے ان دونوں میں برابری کیوں نہیں کی؟ اور یہ وجوب کے لیے نہیں تھا بلکہ انصاف اور احسان کے لیے تھا۔ (عمدۃ القاری ج ۱۳ ص ۱۴۵)

امام احمدؒ کی دلیل اور اس کا جواب

امام احمد کے نزدیک کوئی بھی ہبہ واپس نہیں لے سکتا اور ان کی دلیل حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے جس میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اَلْعَائِدُ فِیْ هِبَتِهٖ كَالْعَائِدِ فِیْ قَيْئِهٖ (بخاری ج ۱ ص ۳۵۷۔ مسلم ج ۲ ص ۳۶) اپنے ہبہ کو واپس لینے والا ایسا ہے جیسا کہ اپنی قے کو چاٹنے والا۔ اس میں چونکہ کوئی قید نہیں، علی الاطلاق ہے، اس لیے امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ کوئی بھی اپنے ہبہ کو واپس نہیں لے سکتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب صحیح روایات سے استثناء ثابت ہے تو اس استثناء کا اعتبار کیا جائے گا۔

امام مالکؒ کا نظریہ اور دلیل

امام مالکؒ کے پاس اپنے نظریہ پر کوئی روایت نہیں ہے کہ صرف میاں بیوی آپس میں کیے ہوئے ہبہ کو واپس نہیں لے سکتے، باقی لوگ لے سکتے ہیں۔ امام بخاریؒ نے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا نظریہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا لَا يَرْجِعَانِ (بخاری ج ۱ ص ۳۵۲)

احناف کے نزدیک بھی چونکہ میاں بیوی آپس میں کیے ہوئے ہبہ کو واپس نہیں لے سکتے اس لیے صاحب ہدایہ فرماتے ہیں لِاَنَّ الْمَقْصُوْدَ فِيْهَا الصِّلَةُ كَمَا فِی الْقَرَابَةِ (ہدایہ ج ۳ ص ۲۴۰) کہ ہبہ میں مقصود صلہ رحمی ہے جیسا کہ قرابت میں ہے تو جیسے قرابت میں صلہ رحمی کا لحاظ رکھتے ہوئے ہبہ کی واپسی نہیں ہو سکتی اسی طرح میاں بیوی کے درمیان کیے گئے ہبہ کی واپسی نہیں تا کہ قطع رحمی لازم نہ آئے۔

البحث الثانی۔ ہبہ واپس لینا حرام ہے یا مکروہ؟

اس بارہ میں ائمہ کرام کے اقوال مختلف ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ کا نظریہ اور دلیل

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ہبہ واپس لینا حرام نہیں ہے بلکہ مکروہ ہے اور باقی ائمہ فرماتے ہیں کہ ہبہ واپس لینا حرام ہے۔

امام صاحب کی دلیل ابن ماجہ ص ۱۷۴ وغیرہ کی روایت ہے۔ ابن ماجہ کی روایت کے الفاظ ہیں۔ اَلْوَاهِبُ اَحَقُّ بِهِبَتِهٖ مَا لَمْ یُثَبْ مِنْهَا کہ واہب اپنے ہبہ کا زیادہ حق دار ہے جبکہ اس نے اس کا عوض نہ لیا ہو۔ قاضی شوکانی فرماتے ہیں فَاِنْ صَحَّتْ هٰذِهِ الْاَحَادِیْثُ کَانَتْ مُخَصِّصَةً لِعُمُوْمِ حَدِیْثِ الْبَابِ فَیَجُوْزُ الرُّجُوْعُ فِی الْهِبَةِ قَبْلَ الْاِثَابَةِ عَلَیْهَا وَمَفْهُوْمُ حَدِیْثِ سَمُرَةَ یَدُلُّ عَلٰی جَوَازِ الرُّجُوْعِ فِی الْهِبَةِ لِغَیْرِ ذِی الرَّحْمِ (نیل الاوطار ج ۶ ص ۴) پس اگر یہ روایات صحیح ہیں تو یہ حدیث الباب (اَلْعَائِدُ فِیْ هِبَتِهٖ کَالْعَائِدِ فِیْ قَیْئِهٖ) کے عمومی مفہوم سے خاص ہوں گی۔ تو عوض لینے سے پہلے ہبہ میں رجوع جائز ہوگا اور حضرت سمرہؓ کی حدیث کا مفہوم دلالت کرتا ہے کہ ذی رحم کے علاوہ کسی اور کو ہبہ کرنے کی صورت میں رجوع (واپس لینا) جائز ہے۔ پس اگر یہ روایات صحیح ہیں تو یہ حدیث الباب (اَلْعَائِدُ فِیْ هِبَتِهٖ کَالْعَائِدِ فِیْ قَیْئِهٖ) کے عمومی مفہوم سے خاص ہوں گی۔ تو عوض لینے سے پہلے ہبہ میں رجوع جائز ہوگا اور حضرت سمرہؓ کی حدیث کا مفہوم دلالت کرتا ہے کہ ذی رحم کے علاوہ کسی اور کو ہبہ کرنے کی صورت میں رجوع (واپس لینا) جائز ہے۔ قاضی شوکانیؒ نے یہ روایت ذکر کر کے امام حاکم کی تصحیح نقل کی ہے اور حضرت عمرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایات کا حوالہ دے کر کوئی جرح نہیں کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ روایات ان کے نزدیک صحیح ہیں۔

دیگر ائمہ کی پہلی دلیل اور اس کے جوابات

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ بے شک نبی کریم ﷺ نے فرمایا اَلْعَائِدُ فِیْ هِبَتِهٖ کَالْعَائِدِ فِیْ قَیْئِهٖ قَالَ قَتَادَةُ وَلَا نَعْلَمُ الْقَیْءَ اِلَّا حَرَامًا (ابو داؤد ج ۲ ص ۱۴۳) فرماتے ہیں کہ ہبہ واپس لینے کو قے چاٹنے سے تشبیہ دی ہے اور قتادہؒ نے کہا ہے کہ قے حرام ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ ہبہ واپس لینا حرام ہے۔

اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ اسی قسم کے الفاظ اپنے صدقہ کو خریدنے والے کے بارے میں آتے ہیں جیسا کہ بخاری ج ۱ ص ۳۵۷ میں ہے اور اس سے بالاتفاق حرمت مراد

نہیں ہے۔ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں وَقَالَ ابنَ المُنذِرِ لَیسَ لِاَحَدٍ اَنْ یَّتَصَدَّقَ ثُمَّ یَشتَرِیَهَا لِلنَّهیِ الثَّابِتِ وَیَلزَمَ مِنْ ذٰلِکَ فَسَادَ البَیعِ اِلَّا اَنْ ثَبَتَ الاِجمَاعُ عَلٰی جَوَازِہِ (فتح الباری ج ۴ ص ۹۵) ابن المنذر نے کہا ہے کہ کسی کے لیے درست نہیں ہے کہ اپنے صدقہ کو خریدے اس لیے کہ اس بارے میں نہی ثابت ہے اور اس سے بیع کا فساد لازم آتا ہے مگر بیشک اس کے جواز پر اجماع ثابت ہے۔ تو جیسے اپنا صدقہ خریدنے کے معاملہ میں قے چاٹنے کے ساتھ تشبیہ کو کراہت پر محمول کیا گیا ہے' اسی طرح یہاں بھی کراہت پر ہی محمول کریں گے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ قے کی حرمت کے ساتھ تشبیہ نہیں ہے بلکہ تشبیہ صرف اس کے گندا ہونے کی وجہ سے نفرت دلانے میں ہے۔ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں قَالَ القُرطُبِیُّ وَهٰذَا هُوَ الظَّاهِرُ مِنْ سِیَاقِ الحَدِیثِ وَیَحتَمِلَ اَنْ یَّکُونَ التَّشبِیهُ لِلتَّنفِیرِ خَاصَّةً لِکَونِ القَیْءِ مِمَّا یَستَقذَرُ وَهُوَ قَولُ الاَکثَرِ (فتح الباری ج ۴ ص ۹۶) امام قرطبی نے کہا کہ سیاق حدیث سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے حرمت ثابت ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ تشبیہ صرف نفرت دلانے میں ہو اس لیے کہ قے ان چیزوں میں سے ہے جن کو گندا سمجھا جاتا ہے اور یہی اکثر کا قول ہے۔

جب تشبیہ صرف نفرت دلانے میں ہے کہ جیسے قے کو چاٹنے سے نفرت کی جاتی ہے' اسی طرح ہبہ واپس لینے سے نفرت کی جائے تو نہ اس میں حرمت کے ساتھ تشبیہ ہے اور نہ اس سے حرام ثابت ہوتا ہے۔

دیگر ائمہ کی دوسری دلیل اور اس کا جواب

یہ حضرات کہتے ہیں کہ ہبہ واپس لینے کو کتے کی اپنی قے کو چاٹنے سے تشبیہ دی گئی ہے جیسا کہ ترمذی ج ۱ ص ۲۴۲ اور ابو داؤد ج ۲ ص ۱۴۳ وغیرہ میں ہے۔

اس کے جواب میں علامہ طحاوی فرماتے ہیں کہ کتا مکلف نہیں ہے اور کتے کا اپنی قے کو چاٹنا حرام نہیں ہے بلکہ ناپسندیدہ فعل ہے تو اس سے حرمت ثابت نہیں ہوتی (طحاوی ج ۲ ص ۱۹۸) علامہ ابن حجرؒ فتح الباری ج ۶ ص ۱۶۳ میں امام طحاوی پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس جیسی چیزوں میں مبالغہ فی الزجر مراد ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے جس نے شطرنج کھیلا گویا اس نے خنزیر کے خون میں اپنے ہاتھ رنگے۔ علامہ ابن حجرؒ کے جواب کو دیکھا جائے تو اس سے بھی احناف کی تائید ہوتی ہے اس لیے کہ بقول ان کے قے چاٹنا مراد

نہیں بلکہ مبالغہ فی الزجر مراد ہے تو جب حقیقت مراد ہی نہیں جس پر شوافع کی دلیل کا مدار ہے تو حرمت کیسے ثابت ہوگی؟

تیسری دلیل اور اس کا جواب

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے جس میں یہ الفاظ ہیں لَا یَحِلّ لِاَحَدٍ اَنْ یُعْطِیَ عَطِیَّۃً فَیَرْجِعَ مِنْهَا (ترمذی ج ۱ ص ۲۴۳۔ ابو داؤد ج ۲ ص ۱۴۳ وغیرہ) فرماتے ہیں کہ جب عطیہ واپس لینا حلال نہیں تو اس سے جواز کی نفی ثابت ہوتی ہے۔

اس کے جواب میں امام طحاوی ج ۲ ص ۱۹۹ میں فرماتے ہیں کہ لَا یَحِلّ لِاَحَدٍ سے مراد نفی جواز نہیں بلکہ تحذیر عن الرجوع مراد ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسے لَا یَحِلّ لِلْوَاجِدِ رَدَّ السَّائِلِ یعنی گنجائش والے کو مناسب نہیں کہ وہ سائل کو خالی ہاتھ واپس کرے۔ جیسے یہاں لَا یَحِلّ کا معنی نفی جواز نہیں ہے' اسی طرح ہبہ والی روایت میں بھی نفی جواز مراد نہیں بلکہ کراہت مراد ہے۔ اس لیے کہ حضرت عبد اللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ اپنے ہبہ کو واپس لینے والے کی مثال اس کتے جیسی ہے جو اپنی قے کو چاٹتا ہے اور اس کے آخر میں ہے فَاِذَا اسْتَرَدَّ الْوَاهِبُ فَلْيُوقَفْ فَلْيُعَرَّفْ بِمَا اسْتَرَدَّ ثُمَّ لِيُرَدَّ عَلَيْهِ مَا وَهَبَ (مسند احمد ج ۲ ص ۱۷۵) جب واہب اپنا ہبہ واپس مانگے تو اس کو کھڑا کر کے جو واپس مانگ رہا ہے' اس کی تشہیر کی جائے پھر اس کا ہبہ واپس کر دیا جائے۔ اس روایت کے ابتدائی حصہ میں ممانعت اور آخری حصہ سے اجازت ثابت ہو رہی ہے۔ اگر ممانعت کو کراہت پر محمول کریں تو اشکال باقی نہیں رہتا ورنہ روایت کے ابتدائی اور آخری حصہ میں تعارض ہوگا۔

البحث الثالث۔ ہبہ واپس لینے کے لیے قضاء قاضی کی ضرورت ہے یا نہیں؟

احناف کہتے ہیں کہ ہبہ واپس لینے کے لیے یا تو دونوں کی رضامندی ہونی چاہئے یا پھر قاضی رد کا فیصلہ کرے اور امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ جس کو ہبہ کیا گیا ہے' وہ موہوبہ چیز پر قبضہ کرنے کے بعد اس کا مالک بن گیا۔ اب اس سے واپس لینے کے لیے یا تو اس کا راضی ہونا ضروری ہے یا پھر واہب اس معاملہ کو قاضی کے سامنے پیش کرے اور قاضی موہوب لہ کو ہبہ واپس کرنے کا حکم دے اس لیے کہ ہبہ کا عقد دونوں کی رضا سے ہوا تھا تو اس کا فسخ بھی دونوں کی رضا سے

ہونا چاہیے اور واہب کو موہوب لہ پر ولایت نہیں اس لیے اس کے انکار پر اس شخص سے حکم دلوائے جس کو اس پر ولایت حاصل ہے اور قاضی کو ولایت حاصل ہے اس لیے اس کے سامنے معاملہ پیش کر کے اس سے رد کا حکم دلوائے اور امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ نہ دونوں کی رضا ضروری ہے اور نہ قضاء قاضی کی ضرورت ہے اس لیے کہ جب اس کو رجوع کا حق ہے تو وہ اپنا حق لے سکتا ہے۔ علامہ عینی آگے فرماتے ہیں کہ دونوں کی رضا یا قضاء قاضی اس لیے ضروری ہے کہ رجوع فی الہبہ کا مسئلہ علماء (تابعین) کے درمیان مختلف فیہ ہے اور اصل رجوع میں ضعف ہے اور اس کے مقصود کے حصول یا عدم حصول میں خفاء ہے اس لیے کہ اس کا مقصود ہبہ سے ثواب بھی ہو سکتا ہے اور جود و سخاوت کا اظہار بھی۔ اگر مقصود ثواب ہے تو ثواب حاصل ہو گیا اس لیے رجوع نہیں ہو سکتا اور اگر مقصود اس کے علاوہ ہے تو وہ حاصل نہ ہوا اس لیے رجوع کر سکتا ہے تو جب یہ معاملہ متردد ہے تو قضاء قاضی کی ضرورت ہے تا کہ رجوع کے پہلو کو عدم پر ترجیح دی جا سکے۔ (عینی شرح ہدایہ ج ۳ ص ۶۰۹، ۶۱۰ ملخصا)

بَابُ مَا جَاءَ فِي الْعَرَايَا وَالرُّخْصَةِ فِي ذَالِكَ

(عرایا اور اس میں رخصت کا بیان)

عَرِيَّةٌ بروزن فَعِيلَةٌ ہے اور اس کی جمع عَرَايَا آتی ہے۔ عریہ کا لغوی معنی علامہ ابن حجر فتح الباری ج ۴ ص ۳۹۰ میں اور امیر یمانی سبل السلام ج ۳ ص ۸۵۹ میں یہ کرتے ہیں کہ درختوں پر لگا ہوا پھل کسی کو ہبہ کرنا۔ اور صاحب ہدایہ نے کہا ہے اَلْعَرِيَّةُ اَلْعَطِيَّةُ لُغَةً (ہدایہ ج ۳ ص ۳۱) کہ عریہ لغت میں عطیہ کو کہتے ہیں اور امام طحاوی نے بھی ج ۲ ص ۱۷۴ میں یہی فرمایا ہے اور علامہ ابن رشدؒ بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۱۹۴ میں فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک عریہ کا معنی ہبہ ہے اور اس پر دلیل لغت ہے اس لیے کہ اہل لغت عریہ ہبہ ہی کو کہتے ہیں اور اس کے شرعی معنی میں مختلف اقوال ہیں۔ علامہ عینی نے شرح الہدایہ ج ۴ ص ۸۷، ۸۸ میں اور امام طحاوی نے ج ۲ ص ۱۷۲ تا ۱۷۵ میں یہ اقوال اور ان کے قائلین کا ذکر کیا ہے۔ اور علامہ ابن حجر فتح الباری ج ۵ ص ۲۹۵ میں فرماتے ہیں ثُمَّ اِنَّ صُوَرَ الْعَرِيَّةِ كَثِيْرَةٌ کہ عریہ کی بہت سی صورتیں ہیں۔ (اہل عرب کی عادت تھی کہ اگر کوئی معاشی لحاظ سے کمزور ہوتا تو اس کو کچھ عرصہ دودھ والا جانور دودھ پینے کے لیے دے

دیتے اور اس کو مَنِیْحَہ کہتے ہیں۔ اسی طرح باغات والے حضرات ان لوگوں کو جن کے باغات نہیں ہوتے تھے' ان کو تازہ پھل کھانے کے لیے چند درخت دے دیتے تھے تا کہ وہ تازہ پھل کھائیں' اس کو عریہ کہا جاتا ہے)

ائمہ اربعہؒ نے اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق عریہ کا معنی متعین کیا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کا نظریہ

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ کوئی آدمی کسی دوسرے کو چند درخت پھل کھانے کے لیے ہبہ کے طور پر دے اور ان کی ملکیت اپنی ہی رکھے پھر اس کے اپنے باغ میں آنے جانے کی وجہ سے تنگ ہو جائے اور اس کو درخت پر لگے ہوئے پھلوں کی جگہ اتارے ہوئے پھل دے دے تو اس کو عریہ کہتے ہیں۔ اس صورت میں احناف کے نزدیک یہ ہوگا کہ واہب نے اپنے ہبہ کی نوعیت بدل دی ہے اس لیے کہ جس کو ہبہ کیا جائے' وہ جب تک موہوبہ چیز پر قبضہ نہ کرلے' اس وقت تک اس کا مالک نہیں بنتا اور اس کو جو درخت دیے گئے تھے' ان کا پھل ابھی تک درختوں پر ہے تو اس کا قبضہ نہ ہوا۔ جب قبضہ نہیں تو ابھی تک وہ ان پھلوں کا مالک بھی نہیں۔ ایسی صورت پر بیع کا اطلاق صرف صورۃً یا مجازاً ہے۔ مولانا ظفر احمد عثمانی فرماتے ہیں کہ کبھی بیع کا اطلاق ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ صورۃً بدلنے پر بھی کیا جاتا ہے اگرچہ حقیقتاً استبدال نہ ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے أُولٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدٰى (سورۃ البقرہ آیت ۱۶) (یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کو خریدا) (اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۲۴۸) اسی طرح إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ (سورۃ التوبہ آیت ۱۱۱) میں ہے۔ یہاں بھی حقیقتاً استبدال نہیں اس لیے کہ موہوب لہ کی جانب سے واہب کو کچھ نہیں دیا گیا بلکہ جو واہب نے خود اس کو دیا تھا' اس کو اس نے اتارے ہوئے پھلوں سے بدل دیا ہے تو یہ صورۃً استبدال ہے اور اس پر بیع کا اطلاق مجازاً کیا گیا ہے اس لیے کہ موہوب لہ ابھی تک قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے ان پھلوں کا مالک بنا ہی نہیں ہے۔

امام صاحبؒ کی دلیل

امام طحاویؒ نے حضرت زید بن ثابتؓ کی روایت نقل کی ہے جس میں انہوں نے عریہ کی تفسیر کی ہے اور اس میں الفاظ ہیں رَخَّصَ فِي الْعَرَايَا أَيْ فِي النَّخْلَةِ وَالنَّخْلَتَيْنِ

تَوَهَبَانِ لِلرَّجُلِ (طحاوی ج ۲ ص ۱۷۵) کہ آپ نے عرایا میں رخصت دی ہے یعنی ایک یا دو درختوں میں جو آدمی کو ہبہ کیے جائیں۔ حضرت زید بن ثابتؓ نہ صرف یہ کہ مدنی ہیں بلکہ صاحب باغات بھی تھے اور باغات مدینہ میں بکثرت تھے اس لیے ان کی تفسیر راجح ہے۔ مولانا ظفر احمد عثمانی اس روایت کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ اس کی سند حسن صحیح ہے (اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۱۳۲) اسی طرح امام بخاریؒ نے حضرت ابن عمرؓ اور سفیان بن حسینؒ سے بھی عریہ کی یہی تفسیر نقل کی ہے جو امام ابو حنیفہؒ کرتے ہیں۔ (بخاری ج ۱ ص ۲۹۲) اور امام ابو داؤدؒ نے اسحاقؒ اور عبد ربہ بن سعید الانصاریؒ سے بھی عریہ کی یہی تفسیر نقل کی ہے۔ (ابو داؤد ج ۲ ص ۱۲۲)

احناف کے نزدیک عرایا بیع کی قسم نہیں ہے

احناف کہتے ہیں کہ عرایا بیع کی قسم نہیں ہے اس لیے کہ اگر اس کو بیع تسلیم کیا جائے تو لغت کے بھی خلاف ہے اور پھر اس میں ربا بھی پایا جاتا ہے۔

احناف پر پہلا اعتراض یہ ہے کہ اگر عرایا بیع کی قسم نہیں تو پھر اِلَّا الْعَرَایَا سے اس کی استثناء کیوں کی گئی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ استثناء متصل نہیں ہے بلکہ منقطع ہے جیسا کہ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْا اِلَّا اِبْلِیْسَ (بقرہ آیت ۳۴) میں اِلَّا اِبْلِیْسَ کی استثناء ملائکہ سے ہے۔ یا یہ کہ مجازاً عریہ پر بیع کا اطلاق کر کے استثناء کی گئی ہے اس لیے کہ صورۃً بیع ہے اور پہلے مولانا ظفر احمد عثمانی کے حوالہ سے گزر چکا ہے کہ صرف صورۃً بیع کو بیع وشرا سے تعبیر کرتے رہتے ہیں جیسا کہ اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی (بقرہ آیت ۱۶) اور بِئْسَ مَا اشْتَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ (بقرہ آیت ۹۰) وغیرہ میں ہے۔

احناف پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر عرایا ہبہ ہے تو اس کا انحصار پانچ وسق میں کیسے درست ہوگا؟ اس لیے کہ ہبہ کی تو کوئی حد مقرر نہیں ہوتی۔

اس کے جواب میں امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ جن روایات میں خَمْسَةَ اَوْسُقٍ کے الفاظ ہیں، ان میں اتنی مقدار میں عریہ کا جواز ثابت ہوتا ہے اور اس سے زائد کی نفی نہیں ہوتی بلکہ اس بارے میں روایت خاموش ہے۔ اگر یوں ہوتا لَا تَکُوْنَ الْعَرَایَةَ اِلَّا فِیْ خَمْسَةِ اَوْسُقٍ تو تب انحصار ہوتا اور زائد کی ممانعت ثابت ہوتی اور جب ایسا نہیں ہے تو اس میں انحصار اور زائد کی ممانعت نہیں ہے (طحاوی ج ۲ ص ۱۷۴) نیز چونکہ یہ ظاہراً بیع

ہے جس کو خلاف الاصل جائز قرار دیا گیا ہے تو اس میں مناسب یہی ہے کہ اس کی مقدار متعین کر دی جائے تا کہ معاملات ربویہ کے لیے ایک اصل نہ بن جائے۔

اور علامہ ابن الہمامؒ فرماتے ہیں کہ یہ مقدار لوگوں کی عادت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بیان کی گئی ہے' اس میں انحصار نہیں ہے اس لیے کہ وہ لوگ خمسہ اوسق کی مقدار پر عریہ کرتے تھے اس لیے اس کو خاص طور پر ذکر کر دیا گیا ہے (فتح القدیر ج ۵ ص ۱۹۶)

امام شافعیؒ کا نظریہ

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ عرایا مزابنہ میں سے استثنائی صورت ہے یعنی درختوں پر لگے ہوئے پھل کو اتارے ہوئے خشک پھل کے بدلے بیچنے کو مزابنہ کہتے ہیں اور اسی میں سے پانچ وسق یا اس سے کم مقدار کو عریہ کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ عرب کی عادت تھی کہ غریب لوگ تازہ پھل کا شوق رکھتے مگر ان کے پاس رقم نہ ہوتی اور خشک پھل ہوتا تو یہ لوگ خشک پھل دے کر درختوں کا تازہ پھل لے لیتے تھے تو حضور علیہ السلام نے پانچ وسق تک اس کی اجازت دے دی۔

حضرت مدنیؒ کی تقریر ترمذی ص ۰۰۷ میں ہے کہ ساٹھ صاع کا ایک وسق ہوتا ہے اور پانچ وسق تقریباً" چھ من ہوتا ہے۔

شوافع کی پہلی دلیل اور اس کا جواب

شوافع حضرات کہتے ہیں کہ بیع مزابنہ درست نہیں مگر عرایا جائز اور درست ہے۔ ان حضرات کی دلیل وہ روایات ہیں جن میں رَخَّصَ فِی الْعَرَایَا (بخاری ج ۱ ص ۲۹۲۔ مسلم ج ۲ ص ۸) اور اِلاَّ الْعَرَایَا کے الفاظ ہیں۔ اس کا جواب پہلے گزر چکا ہے کہ عریہ لغت اور علماء کے اقوال کی روشنی میں بیع کی قسم نہیں ہے بلکہ ہبہ ہے۔ چونکہ صورۃ" بیع ہے اس لیے رَخَّصَ فِی الْعَرَایَا کا ذکر کر دیا گیا ہے اور اِلاَّ الْعَرَایَا میں استثناء متصل نہیں بلکہ منقطع ہے۔

دوسری دلیل اور اس کا جواب

امام ترمذیؒ نے ج ۱ ص ۲۴۴ میں حضرت زید بن ثابتؓ کی روایت پیش کی ہے جس میں ہے نَھٰی عَنِ الْمُحَاقَلَۃِ وَالْمُزَابَنَۃِ اِلاَّ اَنَّہٗ قَدْ اَذِنَ لِاَھْلِ الْعَرَایَا اَنْ یَّبِیْعُوْھَا بِمِثْلِ خَرْصِھَا کہ نبی کریم ﷺ نے بیع محاقلہ اور مزابنہ سے منع فرمایا ہے مگر اہل عرایا کو اجازت

دی ہے کہ وہ تخمینہ کے مطابق خرید وفروخت کرلیں۔ اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ عرایا کی مزابنہ سے استثناء ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ خود امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں محمد بن اسحاقؒ ہے۔ (اس کی بہ نسبت دوسری روایات صحیح ہیں جن میں عرایا کی رخصت کا ذکر ہے' استثناء نہیں ہے)

تیسری دلیل اور اس کا جواب

قاضی شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ شوافع حضرات نے اس روایت سے بھی دلیل پکڑی ہے جو امام شافعیؒ نے مختلف الحدیث میں حضرت زید بن ثابتؓ سے نقل کی ہے کہ انصار میں سے کچھ لوگوں نے آکر حضور علیہ السلام سے عرض کی کہ ہم لوگ محتاج ہیں' تازہ پھل کھانے کا ہمیں شوق ہوتا ہے مگر نقد رقم نہیں ہوتی فَرَخَّصَ لَهُمْ اَنْ يَبْتَاعُوا الْعَرَايَا بِخَرْصِهَا مِنَ التَّمَرِ تو حضور علیہ السلام نے ان کو بیع عرایا کی اجازت دی کہ وہ اتارے ہوئے پھل کے بدلے میں تخمینہ لگا کر درخت پر لگے ہوئے پھل کو خرید لیا کریں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے اس پر بیع کا اطلاق فرمایا ہے۔

اس کا جواب قاضی شوکانیؒ نے علامہ ابن حزمؒ سے نقل کیا ہے کہ امام شافعیؒ نے یہ روایت بغیر سند کے بیان کی ہے لہٰذا اس سے استدلال باطل ہے (نیل الاوطار ج ۵ ص ۲۱۴) اور علامہ زیلعیؒ فرماتے ہیں کہ امام موفق الدینؒ نے فرمایا ہے کہ یہ روایت حدیث کی کسی مشہور کتاب میں نہیں ہے اور امام شافعیؒ نے بھی اس روایت کی کوئی سند بیان نہیں کی۔ (نصب الرایہ ج ۴ ص ۱۴)

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں امام احمدؒ اور امام اسحاق بن راہویہؒ کا نظریہ بھی امام شافعیؒ کی طرح ہے۔

امام مالکؒ کا نظریہ

امام مالکؒ سے عریہ کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت کے مطابق وہ عریہ کی تفسیر وہی کرتے ہیں جو احناف کرتے ہیں مگر اس کو بیع کی ایک صورت قرار دیتے ہیں اس لیے کہ جب درخت کے مالک نے کسی دوسرے کو درخت کا پھل ہبہ کیا تو جس کو ہبہ کیا گیا' وہ اس کا مالک بن گیا اس لیے کہ امام مالکؒ کے نزدیک موہوب لہ (جس کو کوئی چیز ہبہ کی گئی

ہو) نے موہوبہ چیز (جو چیز ہبہ کی گئی) پر بے شک قبضہ نہ کیا ہو، تب بھی مالک بن جاتا ہے۔ پھر جب اس نے وہ پھل اتارے ہوئے پھل کے بدلے میں دے دیا تو یہ بیع ہے اس لیے امام مالکؒ کے نزدیک یہ بیع کی قسم ہے۔ امام مالکؒ کا یہ نظریہ امام بخاریؒ نے ج ۱ ص ۲۹۲ میں بیان کیا ہے۔

امام مالکؒ سے دوسری روایت یہ ہے کہ وہ عریہ کی تفسیر اس طرح کرتے ہیں کہ ایک باغ کے کئی افراد مالک ہوں۔ ایک کے درخت کم اور دوسرے کے زیادہ ہوں اور پھل کے پکنے کے وقت عادت تھی کہ درختوں والے اہل وعیال سمیت پھل چننے کے لیے جاتے تھے تو زیادہ درخت والوں کو ان کی وجہ سے مشقت اٹھانی پڑتی تو وہ کم درخت والے کو کہہ دیتے کہ تم اپنے درخت پر لگے ہوئے پھل کے بدلہ میں مجھ سے اتارا ہوا پھل لے لو تو اس کی اجازت دی گئی ہے۔ امام مالکؒ سے عریہ کی تفسیر علامہ عینیؒ نے امام طحاویؒ سے نقل کی ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۳۰۵)

امام بخاریؒ نے عرایا کا مستقل باب قائم کیا ہے اور اس میں ذکر کی گئی روایات میں بعض میں صراحتاً اور بعض میں اشارۃً وہی معنی ثابت ہوتا ہے جو امام ابو حنیفہؒ نے بیان کیا ہے۔

بَابُ مَا جَآءَ فِیْ کَرَاهِیَةِ النَّجْشِ (نجش کے مکروہ ہونے کا بیان)

نجش کی تعریف

علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ نجش نون کے فتحہ اور جیم کے سکون کے ساتھ ہے (فتح الباری ج ۴ ص ۳۵۵) اور علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ جیم کے فتحہ کے ساتھ بھی درست ہے (عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۲۶۲) علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ نجش اصل میں کہتے ہیں شکار کو ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف بھگانا تا کہ شکار کیا جائے۔ اور اصطلاح میں نجش کہتے ہیں کہ بائع اپنی چیز کی اس قدر تعریف کرے کہ مشتری اس کو لینے میں خواہ مخواہ رغبت کرنے لگے یا کوئی دوسرا آدمی بائع کی چیز کی تعریف کرے یا اس مبیعہ کے ثمن میں زیادتی بیان کرے حالانکہ وہ اس کو خریدنا نہیں چاہتا بلکہ یہ کاروائی صرف مشتری کو پھنسانے کے لیے کرتا ہے تو اس کو نجش کہتے ہیں اور اس کی وجہ سے آدمی گنہگار ہوتا ہے۔

نجش والی بیع کا حکم

اس بیع کے بارے میں اختلاف ہے۔ علامہ عینیؒ عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۲۶۳ میں اور علامہ ابن حجرؒ فتح الباری ج ۴ ص ۳۵۵ میں ابن منذرؒ سے نقل کرتے ہیں کہ بعض محدثین نے ایسی بیع کو فاسد قرار دیا ہے اور یہی قول ہے اہل ظاہر کا۔ اور امام مالکؒ کا بھی ایک روایت کے مطابق یہی نظریہ ہے اور حنابلہ کا بھی مشہور قول یہی ہے جبکہ دوسرا آدمی یہ کاروائی بائع کی مرضی سے کرے اور اگر اس نے بائع کی مرضی کے بغیر ایسا کیا تو یہ آدمی گنہگار ہوگا۔

اور ایسی صورت میں مالکیہ کا مشہور قول یہ ہے کہ اگر مشتری کو پتہ چل جائے کہ بائع نے یا دوسرے آدمی نے میرے ساتھ نجش کا معاملہ کیا ہے تو مشتری کو خیار ہوگا خواہ سودا باقی رکھے یا بیع کو فسخ کردے۔

اور احناف اور شوافع کے نزدیک نجش گناہ ہے مگر اس کے باوجود بیع ہو جائے گی۔ امام ترمذیؒ نے امام شافعیؒ سے نجش کی تعریف یہ نقل کی ہے کہ بائع کے علاوہ کوئی دوسرا آدمی مشتری کو دھوکا دینے کے لیے بائع کے سودے کو اصل ثمن سے زائد ثمن والا بیان کرے۔ (تاکہ بائع نے اس کا جو ثمن بتایا ہے، مشتری اس کے مطابق لے لے) تو یہ نجش ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي الرُّجْحَانِ فِي الْوَزْنِ (وزن میں کچھ زیادہ دینے کا بیان)

اگر بائع خود اپنا سودا وزن کر کے دیتا ہے تو اس کے لیے مستحب یہ ہے کہ مشتری کو طے شدہ وزن سے کچھ زیادہ دے تاکہ کم سودا دینے کے وبال سے بچ جائے اور اگر بائع خود نہیں تولتا بلکہ اس کا نمائندہ وزن کرتا ہے تو وہ بائع کی اجازت سے ایسا کر سکتا ہے ورنہ وزن بالکل برابر کرے اور کسی قسم کا شک نہ رہنے دے۔

قَوْلُهُ فَسَاوَمَنَا بِسَرَاوِيلَ

ترمذی شریف کی اس روایت میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے ہمارے ساتھ شلوار کا بھاؤ کیا اور نسائی ج ۲ ص ۲۲۳ کی روایت میں ہے فَاشْتَرٰى مِنَّا سَرَاوِيلًا کہ آپ ﷺ نے ہم سے شلوار خریدی۔ مبارک پوری صاحبؒ امام سیوطیؒ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے شلوار خریدی مگر پہنی نہیں اور ابن القیمؒ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے شلوار پہنی بھی ہے۔ اور المعجم الاوسط للطبرانی اور مسند ابی یعلی کے حوالہ سے حضرت ابو ہریرہؓ کی بِسَنَدٍ ضَعِيفٍ روایت نقل کی ہے کہ حضور علیہ السلام نے بازار سے چار دراہم کی شلوار

خریدی تو میں نے کہا یا رسول اللہ کیا آپ شلوار پہنتے ہیں تو فرمایا ہاں سفر وحضر، رات اور دن میں پہنتا ہوں کیونکہ مجھے ستر کا حکم دیا گیا ہے اور میں اس سے زیادہ ستر کسی اور کپڑے میں نہیں پاتا (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۲۶۸)

قَوْلُہٗ عِنْدِیْ وَزَّانٌ یَزِنُ بِالْاَجْرِ

حضرت سوید بن قیسؓ فرماتے ہیں کہ میرے پاس وزن کرنے والا تھا جو مزدوری لے کر وزن کرتا تھا۔ امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت میں دلیل ہے کہ اجرت لے کر وزن کرنا اور ماپنا درست ہے اور تقسیم کرنے والے اور حساب کرنے والے کی اجرت کا بھی یہی حکم ہے (معالم السنن ج ۵ ص ۱۱)

مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ سعید بن المسیبؒ تقسیم کرنے والے کی اجرت کو ممنوع اور امام احمد اس کو مکروہ قرار دیتے ہیں۔ مگر جب حضور علیہ السلام نے اس کے عمل کو دیکھ کر اس کو خطاب فرمایا کہ زِنْ وَارْجِحْ کہ وزن کر اور مشتری کے جانب والے پلڑے کو جھکا (یعنی کچھ زیادہ دے) تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ عمل جائز اور درست ہے۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۲۶۸) اگر اس کا عمل درست نہ ہوتا تو آپ ﷺ اس کو اس عمل ہی سے منع فرما دیتے حالانکہ آپ ﷺ نے اس کو اجازت دی اور فرمایا کہ وَارْجِحْ کہ پلڑا جھکا۔ رجحان اسی قدر ہونا چاہئے جتنا عرف میں رائج ہو یا بائع اس کو پسند کرے۔

قَوْلُہٗ فَقَالَ عَنْ اَبِیْ صَفْوَانَ

ترمذی شریف میں سفیان عن سماک بن حرب عن سوید بن قیسؓ کی سند سے روایت نقل کی گئی ہے اور امام ترمذی فرماتے ہیں کہ جب شعبہ روایت کرتے ہیں تو یوں نقل کرتے ہیں عَنْ سِمَاکِ بْنِ حَرْبٍ عَنْ اَبِیْ صَفْوَان یعنی انہوں نے سوید بن قیس کے بجائے ابی صفوان کہا ہے۔ مبارک پوری صاحب تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۲۶۹ میں ابو عمر النمری سے نقل کرتے ہیں کہ ابو صفوان حضرت سوید بن قیسؓ ہی کی کنیت ہے اور ابو صفوان کو مالک بن عمیرہ بھی کہتے ہیں۔ تو گویا ان کے نزدیک دونوں روایتیں ایک ہی راوی سے ہیں۔ ایک روایت میں سوید بن قیس نام ذکر ہے اور دوسری روایت میں ابو صفوان کنیت ذکر ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِیْ اِنْظَارِ الْمُعْسِرِ وَالرِّفْقِ بِہٖ

(تنگ دست کو مہلت دینے اور اس کے ساتھ نرمی کرنے کا بیان)

انسانوں کی زندگی ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہے۔ انسان پر کبھی ایسی حالت بھی

آجاتی ہے کہ وہ دوسرے سے قرض لیتا ہے اور ادائیگی کے قابل نہیں ہوتا تو شریعت نے مالدار کو ترغیب دی کہ یا تو ایسے آدمی کے قرض سے کچھ معاف کر دے یا پھر اس کو مہلت دے اور یہ کوئی معمولی عمل نہیں ہے بلکہ خلق خدا پر ترس کھانے کی وجہ سے اس کا رتبہ بہت بلند ہوگا۔

امام ترمذیؒ نے اس باب کے تحت حضرت ابو ہریرہؓ کی جو روایت نقل کی ہے، اس میں ہے کہ تنگ دست کو مہلت دینے والے کو قیامت کے دن عرش کے سایہ میں جگہ نصیب ہوگی۔ شریعت نے جس طرح قرض خواہوں کو نرمی کا حکم دیا ہے، اسی طرح مقروض کو بھی تنبیہ کی ہے کہ وسعت ہونے کے باوجود قرض کی ادائیگی میں تاخیر نہ کرے اور فرمایا مَطَلَ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ کہ مالدار آدمی کا قرض کی ادائیگی سے ٹال مٹول کرنا ظلم شمار ہوتا ہے۔ قرض خواہ اور مقروض دونوں کو شریعت نے آداب سکھائے ہیں تاکہ معاملات درست طور پر ادا کیے جاتے رہیں۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي مَطْلِ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ

(مال دار کا بلا وجہ قرض کی ادائیگی سے ٹال مٹول کرنا ظلم ہونے کا بیان)

کسی آدمی کے ذمہ دوسرے کا مالی حق ہو اور اس کو حق کی ادائیگی کی وسعت بھی ہو تو خواہ مخواہ ٹال مٹول کرنا اور ادائیگی میں تاخیر کرنا ظلم اور زیادتی ہے۔ نسائی ج ۲ ص ۲۳۳ کی روایت میں ہے لَيُّ الْوَاجِدِ يُحِلُّ عِرْضَهُ وَعُقُوبَتَهُ یعنی اگر وسعت والا آدمی مالی حق کی ادائیگی میں خواہ مخواہ بلا وجہ ٹال مٹول کرتا ہے تو اس کی بے عزتی کرنا اور اس کو سزا دینا جائز ہے۔ اور فقہاء فرماتے ہیں کہ ایسے آدمی کو قاضی جیل میں قید بھی کر سکتا ہے۔

قَوْلُهُ إِذَا اتُّبِعَ أَحَدُكُمْ عَلَى مَلِيٍّ فَلْيَتْبَعْ

اس جملہ کا معنی خود امام ترمذیؒ نے یہ کیا ہے کہ جس آدمی کے ذمہ حق ہے، اگر وہ کسی مالدار کے حوالے کر دیتا ہے تو حق وصول کرنے والا یہ حوالہ قبول کرے۔ قاضی شوکانیؒ نیل الاوطار ج ۵ ص ۲۵۱ میں لکھتے ہیں کہ اہل ظاہر اور اکثر حنابلہ کے نزدیک یہ حوالہ قبول کرنا واجب ہے اس لیے کہ حدیث میں امر کا صیغہ ہے اور جمہور علماء اس امر کو استحباب پر محمول کرتے ہیں اور قاضی شوکانی لکھتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک مالدار آدمی کا خواہ مخواہ ٹال مٹول کرنا فسق کا موجب ہے یعنی اس کو فاسق بنا دیتا ہے۔

قَوْلُہٗ وَقَالَ بَعْضُ اَھْلِ الْعِلْمِ اِذَا اُحِیْلَ الرَّجُلَ عَلٰی مَلِیٍّ فَاحْتَالَہٗ فَقَدْ بَرِیَٔ الْمُحِیْلَ

اور بعض اہل علم نے کہا ہے کہ جب قرض کسی مالدار کے حوالہ کیا جائے اور وہ اس حوالہ کو قبول کر لے تو حوالہ کرنے والا بری الذمہ ہو جاتا ہے۔

حوالہ کی تعریف

علامہ ابن حجرؒ فتح الباری ج ۵ ص ۳۷۰ میں فرماتے ہیں کہ حوالہ' تحویل یا حول سے مشتق ہے اور فقہاء کی اصطلاح میں حوالہ کہتے ہیں نَقَلَ دَیْنٍ مِنْ ذِمَّۃٍ اِلٰی ذِمَّۃٍ یعنی قرضہ کا ایک آدمی کے ذمہ سے دوسرے کے ذمہ کی طرف منتقل کرنا مثلاً" زید نے عمرو کا قرض دینا ہو اور زید کہے کہ میرا قرض بکر سے وصول کر لینا اور بکر اس کو تسلیم کر لے تو اس کو حوالہ کہتے ہیں اس لیے کہ زید کے ذمہ سے قرضہ بکر کے ذمہ کی طرف منتقل ہو گیا۔

حوالہ کے بارے میں ائمہ کرام کے اقوال

احناف کے نزدیک حوالہ کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے جیساکہ صاحب ہدایہ نے ج ۳ ص ۱۰۰ میں لکھا ہے کہ محیل (یعنی مقروض) اور محتال (قرض خواہ) اور محتال علیہ (جس کے ذمہ یہ قرضہ منتقل کیا جا رہا ہے) یہ تینوں راضی ہوں تو حوالہ درست ہوگا اور جب ان کے درمیان عقد تام ہو جائے تو محیل (مقروض) بری الذمہ ہو جائے گا اور محتال (قرض خواہ) اس قرضہ کا مطالبہ محتال علیہ سے کرے گا۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر محتال علیہ (جس نے قرض ذمہ لیا ہے) ادائیگی سے قاصر ہو اور محتال کے مال ضائع ہونے کا امکان ہو تو ایسی صورت میں محتال (قرض خواہ) محیل (جس نے قرض لیا تھا) سے مطالبہ کر سکتا ہے۔

اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جب ان کے درمیان عقد تام ہو کر محیل بری الذمہ ہو چکا ہے تو اب اس سے مطالبہ نہیں کر سکتا۔

محتال علیہ کے دیوالیہ ہو جانے کی صورت میں ائمہ کرام کے اقوال

اگر محتال علیہ کو قاضی نے مفلس (دیوالیہ) قرار دے دیا تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک چونکہ مال آنے جانے والی چیز ہے اور ان کے نزدیک قاضی کے مفلس قرار دینے کے باوجود تفلیس کا حکم جاری نہیں ہوتا تو ایسی صورت میں محتال محیل سے مطالبہ نہیں کر سکتا بلکہ

محتال علیہ سے ہی مطالبہ کرے گا اور صاحبین (امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ) کے نزدیک چونکہ قاضی کے مفلس قرار دینے کی صورت میں تفلیس کا حکم جاری ہوتا ہے اس لیے ان کے نزدیک ایسی صورت میں محتال اپنا مال ضائع ہو جانے کے امکان کے پیش نظر محیل سے مطالبہ کر سکتا ہے۔

امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اگر حوالہ کے وقت محتال کو محتال علیہ کے غنی ہونے کا علم نہیں تھا اور دھوکہ سے اس کے ساتھ یہ عقد کیا گیا تو ایسی صورت میں وہ محیل سے مطالبہ کر سکتا ہے اور باقی صورتوں میں امام احمدؒ کا نظریہ وہی ہے جو امام شافعیؒ کا ہے کہ کسی صورت میں بھی محتال محیل سے اپنی رقم کا مطالبہ نہیں کر سکتا بلکہ محتال علیہ سے ہی کرے گا۔

امام احمدؒ اپنے نظریہ پر حضرت عثمانؓ کے قول کو دلیل بناتے ہیں جس میں ہے لَيْسَ عَلٰى مَالِ مُسْلِمٍ تَوٰى (ترمذی ج ۱ ص ۲۴۴) کہ مسلمان کے مال پر ہلاکت نہیں ہے یعنی اس کا ضیاع درست نہیں ہے اور وہ اس کی یہی صورت مراد لیتے ہیں کہ جب حوالہ کے وقت دھوکا کیا گیا ہو تو اس صورت میں مسلمان کے مال کا ضیاع ہوتا ہے۔

اور احناف بھی اپنے نظریہ پر حضرت عثمانؓ کے اسی قول کو دلیل بناتے ہیں کہ اگر محتال کے مال کے ضیاع کا قوی امکان ہو تو اس کا بھی یہی حکم ہے تاکہ اس کا مال ضائع نہ ہو۔

بَابُ مَا جَاءَ فِي الْمُنَابَذَةِ وَالْمُلَامَسَةِ (بیع منابذہ اور ملامسہ کا بیان)

منابذہ، نبذ سے ہے جس کا معنی ہے پھینکنا۔ بیع منابذہ کی تفسیر میں ائمہ کرام کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض حضرات نے مُنابذہ اور بیع الحصاۃ کو ایک ہی قرار دیا ہے مگر علامہ ابن حجرؒ فتح الباری ج ۵ ص ۲۴۳ میں فرماتے ہیں وَالصَّحِيْحُ اَنَّهٗ غَيْرُهٗ کہ صحیح بات یہ ہے کہ مُنابذہ اور بَیْعُ الحَصَاۃ جدا جدا ہیں۔

بیع المنابذہ کی تفسیر

علامہ عینیؒ عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۲۶۷ میں اور علامہ ابن حجرؒ فتح الباری ج ۵ ص ۲۴۳ میں فرماتے ہیں کہ منابذہ کی ایک تفسیر یہ ہے کہ بائع اور مشتری میں سے ہر ایک اپنا کپڑا دوسرے کی جانب پھینک دے حالانکہ ان میں سے کسی نے بھی دوسرے کے کپڑے کو نہ دیکھا ہو۔ (چونکہ مبیعہ اور ثمن دونوں کا وصف مجہول ہے اس لیے یہ بیع درست نہیں)

منابذہ کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہتا ہے کہ میں یہ سودا تجھ پر اتنے ثمن پر بیچتا ہوں اور جب میں تمہاری طرف اس کو پھینک دوں تو یہ بیع تام ہوگی اور خیار نہ ہوگا (اس صورت میں چونکہ صرف ایجاب ہے' دوسری جانب سے قبول نہیں حالانکہ ایجاب وقبول دونوں بیع کے ارکان ہیں اس لیے یہ بیع درست نہ ہوگی)

منابذہ کی تیسری تفسیر یہ ہے کہ نفس نبذ یعنی پھینکنے کو ہی بیع قرار دیں یعنی ایسا کوئی کلمہ نہیں بولتے جو بیع پر دلالت کرتا ہو بلکہ ایک نے اپنی چیز اس کی طرف پھینک دی اور دوسرے نے اپنی کوئی چیز اس کی طرف پھینک دی اور اس پھینک دینے کو ہی بیع سمجھنے لگے تو یہ درست نہیں اس لیے کہ ایسا صیغہ ضروری ہے جو بیع پر دلالت کرتا ہوں۔

اشکال اور اس کا جواب

اس تفسیر پر اعتراض ہے کہ بعض دفعہ یوں ہوتا ہے کہ گاہک دکاندار کے پاس جاکر چیز لے لیتا ہے اور ثمن اس کو پکڑا دیتا ہے حالانکہ دونوں میں سے کسی نے کوئی کلمہ نہیں کہا ہوتا اور ایسی بیع کو بیع المعاطاۃ کہتے ہیں اور اس کو بہت سے حضرات نے جائز قرار دیا ہے جبکہ مذکورہ تفسیر کی رو سے ایسی بیع ناجائز قرار پاتی ہے۔

تو اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ 'لٰكِنَّ مَنْ اَجَازَ الْمُعَاطَاةَ قَيَّدَهَا بِالْمُحَقَّرَاتِ اَوْ بِمَا جَرَتْ فِيهِ الْعَادَةُ بِالْمُعَاطَاةِ (فتح الباری ج ۵ ص ۳۴۳) کہ جن لوگوں کے نزدیک بیع المعاطاۃ جائز ہے' انہوں نے بھی قید لگائی ہے کہ ایسا معاملہ معمولی چیزوں میں یا ان چیزوں میں درست ہے جن میں معاطاۃ کی عادت ہو۔

بَيْعُ الْمُلَامَسَۃ کی تعریف

ملامسہ' لمس سے ہے اور اس کی بھی تین تفسیریں کی گئی ہیں۔

ایک تفسیر یہ ہے کہ نفس لمس (ٹٹولنے) کو ہی بیع قرار دیا جائے اور یہ ایسے ہی ہے جیسے بیع المنابذہ میں نفس نبذ کو ہی بیع قرار دیا جائے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ تو اس مبیعہ کو ٹٹول لے اور تیرا اس کو لمس کرنا تیرے دیکھنے کے قائم مقام ہوگا اور دیکھنے کے بعد تجھے خیار نہ ہوگا (جب شریعت نے اس کو خیار رؤیت دیا ہے اور یہ آدمی اس کے اس خیار کو ساقط کرنا چاہتا ہے اس لیے یہ ت نہیں ہے۔

امام شافعیؒ نے بَیْعَ الْمُلَامَسَۃ کی یہی تفسیر کی ہے۔ (عینی شرح ہدایہ ج ۳ ص ۸۹)
اور بیع الملامسہ کی تیسری تفسیر یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ میں یہ چیز تجھ پر اتنے ثمن کے بدلے بیچتا ہوں اور جب میں تجھ کو لمس کروں (یعنی چھولوں) تو بیع تام ہو جائے گی اور پھر خیار نہ ہوگا۔ اور اسی طرح اگر بائع کے بجائے مشتری کہے تو تب بھی یہی حکم ہے۔ (اس صورت میں چونکہ دوسری جانب سے قبول نہیں ہے بلکہ ایک ہی جانب سے دوسرے پر بیع مسلط کی جا رہی ہے اس لیے یہ درست نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے بیع الملامسہ کی یہی تفسیر کی ہے۔ (اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۱۳۶)
علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ بیع الملامسہ اور منابذہ غرر (دھوکہ) والی بیوع میں سے ہیں اور قمار (جوا) ہیں اس لیے جائز نہیں ہیں (عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۲۶۷)

مملوکہ غیر موجود چیز کی بیع کا حکم

اگر کوئی آدمی اپنی ایسی مملوکہ چیز بیچتا ہے جو عقد کرتے وقت اس کے پاس موجود نہیں بلکہ اس کے گھر یا دکان یا کسی ایسی جگہ پر ہے جہاں سے وہ اٹھا کر مشتری کے حوالے کر سکتا ہے تو ایسی بیع کا کیا حکم ہے؟
علامہ عینیؒ اور علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اگر بائع اور مشتری نے کسی غیر موجود چیز کی بیع کی تو اگر وہ چیز ایسی ہو جس کو وصف سے واضح کیا جا سکتا ہو اور پھر مشتری نے اس کو وصف کے مطابق ہی پایا تو امام احمدؒ کے نزدیک ایسی بیع درست ہوگی اور اگر بیان کردہ وصف کے مطابق نہ ہو تو مشتری کو بیع فسخ کرنے یا نہ کرنے کا خیار ہوگا۔ اور احناف کے نزدیک ہر صورت میں یہ بیع درست ہوگی اور مشتری کو خیار رؤیت ہوگا۔ (یعنی دیکھنے کے بعد اگر پسند نہ کرے تو بیع کو رد کرنے کا خیار ہوگا)
اور امام شافعیؒ کے اس بارے میں دو قول ہیں۔ ایک قول کے مطابق ان کے نزدیک غیر موجود چیز کی بیع بالکل درست ہی نہیں ہے اور یہ ان کا قول جدید ہے۔ اور امام مالکؒ سے روایت ہے کہ اگر غیر موجود چیز کی اچھی طرح وصف بیان کر دی گئی تو بیع جائز ہوگی اور امام شافعیؒ کا بھی قول قدیم یہی ہے۔ اور اعمی (نابینا) کی بیع کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ شوافع کے مشہور قول کے مطابق درست نہیں ہے اور امام مالکؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی دوسرے آدمی نے اس کے سامنے اس چیز کی وصف بیان کر دی تو یہ بیع درست ہوگی ورنہ نہیں۔ اور احناف کے نزدیک نابینا آدمی کا بیع کرنا مطلقاً" درست ہے۔ (فتح الباری ج ۵ ص

۲۶۴ ملخصاً)

بَابُ مَا جَاءَ فِي السَّلَفِ فِي الطَّعَامِ وَالثَّمَرِ
(غلے اور پھلوں میں بیع سلم کا بیان)

بیع سلف کو ہی بیع سلم کہتے ہیں۔

بیع سَلم کی تعریف

بیع سلم کہتے ہیں ثمن کی ادائیگی پہلے کر دینا اور مبیعہ بعد میں وصول کرنا اور ہدایہ ج ۳ ص ۶۹ کے حاشیہ ۵ میں ہے کہ لغت میں بیع سلم بیع کی ایسی قسم ہے جس میں ثمن کی ادائیگی پہلے کی جاتی ہے اور فقہاء کی اصطلاح میں بعض نے اس کی تعریف یوں کی ہے اَخَذَ عَاجِلٍ بِاٰجِلٍ کہ مبیع آجل (جس کو فی الحال نہ لیا جائے) کے بدلے ثمن جلدی وصول کرنے کو سلم کہتے ہیں۔ اور بیع سلم کی شرط یہ ہے کہ کیلی چیزوں میں کیل معلوم ہو اور وزنی چیزوں میں وزن معلوم ہو اور اجل (کہ کب مبیعہ کی ادائیگی کی جائے گی) معلوم ہو۔ اور بیع سلم کا جواز احادیث سے ثابت ہے جیسا کہ ترمذی شریف ج ۱ ص ۲۴۵ میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت جو بخاری ج ۱ ص ۲۹۸ وغیرہ میں بھی ہے جس میں ہے کہ حضور علیہ السلام جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہ لوگ بیع سلف کیا کرتے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا مَنْ اَسْلَمَ مِنْكُمْ فَلْيُسْلِمْ فِيْ كَيْلٍ مَعْلُوْمٍ وَوَزْنٍ مَعْلُوْمٍ اِلٰى اَجَلٍ مَعْلُوْمٍ یعنی تم میں سے جو آدمی بیع سلم کرنا چاہتا ہے تو وہ کیل اور وزن اور اس کا اجل متعین کرے۔ اصل میں تو بیع سلم کیلی اور موزونی چیزوں میں ہے مگر ان کے تابع رکھ کر عددی متقارب (وہ چیزیں جو وجود میں تقریباً برابر ہوں اور ان کی گنتی کے لحاظ سے بیع کی جاتی ہو) اور جن چیزوں کی بیع ذراع سے ناپ کر ہوتی ہے' ان میں بھی بیع سلم جائز ہے بشرطیکہ بیع سلم کے لیے جو شرطیں ہیں' وہ پائی جائیں اور مبیعہ کا وصف بھی متعین ہو سکے۔ (ہدایہ ج ۳ ص ۶۹ ملخصاً)

اور حضرت شاہ ولی اللہؒ صاحب محدث دہلویؒ "مصفّٰی" شرح الموطا ج ۱ ص ۳۸۴ میں لکھتے ہیں کہ عالم اعظم (امام ابو حنیفہؒ) کے نزدیک بیع سلم کے لیے سات شرطیں ہیں۔ (۱) مبیعہ کی صفت معلوم ہو (۲) نوع معلوم ہو (۳) جنس معلوم ہو (۴) قدر معلوم ہو (۵) مدت معلوم ہو (۶) جس جگہ مبیعہ حوالے کرنا ہے' وہ جگہ معلوم ہو (۷) رأس مال سلم معلوم ہو۔

حیوان میں بیع سلف

احناف کے نزدیک حیوان (جاندار) میں بیع سلف مکروہ ہے اور امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ حیوان میں بھی بیع سلف جائز ہے۔

امام شافعیؒ وغیرہ کی دلیل

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ دلیل میں حضرت عبد اللہ بن عمروؓ کی روایت پیش کرتے ہیں جو ابو داؤد ج ۲ ص ۱۲۱ وغیرہ میں ہے جس میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے لشکر تیار کرنے کا حکم فرمایا۔ صدقہ کے جو اونٹ تھے' وہ ختم ہو گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ بیت المال کی اونٹنیوں کے بدلہ میں اونٹ خرید لے حالانکہ اس وقت اونٹنیاں موجود نہ تھیں بلکہ وہ تو بعد میں حاصل ہوئی تھیں۔ اس روایت سے متعلق ضروری بحث بَابُ کَرَاہِیَۃِ بَیْعِ الْحَیْوَانِ بِالْحَیْوَانِ میں گزر چکی ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کا نظریہ اور دلیل

اور امام ابو حنیفہؒ جو حیوان میں بیع سلم کو مکروہ کہتے ہیں' ان کی دلیل مستدرک ج ۲ ص ۵۷ اور دار قطنی ج ۳ ص ۷۱ وغیرہ میں منقول حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے جس میں ہے اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَھٰی عَنِ السَّلَفِ فِی الْحَیَوَانِ کہ نبی کریم ﷺ نے حیوان میں بیع سلم سے منع فرمایا ہے۔ امام حاکمؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت صحیح الاسناد ہے اور امام ذہبیؒ فرماتے ہیں' صحیح۔ اس روایت پر اگرچہ بعض حضرات نے کلام کیا ہے مگر قاضی شوکانی کی تحقیق کے مطابق ممانعت کی روایات راجح ہیں اور قاضی شوکانی سے اس کے متعلق بحث بَابُ کَرَاہِیَۃِ بَیْعِ الْحَیْوَانِ بِالْحَیْوَانِ میں گزر چکی ہے۔

بَابُ مَا جَاءَ فِیْ اَرْضِ الْمُشْتَرَکِ یُرِیْدُ بَعْضُھُمْ بَیْعَ نَصِیْبِہٖ

(مشترکہ زمین میں سے اپنا حصہ بیچنے کے متعلق بحث)

اگر کوئی زمین کئی آدمیوں کی مشترکہ ملکیت میں ہو اور ان میں سے کوئی اپنا حصہ بیچنا چاہے تو باقی شرکاء کو بالاتفاق شفعہ کا حق حاصل ہے کیونکہ وہ شریک فی المبیع ہیں۔ اگر اس بیچنے والے نے اپنے شرکاء کو اطلاع دیے بغیر اپنا حصہ کسی اور پر بیچ دیا تو ترمذی شریف ج ۱ ص ۲۲۵ کی اس روایت کی وجہ سے وہ گناہ گار ہو گا جس میں آتا ہے کہ مَنْ کَانَ لَہٗ شَرِیْکٌ فِیْ حَائِطٍ فَلَا یَبِیْعُ نَصِیْبَہٗ مِنْ ذَالِکَ حَتّٰی یَعْرِضَہٗ عَلٰی شَرِیْکِہٖ جو کسی دوسرے کے

ساتھ باغ میں شریک ہے تو اگر وہ اپنا حصہ بیچتا ہے تو ایسا آدمی اپنے شریک کو وہ حصہ پیش کیے بغیر نہ بیچے۔ اور اگر اس نے اپنے شرکاء کو وہ حصہ پیش کیا مگر ان میں سے ہر ایک نے لینے سے اعراض کیا تو ایسی صورت میں کیا ان کو شفعہ کا حق رہتا ہے یا نہیں؟

جمہور کا نظریہ

امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ان کو شفعہ کا حق ہوگا اس لیے کہ شفعہ کا حق تو ثابت ہی اس وقت ہوتا ہے جبکہ اس کے شریک نے اپنا حصہ بیچ دیا ہو اور جب تک اس نے بیچا نہیں، اس وقت تک شفعہ کا حق نہیں اور جب ابھی تک حق نہیں تو لینے سے اعراض شفعہ سے اعراض نہ ہوگا۔

امام سفیان ثوریؒ کا نظریہ اور دلیل

اور امام سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں اگر شریک نے اپنا حصہ بیچنے سے پہلے اپنے شرکاء کو وہ حصہ پیش کیا اور ان سے کہا کہ آپ میں سے کوئی خرید لے مگر ان میں سے ہر ایک نے اعراض کیا اور لینے سے انکار کر دیا تو اس حصہ کے بیچ جانے کے بعد ان کو شفعہ کا حق نہیں ہوگا۔

امام سفیان ثوریؒ اپنی دلیل میں ترمذی شریف کی اسی باب کے تحت ذکر کردہ حضرت جابرؓ کی روایت پیش کرتے ہیں جس میں آتا ہے کہ فَلَا يَبِيعُ نَصِيبَهُ مِنْ ذَالِكَ حَتّٰى يَعْرِضَهُ عَلٰى شَرِيكِهٖ کہ اپنے حصہ کو اپنے شریک پر پیش کیے بغیر نہ بیچے۔

اس کا جواب

حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت سے تو صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ بائع اپنا حصہ اس وقت تک نہ بیچے جب تک اپنے شریک کو پیش نہ کرے تو اگر اس نے اپنے شریک کو پیش کرنے کے بعد اس کے اعراض کی وجہ سے دوسرے پر بیچ دیا تو گناہ گار نہ ہوگا اور اگر پیش کیے بغیر بیچا تو گناہ گار ہوگا اور اس حدیث میں حق شفعہ کی وجہ سے لینے یا نہ لینے کا تو ذرا اشارہ بھی نہیں ہے تو اس پر اس کو دلیل کیسے بنایا جا سکتا ہے؟ (الکوکب الدری ج ۱ ص ۳۸۳)

امام احمدؒ کا نظریہ

اور امام احمدؒ سے اس بارہ میں دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت کے مطابق وہ ائمہ ثلاثہؒ کے ساتھ ہیں اور ایک روایت کے مطابق وہ امام سفیان ثوریؒ کے ساتھ ہیں۔ (نیل الاوطار ج ۵ ص ۳۵۲ ملخصاً)

بَابُ مَا جَاءَ فِي الْمُخَابَرَةِ وَالْمُعَاوَمَةِ (بیع مخابرہ اور معاومہ کا بیان)

قَوْلُهُ نَهَى عَنِ الْمُحَاقَلَةِ وَالْمُزَابَنَةِ وَالْمُخَابَرَةِ وَالْمُعَاوَمَةِ وَرَخَّصَ فِي الْعَرَايَا

بیع محاقلہ اور مزابنہ کی بحث پہلے بَابُ مَا جَاءَ فِي النَّهْيِ عَنِ الْمُحَاقَلَةِ وَالْمُزَابَنَةِ میں گزر چکی ہے اور بیع المخابرہ کی بحث بَابُ مَا جَاءَ فِي النَّهْيِ عَنِ الثُّنْيَا میں اور عرایا کی بحث بَابُ مَا جَاءَ فِي الْعَرَايَا میں گزر چکی ہے۔

اَلْمُعَاوَمَةُ عَامٌ سے ہے جس کا معنی ہے سال۔ معاومہ کہتے ہیں کہ کئی سالوں کے لیے درختوں کے پھلوں کو بیچنا اور خریدنا۔ چونکہ یہ معدوم چیز کی بیع ہے اس لیے ناجائز ہے۔ یعنی جس چیز کی بیع کی جا رہی ہے' وہ تو ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی۔

بَابٌ (قاضی اور حاکم کی جانب سے اشیاء کے بھاؤ مقرر کرنے کا بیان)

امام ترمذیؒ نے صرف بَابٌ کہا ہے اور اس کے ساتھ کوئی عنوان قائم نہیں کیا مگر آگے جو روایت پیش کی ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس باب میں بحث یہ ہے کہ کیا امام اور قاضی اشیاء کے بھاؤ مقرر کر سکتے ہیں یا نہیں؟

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ امام اور حاکم جب چاہیں' بھاؤ مقرر کر سکتے ہیں اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر بھاؤ بہت چڑھ جائے تو مقرر کر سکتے ہیں۔ احناف کے نزدیک امام اور حاکم بھاؤ مقرر نہیں کر سکتے اور ان کی دلیل ترمذی شریف کی یہی روایت ہے جس میں آتا ہے کہ جب حضور علیہ السلام سے اشیاء کے بھاؤ مقرر کرنے کو کہا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا وَاِنِّيْ لَاَرْجُوْ اَنْ اَلْقٰى رَبِّيْ وَلَيْسَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ يَطْلُبُنِيْ بِمَظْلِمَةٍ فِيْ دَمٍ وَّلَا مَالٍ (ترمذی ج ۱ ص ۲۴۵) اور میں خواہش رکھتا ہوں کہ اپنے رب سے اس حال میں ملوں کہ تم میں سے کوئی بھی مجھ سے ناحق خون یا مال کا مطالبہ کرنے والا نہ ہو۔ اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بھاؤ مقرر کرنے والا ہے یعنی جب اشیاء وافر مقدار میں ہوں گی تو بھاؤ کم ہوگا اور اگر کمیاب ہوں گی تو بھاؤ زیادہ ہوگا اور اشیاء کو کم یا زیادہ پیدا کرنا صرف اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔

احناف کہتے ہیں کہ چونکہ قاضی اور حاکم مسلمانوں کے امور کی حفاظت کے ذمہ دار ہوتے

ہیں اور ان کے سامنے بائع اور مشتری دونوں برابر ہیں اور ایک کی رعایت رکھتے ہوئے دوسرے سے زیادتی درست نہیں اس لیے یہ بھاؤ مقرر نہیں کر سکتے۔

علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اگر بھاؤ بہت مہنگا ہو جائے اور لوگوں کو بہت ضرر ہو تو امام بھاؤ مقرر کر سکتا ہے اور اشیاء کی قیمتیں سستی کر سکتا ہے (العرف الشذی ص ۴۰۴) آج کے اس دور میں امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق فتویٰ دیا جا سکتا ہے اور انصاف پسند حاکم کو بھاؤ مقرر کرنے کا اختیار ہوگا۔

بَابُ مَا جَآءَ فِیْ کَرَاهِيَةِ الْغِشِّ فِی الْبُيُوْعِ

(خرید و فروخت میں دھوکہ وملاوٹ کی ممانعت کا بیان)

مبارک پوری صاحبؒ صراح کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ غِش کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے خیانت کرنا۔ اور قاموس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ غش کہتے ہیں کہ ظاہر کچھ اور ہو اور اندر کچھ اور ہو۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۲۷۲)

اگر کوئی آدمی اصل چیز میں کسی اور چیز کی ملاوٹ کرتا ہے یا وزن زیادہ کرنے کے لیے اس پر پانی وغیرہ چھڑکتا ہے تو یہ غش ہے۔ پھر اگر کسی ایسی چیز کی ملاوٹ کرتا ہے جو انسانی صحت کے لیے مضر ہے تو یہ زیادہ جرم ہے اور غش کرنے والے کو درجہ بدرجہ تعزیر لگائی جا سکتی ہے یعنی جس درجہ کا جرم ہوگا' اس کے مطابق سزا دی جا سکتی ہے۔

بَابُ مَا جَآءَ فِیْ اِسْتِقْرَاضِ الْبَعِيْرِ اَوِ الشَّیْءِ مِنَ الْحَيَوَانِ

(اونٹ یا اور کوئی جانور' جانور کے بدلے میں قرض لینے کا بیان)

مولانا محمد زکریا صاحبؒ اوجز المسالک ج ۱۱ ص ۳۵۹ میں فرماتے ہیں کہ ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک حیوان کے بدلے حیوان قرض لینا جائز اور درست ہے اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک کوئی جانور' جانور کے بدلے میں قرض لینا درست نہیں ہے۔

ائمہ ثلاثہؒ کا نظریہ اور دلیل

ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک اگر جاریہ (لونڈی) کو وطی کے لیے نہ لیا جائے بلکہ کسی اور خدمت کے لیے لیا جائے تو جاریہ بھی قرض پر لینا جائز ہے۔ اور اگر وطی کے لیے ہو تو جائز نہیں ہے۔ اور امام مزنیؒ کے نزدیک جاریہ سمیت تمام جانور قرض پر لینا جائز ہے۔

ائمہ ثلاثہؒ ان روایات سے استدلال کرتے ہیں جن میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے اونٹ قرض لیے۔ خود لیے جیساکہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں ہے اور حضرت ابو رافعؓ نے حضور علیہ السلام کی اجازت کے ساتھ بیت المال کی اونٹنیوں کے بدلہ میں اونٹ لیے حالانکہ اس وقت اونٹنیاں موجود نہ تھیں۔ اور ان روایات کو امام ترمذیؒ نے بھی اس باب کے تحت ذکر کیا ہے۔

احناف کی طرف سے اس کے جوابات

پہلا جواب یہ ہے کہ یہ روایات رباوالی آیت نازل ہونے سے پہلے کی ہیں اس لیے یہ روایات منسوخ ہیں۔

دوسرا جواب۔ علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ ان صورتوں میں حیوان کی حیوان کے بدلے بیع نہ تھی بلکہ ویسے قرض تھا اور جب صاحب حق نے قبل از وقت اس کا تقاضا کیا تو آپ نے اپنے ذمہ ثمن کے بدلے اونٹ خرید کر دے دیا اور ایسا کرنا بالکل درست ہے (العرف الشذی ص ۳۰۳) اور حضرت ابو رافعؓ والی حدیث کے بارے میں بَابَ مَا جَاءَ فِیَ كَرَاهِيَةِ بَيۡعِ الۡحَيَوَانِ بِالۡحَيَوَانِ نَسِيۡئَةً میں بحث گزر چکی ہے کہ امام خطابیؒ اور قاضی شوکانیؒ نے اس کو ضعیف بتایا ہے۔

تیسرا جواب۔ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ جس شخص سے آپ ﷺ نے یہ بیع کی ہو، وہ حربی ہو (دار اسلام کا رہنے والا نہ ہو) اور بیع مدینہ سے باہر کسی ایسی جگہ پر ہوئی ہو جو آپ کی ولایت کے تحت نہ ہو اور ایسی صورت میں ایسی بیع احناف کے نزدیک بھی جائز ہے (اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۴۰۹)

چوتھا جواب۔ امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ جن روایات میں استقراض البعیر (اونٹ قرض لینے) کا ذکر ہے، وہ روایات منسوخ ہیں اور نہی والی روایات ناسخ ہیں جن میں یہ الفاظ ہیں نَهٰى عَنۡ بَيۡعِ الۡحَيَوَانِ بِالۡحَيَوَانِ نَسِيۡئَةً کہ ادھار کی صورت میں حیوان کی حیوان کے بدلے بیع سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے (طحاوی ج ۲ ص ۱۸۹) اور پھر یہ بات بھی ہے کہ اثبات والی روایات مبیح اور ممانعت والی محرم ہیں اور قاعدہ کے مطابق محرم کو مبیح پر ترجیح ہوتی ہے۔

امام طحاویؒ نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کا نظریہ یہ نقل کیا ہے کہ اَلسَّلَفُ فِیۡ كُلِّ شَیۡءٍ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی لَا بَأۡسَ بِهٖ مَا خَلَا الۡحَيَوَانَ (ج ۲ ص ۱۹۱) کہ حیوان کے علاوہ

باقی چیزوں میں بیع سلف میں کوئی حرج نہیں جبکہ اجل معلوم ہو۔ اور اسی طرح کی روایت حضرت عمرؓ سے بھی ہے۔

پانچواں جواب۔ قرض میں اس کا مثل ادا کرنا ہوتا ہے اور حیوانات میں ایک دوسرے کے ساتھ ظاہری طور پر بھی تفاوت ہوتا ہے اور باطنی طور پر تو بہت زیادہ تفاوت ہوتا ہے اور ان کو وصف میں برابر قرار نہیں دیا جا سکتا اس لیے حیوانات آپس میں مماثل نہیں ہوتے اس لیے حیوانات کا استقراض (ایک آدمی ابھی کوئی جانور لے لے اور اس کے بدلے میں بعد میں کسی وقت جانور دے دے) درست نہیں ہے۔

قَوْلُهٗ فَاِنَّ خَيْرَكُمْ اَحْسَنُكُمْ قَضَاءً

پس بیشک تم میں سے بہتر وہ لوگ ہیں جو اپنے ذمہ قرضہ کی ادائیگی اچھے طور پر کرتے ہیں۔

اگر مشتری نے دو کلو میوہ کا بھاؤ مقرر کیا تو اگر یہ مشتری بائع سے زائد کا تقاضا کرتا ہے تو درست نہیں ہے۔ اسی طرح بائع نے جو ثمن طے کیا ہے' اس سے زائد تقاضا کرتا ہے تو درست نہیں ہے اور اگر ان میں سے کوئی بھی دوسرے کے تقاضے یا زیادتی کی شرط کے بغیر اپنی مرضی سے کچھ زائد دے دے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ اسی کی ترغیب حدیث کے اس حصہ میں دی گئی ہے۔

بَابٌ (معاملات میں آپس میں نرمی کرنے کا بیان)

امام ترمذیؒ نے بَابٌ کہہ دیا' اس کے ساتھ کوئی عنوان قائم نہیں کیا مگر تحت الباب روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بیع و شراء میں آپس میں نرمی کرنے کا حکم ہے۔ پہلی حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ خرید و فروخت میں اور قرض کے تقاضے میں نرمی کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے اور دوسری روایت میں ہے کہ پہلی امتوں میں سے ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ نے اس لیے معاف کر دیا تھا کہ وہ خرید و فروخت اور اپنے حق کے تقاضے میں نرمی کیا کرتا تھا۔

بَابُ النَّهْيِ عَنِ الْبَيْعِ فِي الْمَسْجِدِ
(مسجد میں خرید و فروخت کی ممانعت کا بیان)

مسجد میں خرید و فروخت ممنوع ہے۔ بعض فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ اگر آدمی

اعتکاف کی حالت میں ہو اور اس کو خرید و فروخت کی ضرورت پیش آجائے تو سودا کو مسجد میں حاضر کیے بغیر بیع و شراء کر سکتا ہے۔ مساجد خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے بنائی جاتی ہیں اس لیے ان کو دنیاوی کاموں کے لیے استعمال کرنا درست نہیں ہے۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے فرمایا جیسا کہ اسی باب کے تحت ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ جب تم ایسے آدمی کو دیکھو جو مسجد میں خرید و فروخت کرتا ہے تو تم کہو کہ اللہ تعالیٰ تیری بیع میں نفع نہ کرے۔ اور جو شخص مسجد میں اپنی گمشدہ چیز کا اعلان کرتا ہے' تو اس کو کہو کہ اللہ تعالیٰ تیری وہ چیز واپس نہ لوٹائے (اس لیے کہ تو نے اپنی اس چیز کی خاطر مسجد کی بے ادبی کی ہے) مسجد میں میت کے جنازہ کے اعلان کی حضرات فقہاء کرام نے اجازت دی ہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مسجد میں آواز بلند کرنا خواہ وہ علم کی خاطر ہو' مکروہ ہے۔ اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر علم کی وجہ سے آواز بلند کرتا ہے کہ جو بیٹھے ہوئے ہیں' ان تک آواز پہنچ جائے تو درست ہے۔ اسی طرح اگر قاضی مسجد میں فیصلہ کر رہا ہو تو خصومت کے دوران جو آواز طبعی طور پر بلند ہو جاتی ہے' اس کی اجازت ہے کیونکہ اس میں مجبوری ہے۔ جب مسجد میں فیصلہ کرنا جائز ہے تو اس کی وجہ سے جو امر ضروری ہے' اس کی بھی گنجائش ہے۔ حضرات فقہاء احناف نے تصریح کی ہے کہ مسجد میں بہ آواز بلند ذکر کرنا بھی درست نہیں ہے سوائے ان مقامات کے (تکبیرات تشریق یا تعلیم کی خاطر) جن کی اجازت ثابت ہے۔ تفصیل کے لیے میرے والد گرامی قدر حضرت مولانا محمد سرفراز خان صاحب دام مجدہم کی کتاب راہ سنت اور حکم الذکر بالجہر کا مطالعہ فرمائیں۔

تتمہ

امام ترمذیؒ نے ابواب البیوع میں بیوع کی جو اقسام ذکر کی ہیں، بِفَضْلِہٖ تَعَالٰی حَتّی الْمَقْدُوْر ان پر بحث کر دی گئی ہے۔ بیع کی کچھ اقسام ایسی بھی ہیں جن کو امام ترمذیؒ نے ذکر نہیں کیا جبکہ وہ احادیث اور فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں اور موجودہ دور میں وہ رائج بھی ہیں اس لیے مناسب خیال کیا کہ ان اقسام پر بھی مختصر انداز میں بحث کر دی جائے تا کہ کسی قدر بیوع کی ان اقسام کے بارے میں بھی معلومات ہو جائیں۔

بَیْعُ الْعِیْنَۃِ

امام ابو داؤد نے بَابٌ فِی النَّھْیِ عَنِ الْعِیْنَۃِ قائم کیا ہے اور اس کے تحت روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے حضور علیہ السلام سے سنا، آپ ﷺ فرما رہے تھے اِذَا تَبَایَعْتُمْ الْعِیْنَۃَ وَاَخَذْتُمْ بِاَذْنَابِ الْبَقَرِ وَرَضِیْتُمْ بِالزَّرْعِ وَتَرَکْتُمْ الْجِھَادَ سَلَّطَ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ ذُلًّا لَا یَنْزِعُہٗ حَتّٰی تَرْجِعُوْا اِلٰی دِیْنِکُمْ جس زمانہ میں تم بیع عینہ کیا کرو گے اور مویشیوں کی دمیں پکڑو گے (یعنی مویشیوں ہی کی فکر ہوگی) اور کھیتی باڑی کو پسند کرو گے اور جہاد چھوڑ دو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ایسی ذلت مسلط کر دے گا کہ وہ اس وقت تک تم سے دور نہ ہوگی جب تک تم اپنے دین کی طرف نہ لوٹو گے۔ (ابو داؤد ج ۲ ص ۱۳۴)

اعتراض اور اس کا جواب

اس پر اعتراض ہے کہ امام منذریؒ نے اس روایت پر جرح کی ہے کہ اس کی سند میں اسحاق بن اسید اور ابو عبد الرحمٰن الخراسانی ہیں جن کی حدیث قابل احتجاج نہیں ہے اور اسی طرح عطاء الخراسانی پر بھی جرح ہے۔ (مختصر سنن ابی داؤد ج ۵ ص ۱۰۲)

اس کے جواب میں علامہ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ اس قسم کی روایت مسند احمد میں بھی ہے جس کی سند یوں ہے حَدَّثَنَا اَسْوَدُ بْنُ عَامِرٍ حَدَّثَنَا اَبُوْبَکْرٍ عَنِ الْاَعْمَشِ عَنْ عَطَاءِ بْنِ اَبِیْ رَبَاحٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اور ابو داؤد شریف کی سند حیوۃ بن شریح تک صحیح ہے اور یہ دونوں سندیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر روایت حسن درجہ کی ہو جاتی ہے۔ نیز

فرماتے ہیں کہ اس کی تیسری سند بھی ہے اور اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس روایت کا اصل ہے اور یہ روایت محفوظ ہے (تہذیب سنن ابی داؤد ج ۵ ص ۱۰۴)

قاضی شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ بیع عینہ والی روایت طبرانی اور ابن القطان نے بھی نقل کی ہے اور ابن القطان نے اس کو صحیح کہا ہے۔ اور علامہ ابن حجرؒ نے فرمایا وَرِجَالُهٗ ثِقَاتٌ کہ اس کے راوی ثقہ ہیں نیز قاضی شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ اس قسم کی روایت حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ سے بھی مرفوعاً ہے اس کی سند اگرچہ کمزور ہے مگر حضرت عائشہؓ کی روایت کی وجہ سے اس کو تقویت حاصل ہو جاتی ہے وَهٰذِهِ الطُّرُقُ يَشُدُّ بَعْضُهَا بَعْضًا (نیل الاوطار ج ۵ ص ۲۱۹) اور یہ اسناد ایک دوسرے سے مل کر روایت کو مضبوط کر دیتی ہیں۔

بیع عِینہ کی تعریف

قاضی شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ عینہ عین کے کسرہ کے ساتھ ہے اور اس کی تعریف یہ کرتے ہیں کہ ایک آدمی کسی سے ادھار مہنگا سودا خرید تا ہے پھر اسی کو نقد میں سستا دے دیتا ہے تو اس کو بیع عینہ کہتے ہیں اور اس کو عینہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ صاحب عینہ کو ثمن نقد مل جاتا ہے (نیل الاوطار ج ۵ ص ۲۱۹) عموماً ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو رقم کی ضرورت ہوتی ہے' وہ کسی سے قرض لینا چاہتا ہے مگر قرض دینے والے قرض دینے سے کتراتے ہیں کیونکہ اس سے ایک عرصہ تک ان کی رقم دوسرے کے پاس چلی جاتی ہے اور وہ یوں بھی نہیں کرتے کہ قرض دے کر رقم زائد کا مطالبہ کریں اس لیے کہ یہ کھلم کھلا سود ہے تو وہ حیلہ یہ کرتے ہیں کہ اس آدمی سے کہتے ہیں کہ ہمارے پاس مال موجود ہے' وہ تم خرید لو تو وہ آدمی مثلاً" سال بھر کی مہلت پر وہ مال خرید لیتا ہے اور پھر وہی مال بائع کو پہلے مقرر شدہ ثمن سے کم پر نقد دے دیتا ہے اور نقد رقم سے فائدہ اٹھاتا ہے تو یہ ایک قسم کا غلط حیلہ ہے اور دھوکہ ہے۔

بیع عینہ کے بارے میں ائمہ کرام کے اقوال

قاضی شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ' امام مالکؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ بیع عینہ جائز نہیں ہے اور امام شافعیؒ اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔ قاضی شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ مُسْتَدِلِّيْنَ عَلَى الْجَوَازِ بِمَا وَقَعَ مِنَ اَلْفَاظِ الْبَيْعِ الَّتِىْ لَا يُرَادُ بِهَا حُصُوْلُ مَضْمُوْنِهٖ

وَطَرَحُوا الْاَحَادِيْثَ الْمَذْكُوْرَةَ فِي الْبَابِ (نیل الاوطار ج ۵ ص ۲۲۰) جو حضرات جائز قرار دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اس کا ذکر بیع کے الفاظ سے ہوا ہے۔ مگر اس کا ذکر بیع کے ایسے الفاظ سے ہوا ہے جن سے اس کے مضمون کا حصول مراد نہیں لیا جا سکتا (یعنی ان الفاظ سے بیع کا مفہوم ثابت نہیں ہوتا) اور انہوں نے اس باب میں مذکورہ احادیث کو نہیں لیا۔

بیع عینہ کی ممانعت کے دلائل

قاضی شوکانیؒ نے نیل الاوطار میں اور علامہ ابن القیمؒ نے تہذیب سنن ابی داؤد ج ۵ ص ۱۰۰ تا ۱۰۸ میں تفصیل سے اس کی ممانعت کے دلائل بیان کیے ہیں۔

پہلی دلیل کہ اللہ تعالیٰ نے ربا کو حرام قرار دیا ہے اور بیع عینہ ربا کا وسیلہ بنتی ہے۔

دوسری دلیل کہ علامہ ابن القیمؒ نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ سے بیع عینہ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْدَعُ هٰذَا مِمَّا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ بیشک اللہ تعالیٰ کو دھوکہ نہیں دیا جا سکتا اور یہ ایسی چیزوں میں سے ہے جن کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اور یہی جواب حضرت انسؓ نے دیا۔ علامہ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ جب صحابی کہے حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ كَذَا (اللہ کے رسول نے اس کو حرام قرار دیا ہے) یا کہے اَمَرَ بِكَذَا (اس کا حکم دیا ہے) یا کہے قَضٰى بِكَذَا (کہ اس قسم کا فیصلہ کیا ہے) یا کہے اَوْجَبَ كَذَا (اس کو واجب قرار دیا ہے) تو صحابی کا یہ کہنا فِيْ حُكْمِ الْمَرْفُوْعِ اِتِّفَاقًا عِنْدَ اَهْلِ الْعِلْمِ اِلَّا اخْتِلَافًا شَاذًّا لَا يُعْتَدُّ بِهٖ (کہ ناقابل شمار قلیل جماعت کے سوا کسی کا اختلاف نہیں بلکہ اہل علم کا اتفاق ہے کہ صحابی کا ایسا کہنا حکم مرفوع ہوتا ہے (یعنی مرفوع حدیث کی طرح ہوتا ہے) (تہذیب سنن ابی داؤد ج ۵ ص ۱۰۱)

تیسری دلیل وہ روایات ہیں جن میں بیع عینہ کی کراہت بیان کی گئی ہے جیسا کہ بعض روایات کی جانب اشارہ اوپر کر دیا گیا ہے۔

چوتھی دلیل وہ روایات ہیں جن میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے نَهٰى عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِيْ بَيْعَةٍ ایک بیع میں دو بیع سے منع فرمایا ہے اور بیع عینہ میں بھی دو بیع ہو جاتی ہیں۔

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ احادیث میں بیع عینہ کی کراہت تو معلوم ہوتی ہے مگر اس کی تفسیر احادیث میں نہیں ہے البتہ حضرت ابن عباسؓ کے اثر میں اس کی تفسیر موجود ہے کہ مثلاً "کوئی آدمی سودا سو درہم کا بیچتا ہے پھر وہی شخص وہی سودا پچاس درہم میں خرید لیتا ہے۔

مولانا عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ اگر دوسری بیع ثمن وصول کرنے سے پہلے ہو تو یہ ہمارے نزدیک ناجائز ہے۔ اسی طرح اگر پہلے یہ بات شرط کر دی گئی کہ سو درہم کی بیچتا ہوں اور پھر تجھ سے پچاس کی خرید لوں گا تو بیشک پہلی بیع کے بعد ثمن وصول بھی کر لیا ہو تب بھی یہ ناجائز ہے اس لیے کہ یہ مضطر (مجبور آدمی) کی بیع ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے نہ مشتری کو اس سودے سے غرض نہیں ہوتی بلکہ اس کو نقد رقم کی ضرورت ہوتی ہے اور بائع قرض دینے پر راضی نہیں ہوتا تو اس طرح کی بیع اس سے کرتا ہے جو مجبوراً اس کو کرنی پڑتی ہے تو یہ مکروہ ہے اور کراہت کی وجہ یہ ہے کہ اس میں بخل پایا جاتا ہے اور مکارم اخلاق کا ترک پایا جاتا ہے اس لیے کہ شریعت نے ایک دوسرے کے کام آنے کی تلقین کی ہے اور یہ آدمی دوسرے کی مجبوری سے یوں فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ (اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۱۷۰)

مسئلہ تورّق

علامہ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ اگر ایک آدمی کو قرض کی ضرورت ہو مگر اس کو قرض کوئی نہ دے اور وہ کسی آدمی سے ادھار مال خرید کر اسی کو نقد کے بدلے پہلے سے کم ثمن پر بیچ دے تو یہ بیع عینہ ہے اور اگر پہلا بائع نہیں خریدتا بلکہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا آدمی خریدتا ہے تو یہ تورق ہے۔ یعنی یہ آدمی جو نقدی کا محتاج ہے، وہ مجبوراً" یہ خرید و فروخت کرتا ہے تو یہ بھی مکروہ ہے۔

اسی طرح اگر ایک آدمی نقدی کا محتاج ہے، اس کو قرض نہ ملے اور وہ یوں حیلہ کرے کہ مثلاً" اپنا مکان تین لاکھ روپے کا بیچتا ہے اور نقد رقم وصول کرتا ہے پھر وہی مکان وہ ایک سال کی مہلت پر چار لاکھ کا لے لیتا ہے تو علامہ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ امام احمدؒ نے صراحت کی ہے کہ یہ بھی بیع عینہ کی طرح ہے اور مکروہ ہے۔ بیع عینہ اور اس میں فرق صرف اتنا ہے کہ بیع عینہ میں قرض لینے کا محتاج سودا خریدتا ہے اور پھر اسی پر بیچتا ہے اور اس صورت میں قرض لینے کا محتاج اپنی کوئی چیز بیچتا ہے اور پھر ادھار پر خریدتا ہے۔ تورق، ورق سے ہے جس کا معنی ہے چاندی اور اس کو تورق اس لیے کہتے ہیں کہ آدمی کا اصل مقصد تو نقدی ہوتی ہے اور یہ درمیان میں خرید و فروخت صرف مجبوری کی وجہ سے کرتا ہے۔ (تہذیب سنن ابی داؤد ج ۵ ص ۱۰۶ تا ۱۰۸ ملخصاً)

بیع العُربان (بیعانہ)

امام ابو داوٗدؒ نے بَابٌ فِی الْعُرْبَانِ قائم کیا اور اس کے تحت روایت نقل کی ہے نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ بَیْعِ الْعُرْبَانِ (ابو داوٗد ج ۲ ص ۱۳۸) اور اس قسم کی روایت مسند احمد اور نسائی اور موطا امام مالک میں بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بیع العربان سے منع فرمایا ہے۔ مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ فرماتے ہیں کہ عُربان عین کے ضمہ کے ساتھ ہے اور اسی کو عُربُون بھی کہتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ اس کو عربون اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں بیع کی اصلاح اور فساد بیع کا ازالہ ہوتا ہے اور یہ بیعانہ اس لیے دیا جاتا ہے تا کہ کوئی دوسرا آدمی اس کو نہ خرید سکے۔ (بذل المجہود ج ۵ ص ۲۸۶) اور مولانا محمد زکریا صاحبؒ فرماتے ہیں کہ عین کے بجائے ہمزہ کے ساتھ اُربان اور اُربُون بھی کہا جاتا ہے۔ (اوجز المسالک ج ۱۱ ص ۴۳) اور یہی لغات اس میں امام خطابیؒ نے معالم السنن ج ۵ ص ۱۳۲ میں لکھی ہیں۔

بیع العَربان کی تعریف

امام ابو داوٗدؒ نے امام مالکؒ سے یہ تعریف نقل کی ہے کہ ایک آدمی کسی سے کوئی چیز خریدتا ہے یا کرایہ پر لیتا ہے اور اس کو کچھ رقم دیتا ہے کہ اگر میں نے یہ چیز نہ خریدی یا کرایہ پر نہ لی تو جو رقم میں نے تجھے دی ہے' وہ تیری ہو گئی (ابو داوٗد ج ۲ ص ۱۳۹)

اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔

نَھٰی عَنِ الْعَرْبَانِ اَنْ یَّقْدَمَ اِلَیْہِ شَیْءٌ مِّنَ الثَّمَنِ فَاِنِ اشْتَرٰی حُسِبَ مِنَ الثَّمَنِ وَاِلَّا فَھُوَ لَہٗ مَجَّانًا وَفِیْہِ مَعْنَی الْمَیْسِرِ (حجتہ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۰۸)

"نبی کریم ﷺ نے بیع عربان سے منع فرمایا ہے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ آدمی دوسرے سے کوئی چیز خریدتا ہے اور ثمن کا کچھ حصہ پہلے ادا کر دیتا ہے کہ اگر میں نے یہ چیز خرید لی تو یہ رقم ثمن سے وضع کر لی جائے گی ورنہ یہ رقم بائع کو مفت میں مل جائے گی اور اس میں جوا کا معنی پایا جاتا ہے"

بیع العربان کا حکم

قاضی شوکانیؒ نیل الاوطار ج ۵ ص ۱۴۳ میں اور امام خطابیؒ معالم السنن ج ۵ ص ۱۴۳ میں فرماتے ہیں کہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک یہ بیع باطل ہے اور امام احمدؒ اس کے جواز کے قائل ہیں۔ قاضی شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ وَالْاَوْلٰی مَا ذَھَبَ اِلَیْہِ الْجُمْھُوْرُ لِاَنَّ حَدِیْثَ

عَمرو بن شُعَیب قَد وَرَدَ مِن طُرُقٍ یَقوِی بَعضَہا بَعضًا وَلاَنَّہٗ یَتَضَمَّنَ الخَطرَ وَھُوَ اَرجَحُ مِنَ الاِبَاحَۃِ کَمَا تَقَرَّرَ فِی الاَصُولِ کہ جمہور کا مذہب ہی بہتر ہے اس لیے کہ حضرت عمرو بن شعیب والی روایت ایسی اسناد سے وارد ہے کہ وہ آپس میں مل کر روایت کو مضبوط کر دیتی ہیں اور اس لیے بھی کہ اس میں ممانعت ہے اور محرم کو مبیح پر ترجیح ہوتی ہے جیسا کہ اصول میں یہ بات واضح ہے۔

اور حضرت شاہ ولی اللہؒ نے فرمایا ہے کہ اس میں جوا کا معنی پایا جاتا ہے اس لیے ممنوع ہے۔

امام احمدؒ کے دلائل اور ان کے جوابات

قاضی شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ مصنف عبد الرزاق میں حضرت زید بن اسلمؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سے عربان کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے اس کو حلال قرار دیا۔

اس کے جواب میں قاضی شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ ایک تو یہ روایت مرسل ہے اور دوسرا اس میں ایک راوی ابراہیم بن ابی یحییٰ ہے جو کہ ضعیف ہے۔

دوسری دلیل کہ حضرت ابن عمرؓ نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔

اس کے جواب میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں کہ سعید بن المسیب اور ابن سیرین نے فرمایا لَا بَاْسَ اِذَا کَرِہَ السِّلعَۃَ اَن یَّرُدَّھَا وَیَرُدُّ مَعَہَا شَیئًا اگر کوئی آدمی سودا خریدنے کے بعد سودے کو پسند نہ کرے اور سودا واپس کرنے کے ساتھ کوئی چیز ساتھ دے دیتا ہے (جبکہ پہلے سے یہ شرط نہ کی گئی ہو) تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اور یہ صورۃً فسخ ہے اور حقیقتاً بیع جدید ہے اور یہ ہماری بحث سے خارج ہے (اس لیے کہ یہ عربان نہیں ہے)

تیسری دلیل۔ حضرت نافع بن الحارث نے حضرت عمرؓ کے لیے صفوانؓ بن امیہ سے چار ہزار کا دار السجن خریدا کہ اگر حضرت نے پسند نہ کیا تو یہ چار ہزار صفوان ہی کے ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ اس کو جائز سمجھتے تھے۔

اس کے جواب میں مولانا ظفر احمد صاحب فرماتے ہیں کہ یہ بیع عربان نہیں ہے اس لیے کہ عربون تو تب پایا جاتا جبکہ حضرت صفوان کو چار ہزار کے ساتھ دار بھی دیا جاتا حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اور اس کی صورت یہ تھی کہ نافع حضرت عمرؓ کے وکیل تھے اور وکیل بن کر دار خریدا اور کہا کہ اگر حضرت عمرؓ کو پسند نہ آیا تو پھر میں یہ دار لے لوں گا اور جو چار ہزار صفوانؓ کو دیا ہے، وہ اسی کا رہے گا۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ کل ثمن کی ادائیگی کو عربان

نہیں کہتے بلکہ اس کے کسی جزء کی ادائیگی کو کہتے ہیں اور یہاں نافع نے کل ثمن حضرت صفوانؓ کو دیا تھا تو اس پر بیع عربان کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا۔ (اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۱۴۸، ۱۴۹ ملخصا)

امام احمدؒ نے جن روایات میں بیع عربان کی نہی کا ذکر ہے، ان پر جرح کی وجہ سے ان کو ترک کیا ہے مگر اس کا جواب قاضی شوکانی سے گزر چکا ہے کہ ان روایات کی اسناد ایک دوسرے سے مل کر روایت کو قوی بنا دیتی ہیں۔

بَیعَ الِاسۡتِصۡنَاع (آرڈر پر مال تیار کرانا)

شریعت میں غیر موجود چیز کی بیع ممنوع ہے البتہ بَیعِ سَلَم اور بَیعَ الِاسۡتِصۡنَاع اس ممانعت کے حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ بیع سلم کے متعلق بحث ہو چکی ہے اور بیع الاستصناع کے بارے میں صاحب ہدایہ فرماتے ہیں جَازَ اِسۡتِحۡسَانًا بِالۡاِجۡمَاعِ الثَّابِتِ بِالتَّعَامُلِ وَفِی الۡقِیَاسِ لَا یَجُوۡزُ لِاَنَّہٗ بَیۡعَ الۡمَعۡدُوۡمِ (ہدایہ ج ۳ ص ۷۴) بیع الاستصناع جائز ہے کیونکہ اس میں تعامل الناس کی وجہ سے اجماع ثابت ہے اور قیاس تو یہی چاہتا ہے کہ یہ جائز نہ ہو کیونکہ یہ معدوم (غیر موجود) چیز کی بیع ہے۔

بَیعَ الِاسۡتِصۡنَاع کی وہی شرائط ہیں جو بَیعِ سَلَم کی ہیں کہ ایسی چیز میں جائز ہوگی جس کا وصف بیان کیا جا سکے۔ بَیعِ سَلَم اور بیع الاستصناع میں فرق یہ ہے کہ بیع سلم میں رقم ساری پہلے ادا کرنا ہوتی ہے جبکہ بیعِ الاستصناع میں یہ ضروری نہیں۔ اسی طرح بیع سلم میں اجل مقرر ہوتی ہے جبکہ بیع الاِستصناع میں اجل مقرر نہیں ہوتی۔

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ امام زفرؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک بیع الاستصناع جائز نہیں (اس لیے کہ یہ معدوم چیز کی بیع ہے) اور باقی حضرات کے نزدیک جائز ہے (عینی شرح ہدایہ ج ۳ ص ۲۰۴)

اگر بیع الاِستصناع میں آرڈر دینے والے نے آرڈر دیا اور فیکٹری یا کاریگر نے وہ مال تیار کر دیا تو مال تیار کرانے والے نے اگر دیکھا کہ وہ مال مطلوبہ معیار کے مطابق تیار نہیں ہوا تو اس کو لینے یا نہ لینے کا خیار ہوگا۔ اور اگر مطلوبہ معیار کے مطابق ہو تو ان دونوں فریقوں میں سے کوئی فریق انکار نہیں کر سکتا۔ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں "البتہ معیار مطلوب کے مطابق نہ ہو تو بنوانے والا رد کر سکتا ہے اگر بنوانے کے بعد بنوانے والا نہ لے (جبکہ مطلوبہ معیار کے مطابق ہو) تو اس کا بیعانہ کاریگر کو روک لینے کی اجازت ہے۔" (امداد

الفتاویٰ ج ۳ ص ۱۳۱)

بَیْعَ الْبَرَاءَةِ (سودے میں ہر قسم کے عیب سے بری ہونے کی شرط لگا کر بیچنا)

(یا جیسا کہ آج کل کہہ دیتے ہیں کہ فلاں قسم کا سودا جہاں ہے' جیسے ہے کی شرط پر بیچنے کے لیے موجود ہے)

امام محمدؒ نے بیع البراءة کا عنوان قائم کر کے دو روایات ذکر کی ہیں۔ ایک حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی کہ بَاعَ غُلَامًا لَهُ بِثَمَانِ مِائَةِ دَرَاهِمَ کہ انہوں نے ہر قسم کے عیب سے بری ہونے کی شرط پر اپنا غلام آٹھ سو درہم میں بیچا۔ اور دوسری روایت حضرت زید بن ثابتؓ کی نقل کی کہ انہوں نے فرمایا کہ مَنْ بَاعَ غُلَامًا لَهُ بِالْبَرَاءَةِ فَهُوَ بَرِئٌ مِنْ كُلِّ عَيْبٍ کہ جس نے بری الذمہ ہونے کی شرط کے ساتھ اپنا غلام بیچا تو بائع ہر قسم کے عیب سے بری الذمہ ہوگا۔

احناف کا نظریہ اور دلیل

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ اور ہمارے اکثر علماء کا نظریہ یہی ہے کہ ایسی بیع درست ہے اور اہل مدینہ (مالکیہ) نے کہا کہ بائع جس عیب کو مبیعہ کے اندر نہیں جانتا' اس سے بری الذمہ ہوگا اور جس کو جانتا ہے' اس سے بری الذمہ نہیں ہوگا۔ (موطا امام محمد ص ۳۳۵)

یہ مذکورہ روایات احناف کی دلیل ہیں۔ علامہ ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت زید بن ثابتؓ کا اثر امام طحاویؒ نے اپنی کتاب اختلاف العلماء میں بھی نقل کیا ہے۔ اسی طرح یہ اثر امام بیہقیؒ نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے اور اس پر تین اعتراضات کیے ہیں۔

پہلا اعتراض کہ اس کی سند میں شریک متفرد ہے۔

اس کا جواب مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب دیتے ہیں کہ شریک کا تفرد کوئی نقصان نہیں دیتا اس لیے کہ ہمارے نزدیک اس کی حدیث حَسَن درجہ کی ہوتی ہے اور وہ مسلم اور سنن اربعہ (ترمذی' ابو داؤد' نسائی' ابن ماجہ) کا راوی ہے۔

دوسرا اعتراض کہ شریک جب روایت کرتا ہے تو عاصم سے کرتا ہے حالانکہ اس کی کتاب میں عاصم کے بجائے اشعث بن سوار ہے (تو جس کی تحریر میں راوی اور ہے اور نقل میں وہ اور راوی بیان کرتا ہے تو اس کی روایت کیسے لی جا سکتی ہے؟)

اس کا جواب مولانا ظفر احمد صاحبؒ دیتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ شریک نے پہلے اشعث بن سوار سے یہ روایت سنی ہو اور اس کو کتاب میں لکھ دیا ہو اور پھر عاصم سے بھی سنا ہو اور عاصم سے یہ روایت نقل کرتا رہا اور اشعث کو چھوڑ دیا ہو اور شریک کی شان اس سے بلند ہے کہ وہ حدیث کی سند میں جھوٹ بولے۔

تیسرا اعتراض کہ حضرت ابن عمرؓ کا معاملہ جب حضرت عثمانؓ کے سامنے پیش ہوا تو انہوں نے حضرت ابن عمرؓ سے فرمایا کہ تم قسم اٹھاؤ کہ جب تم نے یہ غلام بیچا تھا تو اس وقت اس میں عیب تم نہیں جانتے تھے تو حضرت ابن عمرؓ نے قسم اٹھانے سے انکار کر دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کا نظریہ اس بارہ میں حضرت ابن عمرؓ کے خلاف تھا تو حضرت ابن عمرؓ کے نظریہ کو حضرت عثمانؓ کے نظریہ پر کیسے ترجیح دی جا سکتی ہے؟

اس کا ایک جواب مولانا ظفر احمد صاحب دیتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے اَلْمُسْلِمُوْنَ عَلٰی شُرُوْطِهِمْ کہ مسلمان اپنی طے کردہ شرائط کو پورا کرنے کے پابند ہیں۔ یہ روایت ابو داؤد ج ۲ ص ۱۵۰ اور ترمذی ج ۱ ص ۲۵۱ میں ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کا نظریہ چونکہ اس روایت کے موافق ہے اس لیے وہ راجح ہے۔

اور دوسرا جواب یہ دیتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ کا نظریہ قیاس کے مطابق بھی ہے اس لیے کہ بری کرنا مشتری کا حق ہے اور جب مشتری بائع کو ایسے عیوب سے بری کر سکتا ہے جن کو نہ وہ جانتا ہے اور نہ بائع جانتا ہے تو ایسے عیوب سے بھی بری کر سکتا ہے جن کو وہ نہیں جانتا اور بائع جانتا ہے۔ اور مولانا ظفر احمد صاحب فرماتے ہیں کہ عیوب سے بری ہونے کی شرط سے معقود علیہ کی صفت کی جہالت لازم آتی ہے اور یہ عقد کے جواز سے مانع نہیں جیسا کہ گندم کا ڈھیر ہو اور پورے ڈھیر کا سودا کر لیا گیا (اور ایسی بیع جائز ہے) حالانکہ اس ڈھیر کی مقدار معلوم نہیں ہے۔ (اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۹۲، ۹۳ ملخصاً)

بَیْعُ الْحُرِّ (آزاد آدمی کی خرید و فروخت)

امام بخاریؒ نے بَابُ اِثْمِ مَنْ بَاعَ حُرًّا قائم کیا ہے اور اس کے تحت حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت نقل کی کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن تین قسم کے آدمیوں کے خلاف میں فریق بنوں گا۔ ایک وہ آدمی جس نے میرے نام کی قسم اٹھا کر اس کو توڑا وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَاَكَلَ ثَمَنَهٗ دوسرا وہ آدمی جس نے کسی آزاد آدمی کو بیچ کر اس کی قیمت کھائی اور تیسرا وہ آدمی جس نے مزدور سے کام تو لیا مگر اس کو مزدوری

نہ دی (بخاری ج ۱ ص ۲۹۷) علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ پہلے قرضہ کے بدلے میں آزاد آدمی کو بیچا جاتا تھا یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی وَاِنۡ کَانَ ذُوۡ عُسۡرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰی مَیۡسَرَةٍ (سورۃ البقرہ آیت ۲۸۰) اگر مقروض تنگ دست ہو تو اس کو آسانی تک مہلت دو۔ نیز علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ وَاسۡتَقَرَّ الۡاِجۡمَاعُ بِالۡمَنۡعِ (اجماع اسی پر ہے کہ آزاد آدمی کی بیع ممنوع ہے) (فتح الباری ج ۵ ص ۳۲۳)

انسانی اعضاء کی خرید و فروخت

علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں وَشَعۡرُ الۡاِنۡسَانِ وَالۡاِنۡتِفَاعُ بِہٖ اَیۡ لَمۡ یَجُزۡ بَیۡعُہٗ وَالۡاِنۡتِفَاعُ بِہٖ لِاَنَّ الۡاٰدَمِیَّ مُکَرَّمٌ غَیۡرَ مُبۡتَذَلٍ فَلَا یَجُوۡزُ اَنۡ یَّکُوۡنَ شَیۡءٌ مِّنۡ اَجۡزَاءِہٖ مُهَانًا مُبۡتَذَلًا (البحر الرائق ج ۶ ص ۸) اور انسانی بالوں کا بیچنا جائز نہیں ہے اس لیے کہ آدمی مکرم (باعزت) ہے تو اس کے کسی بھی جزء کو بے وقعت کرنا درست نہیں ہے اور علامہ شامیؒ نے بالوں کی طرح انسانی ناخنوں کی خرید و فروخت سے منع فرمایا ہے۔ وَکَذَا بَیۡعُ مَا انۡفَصَلَ عَنِ الۡاٰدَمِیِّ کَشَعۡرٍ وَظُفُرٍ لِاَنَّہٗ جُزۡءُ الۡاٰدَمِیِّ وَلِذَا وَجَبَ دَفۡنُہٗ (شامی ج ۵ ص ۲۴۶) اور اسی طرح انسانی جسم سے اس کے جو اجزاء جدا ہوئے ہوں' ان کا بیچنا بھی درست نہیں ہے جیسا کہ بال اور ناخن۔ اس لیے کہ یہ آدمی کا جزو ہیں اسی لیے ان کو دفن کرنا ضروری ہے۔ اور جو حکم زندہ انسان کا ہے' وہی میت کا ہے اس لیے کہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کَسۡرُ عَظۡمِ الۡمَیِّتِ کَکَسۡرِہٖ حَیًّا (ابو داؤد ج ۲ ص ۱۰۲) مردہ کی ہڈی توڑنا ایسا ہی ہے جیسا کہ زندہ کی ہڈی توڑنا۔

عورت کے دودھ بیچنے کے بارے میں ائمہ کرام کے اقوال

ہماری مذکورہ بحث سے واضح ہو گیا کہ انسانی جسم حرمت والا ہے' اس کے اجزاء کی خرید و فروخت درست نہیں ہے البتہ عورت کا دودھ بیچنے اور خریدنے کے بارے میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔

احناف انسانی تکریم کے پیش نظر اشد مجبوری کی حالت کے علاوہ منع کرتے ہیں۔ علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں لَمۡ یَجُزۡ بَیۡعُ لَبَنِ الۡمَرۡاَۃِ لِاَنَّہٗ جُزۡءُ الۡاٰدَمِیِّ وَهُوَ بِجَمِیۡعِ اَجۡزَائِہٖ مُکَرَّمٌ عَنِ الۡاِبۡتِذَالِ بِالۡبَیۡعِ (البحر الرائق ج ۶ ص ۸۱) یعنی عورت کا دودھ بیچنا درست نہیں اس لیے کہ وہ انسانی جزء ہے اور انسان اپنے تمام اجزاء کے ساتھ بیع کے ساتھ بے وقعت ہونے سے بالا اور مکرم ہے۔

اور صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ وَلَا یَجُوْزُ لَبَنُ اِمْرَاَۃٍ فِیْ قَدَحٍ وَقَالَ الشَّافِعِیُّ یَجُوْزُ بَیْعُہٗ لِاَنَّہٗ مَشْرُوْبٌ طَاہِرٌ اور برتن میں عورت کا دودھ بیچنا جائز نہیں ہے اور امام شافعیؒ اس کی بیع جائز قرار دیتے ہیں اس لیے کہ وہ ایک پاکیزہ مشروب ہے (برتن میں ہونے کی قید اس لیے لگائی ہے کہ پستانوں میں تو بالاتفاق بیچنا درست نہیں ہے جیسا کہ دیگر جانوروں کا دودھ تھنوں میں ہوتے ہوئے بیچنا جائز نہیں ہے اس لیے کہ اس میں غرر یعنی دھوکا پایا جاتا ہے) اور علامہ عینی فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا نظریہ بھی احناف کی طرح ہے۔ (عینی شرح ہدایہ ج ۳ ص ۹۳)

علاج کی غرض سے بعض احناف نے عورت کے دودھ کی خرید وفروخت کو جائز قرار دیا ہے۔ عالمگیری ج ۱ ص ۳۳ میں ہے لَا بَأْسَ بِاَنْ یَسْعَطَ الرَّجُلُ بِلَبَنِ الْمَرْاَۃِ وَیَشْتَرِیَہٗ لِلدَّوَاءِ اگر آدمی علاج کے لیے ناک کے ذریعہ سے عورت کا دودھ ٹپکاتا ہے اور اس کو خریدتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

انسانی خون کی خرید وفروخت

اسی طرح شدید ضرورت اور جان بچانے کی خاطر خون کا خریدنا اور اس کو دوسرے جسم میں منتقل کرنا بھی درست ہے مگر یہ اس حالت میں ہے کہ ماہر طبیب وڈاکٹر کو ظن غالب ہو کہ اس کے بغیر مریض کی جان بچانا مشکل ہے۔ عام حالات میں خون کا ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل کرنا درست نہیں ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے جواہر الفقہ میں جو بحث اس بارہ میں فرمائی ہے' اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب خون بدن سے نکلتا ہے تو وہ ناپاک ہو جاتا ہے اور ناپاک چیز کا کسی دوسرے جسم میں منتقل کرنا درست نہیں ہے۔ اسی طرح یہ خون انسانی جسم کا حصہ ہے اور انسانی تکریم کا تقاضا ہے کہ اس کے کسی حصہ کو استعمال نہ کیا جائے۔ اور جیسے انسان کو جان بچانے کے لیے مردار اور خنزیر کھانا درست ہے' اسی طرح یہ بھی درست ہے اور یہ اضطرار کی حالت میں درست ہے (اس کی تفصیل کے لیے جواہر الفقہ کا مطالعہ فرمائیں)

اور حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی دام مجدہم فرماتے ہیں کہ محض ڈاکٹری تعلیم کے لیے انسانی ڈھانچوں کو تختہ مشق بنانا اور اپنی تحقیق کا ذریعہ بنانا درست نہیں ہے۔ جبکہ سائنس نے اس کے لیے متبادل صورت بھی مہیا کر دی ہے اور مصنوعی ڈھانچے تیار کر لیے گئے ہیں جن کے ذریعہ سے مکمل معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں (ملاحظہ ہو ان کا

رسالہ ڈاکٹری تعلیم کے لیے انسانی ڈھانچے)

مرتے وقت اپنے اعضاء کا عطیہ دینا

جو لوگ مرنے سے پہلے اپنی آنکھوں کا عطیہ کر جاتے ہیں کہ ہمارے مرنے کے بعد کسی نابینا کو لگا دی جائیں اور اس کو انسانی ہمدردی سمجھا جاتا ہے تو یہ بھی درست نہیں ہے اس لیے کہ انسان کے پاس اس کا وجود اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ اسی لیے خودکشی کو حرام قرار دیا گیا ہے اور انسان قیامت کے دن اپنے اجزاء اصلیہ کے ساتھ ہی اٹھایا جائے گا اور اجزاء اصلیہ وہ ہیں جو پیدائش کے وقت تھے' ان میں ناجائز تصرف کی انسان کو اجازت نہیں ہے اس لیے اس بارے میں احتیاط بہرحال بہتر ہے۔ اور معذور حضرات کو فائدہ پہنچانے کے لیے سائنسی طور پر کوئی متبادل انتظام کرنا چاہیے جیسا کہ مصنوعی اعضاء تیار کرتے گئے ہیں اسی طرح باقی معاملات کا حل بھی کر لینا چاہیے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

بَیْعُ الْمُضْطَرِّ (مجبور آدمی کا خرید و فروخت کرنا)

امام ابو داوُدؒ نے باب فی بیع المضطر قائم کیا اور اس کے تحت حضرت علیؓ کی روایت نقل کی ہے جس میں یہ الفاظ بھی ہیں وَقَدْ نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ الْمُضْطَرِّ (ابو داوُد ج ۲ ص ۱۲۳' ۱۲۴) کہ نبی کریم ﷺ نے بیع المضطر سے منع فرمایا ہے۔ امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت کی سند میں ایک راوی مجہول ہے جس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کون ہے۔

بیع المضطر کی صورتیں

امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ بیع المضطر کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ کوئی اس کو خریدنے یا بیچنے پر مجبور کرے (یعنی کسی نے جان سے مار دینے کی دھمکی دی کہ یہ زمین یا مکان اتنے ثمن کے بدلے میں بیچ اور اس نے جان بچانے کے لیے بیچ دیا) تو یہ عقد فاسد ہے۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ کسی آدمی پر قرض اس قدر ہو گیا کہ وہ اپنی ملکیتی چیز کو انتہائی کم قیمت پر مجبوری کی وجہ سے بیچتا ہے اور یہ بیع نافذ ہو جائے گی اور اس کو فسخ نہیں کیا جا سکتا لیکن بہتر یہ ہے کہ اس آدمی کو مہلت دی جائے یا اس کے قرض کی ادائیگی میں

اس کی مدد کی جائے (معالم السنن ج ۵ ص ۴۷)

بیع المضطر کا حکم

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کو مجبور کیا گیا اور اس نے ایسی حالت میں انتہائی کم قیمت پر اپنی قیمتی چیز بیچ دی یا انتہائی مہنگے داموں اس نے دوسرے سے معمولی قیمت کی چیز خرید لی اور مبیعہ کو لے لیا اور بیچنے کی صورت میں مبیعہ مشتری کے حوالے کر دیا تو ہمارے تینوں اصحاب (امام ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ) کے نزدیک ملک فاسد ثابت ہو جاتی ہے اور باقی بیوع فاسدہ کی طرح اس کو بھی فسخ کیا جائے گا اور امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ ملک فاسد بھی ثابت نہیں ہوتی اس لیے کہ بیع میں بائع اور مشتری دونوں کی رضا ضروری ہے اور یہاں ابھی تک رضا نہیں اس لیے بیع موقوف ہوگی (عینی شرح ہدایہ ج ۳ ص ۷۶۶)

مولانا ظفر احمد صاحب ابن حزم کے اَلْمَحَلّٰی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ وَقَدِ اتَّفَقْنَا اَلْحَنَفِيّوْنَ وَالْمَالِكِيّوْنَ وَالشَّافِعِيّوْنَ عَلٰى اِبْطَالِ بَيْعِ الْمُكْرَهِ عَلَى الْبَيْعِ کہ حنفی، مالکی اور شافعی سب کا اتفاق ہے کہ جس آدمی کو بیع پر مجبور کیا گیا ہو، اس کی بیع باطل ہے۔ اور مولانا ظفر احمد صاحبؒ فرماتے ہیں وَلَعَلَّهٗ حَمَلَ قَوْلَنَا بِالْفَسَادِ عَلٰى مَعْنَى الْاِبْطَالِ اور ہو سکتا ہے کہ ہم فساد کا جو قول کرتے ہیں، اس کو اس نے ابطال کے معنی پر محمول کیا ہو۔ (اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۲۰۷) اور حضرت مولانا محمد صدیق نجیب آبادی فرماتے ہیں کہ ہمارے (احناف کے) نزدیک مکرہ کی بیع منعقد ہو جاتی ہے مگر نافذ نہیں ہوتی اس لیے کہ ہمارے نزدیک قاعدہ یہ ہے کہ مکرہ (جس کو مجبور کیا گیا ہو) اس کے قولی تصرفات منعقد ہو جاتے ہیں پھر جو تصرفات فسخ کا احتمال رکھتے ہیں، ان میں فسخ ہوگا جیسا کہ بیع اور اجارہ وغیرہ ہیں اور جن میں فسخ کا احتمال نہیں تو وہ لازم ہوں گے جیسا کہ طلاق، عتاق، نکاح اور تدبیر وغیرہ (انوار المحمود ج ۲ ص ۳۰۴)

بیع باطل

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں وَحَاصِلُ الْكَلَامِ اَلْبَاطِلُ مَا لَا يَكُوْنُ مَشْرُوْعًا بِاَصْلِهٖ وَوَصْفِهٖ لِانْتِفَاءِ رُكْنِهٖ وَمَحَلِّهٖ (عینی شرح ہدایہ ج ۳ ص ۷۹) مذکورہ بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ بیع باطل وہ ہوتی ہے جو اپنے اصل اور وصف ہر لحاظ سے غیر مشروع ہو۔ اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ بیع کے ارکان (ایجاب وقبول) میں سے کوئی نہ پایا جائے اور دوسری

صورت یہ ہے کہ وہ چیز بیع کا محل نہ ہو کہ شریعت نے اس کو مال متقوم قرار نہ دیا ہو جیسا کہ مردار وغیرہ ہر حرام چیز کی بیع باطل ہے۔ اور ذی روح چیزوں کی تصاویر بھی حرام ہیں' ان کی بیع بھی باطل ہے اور غیر ذی روح درخت وغیرہ کی تصاویر جائز ہیں اور ان کی بیع بھی درست ہے۔ اور اسی طرح آزاد آدمی کی بیع بھی باطل ہے اس لیے کہ یہ بیع کا محل نہیں ہے۔ بیع باطل کا حکم یہ ہے کہ یہ سرے سے منعقد ہی نہیں ہوتی' مبیعہ بدستور بائع کا اور ثمن بدستور مشتری کا رہتا ہے۔ بیشک انہوں نے تبادلہ کر کے قبضہ بھی کر لیا ہو۔

بیع فاسد

علامہ عینی فرماتے ہیں کہ وَالْفَاسِدَ مَا يَكُوْنَ مَشْرُوْعًا بِاَصْلِهٖ دُوْنَ وَصْفِهٖ وَيُثْبَتُ بِهِ الْمِلْكَ اِذَا اتَّصَلَ بِهِ الْقَبْضَ (عینی شرح ہدایہ ج ۳ ص ۷۹) اور بیع فاسد وہ ہے کہ جو اپنے اصل کے لحاظ سے مشروع ہو اور وصف کے لحاظ سے غیر مشروع ہو اور اس کا حکم یہ ہے کہ جب مبیعہ پر مشتری قبضہ کر لے اور ثمن پر بائع قبضہ کر لے تو ملکیت ثابت ہو جاتی ہے۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہر ایسی شرط جو بیع کی شرائط میں سے نہ ہو' وہ بائع مشتری پر یا مشتری بائع پر لگا دے جس کا عقد تقاضا نہیں کرتا اور اس میں بائع یا مشتری کو فائدہ ہو تو اس شرط فاسد کی وجہ سے بیع فاسد ہوگی۔ (موطا امام محمد ص ۳۴۲) اور فقہ کی کتابوں میں بھی یہ بھی مذکور ہے یا اس شرط کی وجہ سے مبیعہ کو فائدہ پہنچتا ہو۔ ایسی صورت میں یا تو اس شرط فاسد کو دور کریں یا پھر ایسی بیع کا فسخ کرنا (توڑنا) ضروری ہے۔

بیع فاسد کی اور صورتیں بھی ہیں جو فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

بیع تولیہ

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ وَالتَّوْلِيَةَ نَقْلَ مَا مَلَكَهٗ بِالْعَقْدِ الْاَوَّلِ بِالثَّمَنِ الْاَوَّلِ مِنْ غَيْرِ زِيَادَةِ رِبْحٍ یعنی جتنے کی چیز خریدی ہو' اتنے کی ہی بیچ دے اور کوئی منافع نہ لے تو یہ بیع تولیہ ہے۔

بیع مرابحہ

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں اَلْمُرَابَحَةَ نَقْلَ مَا مَلَكَهٗ بِالْعَقْدِ الْاَوَّلِ بِالثَّمَنِ الْاَوَّلِ مَعَ زِيَادَةِ رِبْحٍ کہ بیع مرابحہ وہ ہے کہ جتنے کی چیز خریدی ہو' اس سے کچھ منافع لے کر بیچنا۔

نیز فرماتے ہیں وَلَا تَصِحُّ الْمُرَابَحَةُ وَالتَّوْلِيَةُ حَتّٰى يَكُوْنَ الْعِوَضُ مِمَّا لَهٗ مِثْلٌ کہ بیع مرابحہ اور بیع تولیہ اس وقت صحیح ہوں گی جب وہ چیز مثلی ہو جس کو اس مبیعہ کا عوض مقرر کیا گیا ہے۔ نیز فرماتے ہیں وَالْبَيْعَانِ جَائِزَانِ لِاسْتِجْمَاعِ شَرَائِطِ الْجَوَازِ اور بیع مرابحہ اور بیع تولیہ دونوں جائز ہیں اس لیے کہ ان میں جواز کی تمام شرائط پائی جاتی ہیں۔ (ہدایہ ج ۳ ص ۴۸)

بَيْعُ الصَّكِّ (جس دستاویز پر کوئی چیز دینے کا اقرار نامہ ہو' اس کا بیچنا)

امام مالکؒ نے اَلْعِيْنَةُ وَمَا يُشْبِهُهَا وَبَيْعُ الطَّعَامِ قَبْلَ اَنْ يُّسْتَوْفٰى کا عنوان قائم کر کے اس کے تحت روایت لکھی ہے کہ مروان بن الحکم کے زمانہ میں حکومتی سطح پر جو دستاویزات جاری کی جاتی تھیں' ان کو خرید کر اشیاء کو وصول کرنے سے پہلے ہی لوگوں نے ان دستاویزات کو آگے بیچنا شروع کر دیا تو حضرت زید بن ثابتؓ اور صحابہ میں سے ایک اور شخصیت مروان کے پاس تشریف لائے اور کہا کہ کیا تو ربا کو حلال سمجھتا ہے؟ تو اس نے کہا کہ میں تو اس سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ معاملہ کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا هٰذِهِ الصُّكُوْكُ تَبَايَعَهَا النَّاسُ ثُمَّ بَاعُوْهَا قَبْلَ اَنْ يَّسْتَوْفُوْهَا کہ یہ دستاویزات لوگ خریدتے ہیں اور پھر ان کے مطابق مال وصول کرنے سے پہلے ہی بیچ رہے ہیں تو مروان نے اس پر پابندی لگا دی۔ (موطا امام مالک ص ۵۸۵)

اس روایت کی تشریح میں امام زرقانیؒ فرماتے ہیں کہ صکوک' صک کی جمع ہے' اسی طرح صک کی جمع صکاک بھی آتی ہے اور صک کہتے ہیں اس کاغذ کو جس پر حکمران مستحق کے لیے طعام لکھ کر دیتا ہے کہ اتنا طعام اس کو دے دیا جائے۔ (زرقانی شرح موطا ج ۳ ص ۲۸۸)

مولانا ظفر احمد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ موطا کے محشی نے لکھا ہے کہ اس سے یہی بات واضح ہوتی ہے کہ یہ دستاویز یا ٹوکن جاری کرنا بھی درست ہے اور جس کو دستاویز جاری کی گئی ہے' وہ اس کے مطابق مال پر قبضہ کرنے سے پہلے بھی دستاویز کو بیچ سکتا ہے۔ اور جس نے وہ خریدی ہے' وہ اس کے مطابق مال پر قبضہ کرنے سے پہلے نہیں بیچ سکتا (اس لیے کہ روایت کے الفاظ ہیں هٰذِهِ الصُّكُوْكُ تَبَايَعَهَا النَّاسُ ثُمَّ بَاعُوْهَا کہ ان صکوک کو لوگ خریدتے ہیں اور پھر ان کو قبضہ سے پہلے بیچتے ہیں۔ تو پہلی بیع درست ہوئی اور دوسری ممنوع)

اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہلی بیع ہی درست نہیں ہے مگر درست بات یہی ہے کہ پہلی بیع درست ہے اور دوسری ممنوع ہے اس لیے کہ جس کو یہ اقرار نامہ جاری کیا گیا ہے' وہ تو اس کا مستقل مالک ہے' مشتری نہیں ہے تو اس کے لیے قبضہ سے پہلے بیچنا ممنوع نہیں ہے جیسا کہ وراثت میں اپنا حصہ پانے والا اس پر قبضہ سے پہلے اس کو بیچ سکتا ہے' اسی طرح یہ صک بھی بیچ سکتا ہے۔

اور امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ وَالْاَصَحُّ عِنْدَنَا جَوَازُ بَيْعِهَا وَهُوَ قَوْلُ مَالِكٍ کہ ہمارے (شوافع) کے نزدیک ان صکوک کا بیچنا جائز ہے اور امام مالکؒ کا بھی یہی نظریہ ہے۔ علامہ ظفر احمد صاحب مزید لکھتے ہیں کہ اگر دستاویز یا ٹوکن لینے والے نے اس پر لکھی گئی اشیاء یا رقم سے کمی بیشی کے ساتھ وہ ٹوکن لیا تو درست نہیں ہوگا اور اگر اس کے مطابق لیا تو یہ استقراض اور حوالہ کی مد میں شامل ہوگا اور جائز ہوگا۔ (اعلاء السنن ص ۲۴۰ تا ۲۴۴ ملخصاً)

اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ان صکوک کا بیچنا درست نہیں ہے اور یہی قول ہے امام ابو حنیفہؒ کا اس لیے کہ معلوم نہیں کہ اس ٹوکن کے مطابق مال حاصل ہوتا بھی ہے یا نہیں اس لیے اس میں غرر پایا جاتا ہے (موطا امام محمد ص ۳۵۳) آج کل بینک کی جانب سے چیک دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی آدمی چیک بیچتا ہے تو درست ہے اور اگر خریدنے والا آگے بیچنا چاہے تو درست نہیں ہوگا۔

اسی طرح ایک متعین مال کے لیے کوئی فیکٹری ٹوکن جاری کرتی ہے کہ جس تاجر کو یہ ٹوکن جاری کیا گیا ہے' وہ اتنا مال فلاں وقت لے لے اور یہ تاجر وہ ٹوکن بیچ دیتا ہے تو یہ درست ہے اور جس نے یہ ٹوکن خریدا ہے' جب تک وہ اس کے مطابق مال وصول نہیں کر لیتا' اس وقت تک نہیں بیچ سکتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

بَیْعَ الدَّیْنِ (قرض کا فروخت کرنا)

زید نے عمرو سے پانچ سو روپیہ لینا ہے اور زید خالد سے کہتا ہے کہ میں نے جو قرض لینا ہے' وہ تجھ پر بیچتا ہوں یا عمرو خالد سے کہتا ہے کہ میرے ذمہ جو قرض ہے' وہ تو خرید لے۔ اگر خالد نے وہ قرض پانچ سو روپے کے بدلے میں خریدا تب بھی درست نہیں اور اگر اس سے کمی بیشی سے خریدا' تب بھی درست نہیں اس لیے کہ روپیہ کا روپیہ سے تبادلہ ہے اور اس کو بیع صرف کہتے ہیں اور اس میں دو شرطیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ دونوں جانب

برابری ہو اور دوسرا یہ کہ ادھار کسی جانب سے نہ ہو۔ کمی بیش کی صورت میں برابری نہیں پائی جا رہی اور برابری کی صورت میں ایک جانب سے ادھار ہے کہ عمرو فی الحال رقم نہیں دے رہا ورنہ وہ قرض بیچنے کی بجائے زید کو ہی دے دیتا اس لیے یہ درست نہیں ہے۔

اگر زید نے بکر سے قرض وصول کرنا ہے اور بکر نے خالد سے وصول کرنا ہے تو اگر بکر زید سے کہہ دے کہ تم میرے ذمہ کا قرض خالد سے لے لینا اور زید بھی تسلیم کرے اور خالد بھی تسلیم کرے تو یہ حوالہ ہے' اس کو قرض بیچنا نہیں کہتے اور یہ آج کل عام ہے کہ ایک پارٹی اپنے ذمہ کی رقم دوسرے کے حوالہ کر دیتی ہے اور حوالہ کی بحث بَابُ مَا جَاءَ فِیْ مَطْلِ الْغَنِیِّ ظُلْمٌ میں گزر چکی ہے۔

بَیْعُ الْکَالِیِٔ بِالْکَالِیِٔ (بائع اور مشتری دونوں کی جانب سے ادھار کی صورت میں بیع)

قاضی شوکانیؒ نے دار قطنی کے حوالے سے حضرت ابن عمرؓ کی روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے نَهٰی عَنْ بَیْعِ الْکَالِیِٔ بِالْکَالِیِٔ بیع الکالی بالکالی سے منع فرمایا ہے۔ قاضی شوکانی فرماتے ہیں کہ امام حاکم نے اس روایت کو علیٰ شرط مسلم صحیح کہا ہے مگر حاکم کا تعاقب کیا گیا ہے کہ اس میں ایک راوی موسیٰ بن عبیدہ ہے اور روایت کرنے میں متفرد بھی ہے۔ اس کے بارے میں امام احمدؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک اس سے روایت لینا صحیح نہیں ہے۔ اس بارے میں اگرچہ کوئی روایت صحیح نہیں ہے مگر اس پر اجماع ہے کہ لَا یَجُوْزُ بَیْعُ دَیْنٍ بِدَیْنٍ کہ قرض کو قرض کے بدلے میں بیچنا جائز نہیں ہے اور آگے فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے بَیْعُ النَّسِیْئَةِ بِالنَّسِیْئَةِ (یعنی بائع مبیعہ دینے میں ادھار کرتا ہے اور مشتری ثمن دینے میں ادھار کرتا ہے تو یہ نَسِیْئَه مِنَ الْجَانِبَیْنِ ہے اور اسی کو بَیْعُ الْکَالِیِٔ بِالْکَالِیِٔ کہتے ہیں۔ نیل الاوطار ج ۵ ص ۱۶۶ ملخصاً)

اَلْبَیْعُ عِنْدَ اَذَانِ الْجُمُعَةِ (جمعہ کی اذان کے وقت خرید و فروخت)

مولانا ظفر احمد صاحبؒ مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں وَبِالْجُمْلَةِ فَالنِّدَاءُ لِلْاِعْلَامِ هُوَ الْاَذَانُ الْاَوَّلُ بَعْدَ الزَّوَالِ سَوَاءٌ کَانَ عَلَی الْمَنَارَةِ اَوْ بَیْنَ یَدَیِ الْخَطِیْبِ وَهُوَ الْمُحَرِّمُ لِلْبَیْعِ الْمُوْجِبُ لِلسَّعْیِ لِقَوْلِ ابْنِ عَبَّاسٍ اس مذکورہ بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ زوال کے بعد جو پہلی اذان ہے' اسی کا اعتبار ہے خواہ وہ مینارہ پر دی جائے یا خطیب کے سامنے کہی جائے' اور یہی اذان بیع کو حرام کرنے والی اور جمعہ کی جانب سعی کو واجب کرنے والی ہے اور اس پر دلیل حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے۔

جمعہ کی اذان کے بعد خرید وفروخت کا حکم

مولانا ظفر احمد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ جمعہ کی اذان کے بعد کی جانے والی بیع فاسد ہے۔ اور احناف کے اقوال نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اذان جمعہ کے وقت اور اس کے بعد (نماز جمعہ سے فارغ ہونے تک) بیع مکروہ تحریمی ہے اور البحر الرائق کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ ایسی بیع کا فسخ کرنا (توڑنا) ضروری ہے۔ اور آگے البحر الرائق کے حوالہ سے لکھتے ہیں (کہ قرآن کریم میں فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ (پارہ ۲۸ سورۃ الجمعہ آیت ۹) اللہ کے ذکر کی جانب دوڑو اور بیع چھوڑ دو) کہ بیع سے مراد صرف خرید وفروخت نہیں بلکہ ہر ایسا عمل ہے جو جمعہ کی جانب سعی سے رکاوٹ بنے اور ہر ایسا عمل مکروہ ہوگا۔ (اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۲۰۱ تا ۲۰۴ ملخصاً) جمعہ کی اذان کے وقت سے لے کر جمعہ کی نماز سے فارغ ہونے تک ہر ایسے عمل کو چھوڑنا ضروری ہے جو جمعہ کی جانب سعی میں رکاوٹ بنے اور ایسے وقت میں کی گئی بیع کا فسخ ضروری ہے تو ایسے وقت میں نکاح کرنے والے حضرات کو سوچ لینا چاہئے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟

بَیْعَ الْحَیْوَانِ بِاللَّحْمِ (جانور کو گوشت کے بدلے میں بیچنا)

امام محمدؒ نے بَابَ شِرَاءِ الْحَیْوَانِ بِاللَّحْمِ قائم کیا اور اس کے تحت روایات نقل کی ہیں۔ ان میں سے ایک روایت حضرت سعید بن المسیبؒ سے ہے کہ نبی کریم ﷺ نے نَھٰی عَنْ بَیْعِ الْحَیْوَانِ بِاللَّحْمِ حیوان کی گوشت کے بدلے میں بیع سے منع فرمایا ہے اور اس کے حاشیہ میں مولانا عبد الحیٔ لکھنویؒ فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ امام ابو یوسفؒ اور امام شافعیؒ کے شاگرد امام مزنیؒ کے نزدیک جانور کی گوشت کے بدلے میں بیع جائز ہے خواہ یہ گوشت اسی جانور کی جنس جانور کا ہو جیساکہ بکری کے بدلے بکری کا گوشت یا اسی کے جنس کا نہ ہو مثلاً" بکری کے بدلے گائے یا اونٹ کا گوشت ہو۔ برابر برابر ہو یا کمی بیشی کے ساتھ ہو (مثلاً" بکری بھی پچیس کلو وزنی ہے اور گوشت بھی پچیس کلو یا بکری پچیس کلو ہے اور گوشت بیس یا تیس کلو ہے) صرف شرط یہ ہے کہ یدا بیدا ہو اور اگر کسی جانب سے ادھار ہے تو درست نہیں۔ اور اس کے جواز کی دلیل یہ ہے کہ موزونی چیز کو غیر موزونی چیز کے بدلے بیچا جا رہا ہے اس لیے کہ گوشت وزن کر کے بیچا جاتا ہے جبکہ زندہ جانور کو وزن کر کے نہیں بیچا جاتا اور اگر اس کو وزن کر کے بھی لیا جائے تو پھر بھی اس کا وزن صحیح طور پر معلوم نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ جانور کسی وقت اپنا سانس روک کر وزنی ہو جاتا ہے اور کبھی ہلکا

ہو جاتا ہے۔ اور جب قدر مختلف ہو تو بیشک جنس ایک ہو' اس میں کمی بیشی ممنوع نہیں ہے۔

اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اگر جنس ایک نہ ہو بلکہ مثلاً" ایک جانب بکری ہے اور دوسری جانب اونٹ یا گائے کا گوشت ہے تو ایسی بیع ہر حال میں جائز ہے اور اگر جنس ایک ہو مثلاً" ایک جانب بکری ہے اور دوسری جانب بکری کا گوشت ہے تو یہ گوشت زیادہ ہونا چاہئے تا کہ بکری کے گوشت کے بدلے میں گوشت ہو جائے اور زائد گوشت' پائے' کلیجی اور اوجھڑی وغیرہ کے بدلے میں ہو جائے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو ان کے نزدیک یہ ربا ہوگا۔

اگر جانور اور گوشت ایک ہی جنس کے ہوں یعنی ایک جانب بکری اور دوسری جانب بکری کا گوشت ہو تو امام مالکؒ' امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک ایسی بیع درست ہی نہیں۔ اور اگر جانور اور گوشت ایک ہی جنس کے نہ ہوں بلکہ ایک جانب بکری اور دوسری جانب گائے کا گوشت ہو تو امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک یہ بیع جائز ہے اور امام شافعیؒ کے ایسی حالت میں دو قول ہیں۔ ایک قول کے مطابق جائز ہے اور دوسرے قول کے مطابق جائز نہیں اور اس بارے میں نَهٰی عَنْ بَيْعِ الْحَيَوَانِ بِاللَّحْمِ میں نہی کو عموم کے لیے لیتے ہیں کہ نہی عام ہے' ہر قسم کے جانور کی بیع ہر قسم کے گوشت کے بدلے ممنوع ہے (اَلتَّعْلِيْقُ الْمُمَجَّد حاشیہ موطا امام محمد ص ۳۳۷)

قاضی شوکانیؒ نے ان روایات میں فرداً" فرداً" ضعف ثابت کیا ہے جن میں بَيْعُ الْحَيَوَانِ بِاللَّحْمِ کی ممانعت آئی ہے اور پھر لکھتے ہیں کہ تمام اسناد کو ملا کر حدیث قابل استدلال بن جاتی ہے۔ اور فرماتے ہیں وَقَالَ اَبُوْ حَنِيْفَةَ يَجُوْزُ مُطْلَقاً وَاسْتَدَلَّ عَلٰى ذَالِكَ بِعُمُوْمِ قَوْلِهٖ تَعَالٰى وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ (نیل الاوطار ج ۵ ص ۲۱۴) اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مطلقاً جائز ہے (بجنسہٖ ہو یا بغیر جنسہٖ) اور انہوں نے اللہ تعالٰی کے اس فرمان وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ کو دلیل بنایا ہے۔ اور مولانا ظفر احمد صاحبؒ فرماتے ہیں بَلْ مَبْنَاهُ عِنْدَهُمْ نُصُوْصُ حُرْمَةِ الرِّبَا فِي الْمُقَدَّرَاتِ الْمُجَانِسَاتِ (اعلاء السنن ج ۱۴ ص ۳۱۹) ان حضرات (امام ابو حنیفہؒ وغیرہ) کے نظریہ کا مدار ان نصوص پر ہے جن میں ثابت ہے کہ حرمت ربا تب پائی جاتی ہے جبکہ قدر اور جنس ایک ہو (اور یہاں قدر ایک نہیں اس لیے کہ ایک موزونی ہے اور دوسری غیر موزونی)

بَیۡعَ التَّلۡجِئَۃ (فرضی بیع)

بعض دفعہ یوں ہوتا ہے کہ لوگ محض فرضی بیع کر لیتے ہیں حالانکہ ان کا مقصود خرید وفروخت نہیں ہوتا۔ صرف لوگوں میں ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ ہم نے آپس میں بیع کی ہے۔ اگر یہ کسی کو دھوکا دینے کی خاطر ہو تو یہ فعل مکروہ ہوگا۔ ایسی بیع بہرحال نہیں ہوتی اس لیے کہ ان کا مقصد بیع نہیں اور اس میں تراضی بھی نہیں پائی جا رہی۔ فقہی اصطلاح میں ایسی بیع کو تلجئہ کہتے ہیں۔ چنانچہ الفتاوی الہندیہ میں ہے

اَلتَّلۡجِئَۃُ هِیَ الۡعَقۡدُ الَّذِیۡ یَنۡشَئُہٗ لِضَرُوۡرَۃِ اَمۡرٍ فَیَصِیۡرُ کَالۡمَدۡفُوۡعِ اِلَیۡہِ وَاِنَّہٗ عَلٰی ثَلَاثَۃِ اَضۡرُبٍ اَحَدُھَا اَنۡ یَکُوۡنَ فِیۡ نَفۡسِ الۡمَبِیۡعِ وَھُوَ اَنۡ یَّقُوۡلَ لِرَجُلٍ اِنِّیۡ اُظۡھِرُ اَنۡ بِعۡتُ دَارِیۡ مِنۡکَ وَلَیۡسَ بَیۡعًا فِی الۡحَقِیۡقَۃِ یَشۡھَدُ عَلٰی ذَالِکَ ثُمَّ بَیۡعَ فِی الظَّاھِرِ فَالۡبَیۡعُ بَاطِلٌ (الفتاوی الہندیہ ج ۳ ص ۱۰۱)

تلجئہ خرید وفروخت کے اس معاملہ کو کہتے ہیں جس کو کسی ضرورت کی بنا پر کیا جائے جیسا کسی کو اس پر مجبور کر دیا گیا ہو اور اس کی تین اقسام ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ خود بیع میں یہ بات پیش آئے اس طرح کہ ایک آدمی دوسرے آدمی سے کہے کہ میں ظاہر کروں گا کہ میں نے اپنا مکان تم پر فروخت کر دیا ہے حالانکہ حقیقت میں خرید وفروخت نہ ہو اور وہ اس معاہدہ پر گواہ بھی بنا لے۔ پھر یہ ظاہر کرے کہ مکان فروخت کر دیا ہے تو بیع باطل ہوگی۔ جب بیع باطل ہے تو اصل مالک بدستور مالک رہتا ہے اور وہ مبیعہ اس کی ملکیت سے نہیں نکلتا۔

اسی طرح بیع تلجئہ کی یہ صورت بھی ہے کہ بائع اور مشتری آپس میں خفیہ طور پر ایک چیز کا ثمن ایک ہزار مقرر کرتے ہیں مگر لوگوں میں اس کا ثمن دو ہزار ظاہر کرتے ہیں۔ تو اس صورت میں جو ثمن انہوں نے خفیہ طور پر طے کیا ہے' وہی ہوگا۔ اور امام ابو یوسف نے فرمایا کہ جو ثمن وہ ظاہر کر رہے ہیں' وہ ہوگا۔ اسی طرح بائع اور مشتری اندرونی طور پر ایک چیز کا ثمن ہزار درہم مقرر کرتے ہیں مگر ظاہری طور پر سو دینار پر بیع کرتے ہیں تو یہ بھی بیع تلجئہ ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ بیع تلجئہ موقوف ہوگی۔ اگر ان دونوں بائع اور مشتری نے ایک ثمن پر بیع کو نافذ کر دیا تو جائز ہوگی اور اگر انہوں نے رد کر دیا تو باطل ہوگی۔ (الفتاوی الہندیہ ج ۳ ص ۲۱۰)

بَیۡعُ الۡوَفَاءِ (واپس کر دینے کی شرط سے بیع کرنا)

بعض لوگ یوں کرتے ہیں کہ کسی سے قرض لیتے ہیں۔ اب قرض دینے والا رقم میں

زیادتی کا تقاضا نہیں کرتا کہ یہ سود ہے مگر اس کی صورت یہ کر لیتے ہیں کہ قرض لینے والا اپنا مکان اس پر بیچ دے اور جب قرض واپس کرے گا تو اپنا مکان واپس لے لے مثلاً" زید نے تین لاکھ روپیہ بکر سے قرض لیا اور اپنا مکان اس کے عوض بکر کو دے دیا اور شرط یہ رکھی کہ جب میں تمہارا قرض واپس کروں گا تو اپنا مکان واپس لے لوں گا۔ ایسی بیع کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ اگر زید اپنا مکان رہن کے طور پر رکھے تو بکر اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور جب اس نے اس پر بیچا تو وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس فائدہ کی خاطر ایسی بیع کی جاتی ہے۔ ایسی بیع کو فقہی اصطلاح میں بیع الوفاء کہتے ہیں۔ چنانچہ علامہ شامی فرماتے ہیں۔

اَلْبَیْعُ الَّذِیْ تَعَارَفَهٗ اَهْلُ زَمَانِنَا احْتِیَالًا لِلرِّبَا وَسَمَّوْهُ بِبَیْعِ الْوَفَاءِ وَهُوَ رَهْنٌ فِی الْحَقِیْقَةِ لَا یَمْلِكُهٗ وَلَا یَنْتَفِعُ بِهٖ اِلَّا بِاِذْنِ مَالِكِهٖ وَهُوَ ضَامِنٌ لِمَا اَکَلَ مِنْ ثَمَرَةٍ وَاَتْلَفَ مِنْ شَجَرَةٍ (فتاویٰ شامی ج ۴ ص ۳۴۶)

وہ بیع جس کا آج کل ہمارے زمانے میں سود سے بچنے کے لیے حیلہ کیا جاتا ہے اور اس کو بیع الوفاء کہتے ہیں' یہ درحقیقت رہن ہوتا ہے۔ لینے والا اس کا مالک نہیں بنتا اور نہ اس کے مالک کی اجازت کے بغیر اس سے فائدہ ہی اٹھا سکتا ہے۔ اگر اس نے کوئی پھل یا درخت ضائع کیا تو اس کا ضامن ہوگا۔

بَیْعُ الْحُقُوْقِ۔ کون سے حقوق کی خرید و فروخت ہو سکتی ہے؟

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دام مجدہم نے اپنے رسالہ "حقوق مجردہ کی خرید وفروخت" میں (جو کہ فقہی مقالات کے عنوان سے دیگر مقالات کے ساتھ شائع شدہ ہے) اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض حقوق انسان کو صرف اس لیے دیے گئے ہیں کہ وہ کسی ضرر سے بچ جائے جیسا کہ شفعہ کا حق' بچے کی پرورش کا حق وغیرہ۔ یہ حقوق انسان کو ضرورۃ" دیے گئے ہیں۔ اگر جس کا حق بنتا ہے' وہ اپنے حق سے دست بردار ہو جائے تو پھر اس کا حق نہیں رہتا۔ ایسے حقوق کی خرید وفروخت درست نہیں ہے۔

اور بعض حقوق انسانوں کو ایسے حاصل ہیں جو اصالتاً" انسان کو حاصل ہیں مگر وہ کسی دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہو سکتے جیسا کہ ولاء کا حق اور مرد کو عورت پر ملکیت نکاح کا حق اور حق قصاص وغیرہ تو ایسے حقوق سے دست بردار ہونے کے لیے اگر معاوضہ طلب کرتا ہے تو درست نہیں ہے اور اس کی دلیل وہ روایات ہیں جن میں وَلاء کی بیع اور ہبہ سے منع کیا گیا

ہے اور اگر صاحب حق اور جس کے ذمہ حق ہے' وہ آپس میں صلح سے معاوضہ طے کر لیں تو معاوضہ لینا درست ہوگا جیسا کہ مقتول کے ورثاء اگر حق قصاص کے عوض دیت لے لیں یا مرد عورت سے ملکیت نکاح کے حق کے عوض بدل خلع لے لے تو یہ درست ہے اور بعض حقوق ایسے ہیں جو انسان کو اصالتاً" حاصل ہیں اور دوسرے کی طرف منتقل بھی ہو سکتے ہیں جیسا کہ حق ایجاد (کہ کسی نے کوئی چیز ایجاد کی تو اس کو آگے چلانے کا اس کو حق ہے) حق تالیف (کہ کسی نے کوئی کتاب لکھی اور اس پر محنت کی تو اس پر اس کا حق ہے۔ کوئی دوسرا اس کو اپنے نام سے منسوب نہیں کر سکتا) حق طباعت (یعنی جو آدمی مسودہ کا مالک ہے' جس نے تالیف کیا ہے وہی اس کی طباعت کا حق رکھتا ہے۔ اگر وہ اس حق کو بیچتا ہے تو جائز ہے۔ اگر بیچتا نہیں بلکہ وقتی طور پر کسی کو طباعت کی اجازت دیتا ہے تو وہ جب چاہے' اپنا حق واپس لے سکتا ہے) رجسٹرڈ یا ٹریڈ مارک (جو کوئی فیکٹری یا پارٹی اپنے کاروبار کے لیے منظور کروا لیتی ہے) تو یہ ایسے حقوق ہیں جو صاحب حق کو اصالتاً" حاصل ہوئے ہیں اور دوسرے کی طرف منتقل ہو سکتے ہیں تو صاحب حق ان حقوق کو بیچ سکتا ہے اور معاوضہ لے سکتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ ان حقوق کی کسی کو اجازت نہیں دیتا اور حقوق اپنے پاس محفوظ رکھتا ہے تو اس کا حق ہے اور کسی دوسرے کا اس میں دخل اندازی کرنا حقوق کا غصب کہلائے گا۔ (دار العلوم دیوبند کے مفتی صاحبان سمیت ہندوستان کے جید علماء کرام نے بھی اسی نظریہ کی تائید کی ہے۔ ملاحظہ ہو جدید فقہی مباحث مطبوعہ ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی)

گڈول (ناموں کی رجسٹریشن)

کوئی ادارہ اپنے نام کو قانوناً" محفوظ کر لیتا ہے اس لیے کسی دوسرے کو اس نام سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش نہیں رہتی' اس کو اصطلاح میں گڈول کہتے ہیں۔ اس میں اپنے مفادات کا تحفظ بھی ہوتا ہے اور عوام کو دھوکے سے بچانا بھی ہوتا ہے اور تجارتی منفعت بھی حاصل ہوتی ہے اس لیے اس کی خرید و فروخت جائز ہوگی۔ چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں "اپنے کاروبار کا کوئی نام رکھنے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے لیکن اگر ایک شخص نے اپنے کاروبار کا نام عطرستان یا گلشن ادب رکھ لیا اور اس سے اس کا تجارتی مفاد وابستہ ہو گیا تو کسی دوسرے شخص کو وہ نام رکھنے کا حق نہیں رہا اور جب کہ ایک خاص نام کے ساتھ مستقبل میں تحصیل مال اور تجارتی منفعت مقصود ہے تو گڈول کا معاوضہ لینا جائز

ہے۔" (حوادث الفتاویٰ بحوالہ فقہی مسائل ج ا ص ۲۳۲ مصنفہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی)

سَفتَجَہ (ہنڈی کا کاروبار)

فیروز اللغات میں ہے سَفتَجہ سَفتَہ کا معرب ہے (فیروز اللغات فارسی ج ۲ ص ۳۶) یعنی غیر عربی میں سَفتَہ ہے اور عربی میں سَفتَجہ کہا جاتا ہے۔

سفتجہ یہ ہے کہ ایک شخص کسی کو قرض دے اور کسی دوسرے شہر میں جہاں وہ جانا چاہتا ہے' وہاں جا کر قرض وصول کرے تا کہ راستہ میں رقم ضائع ہو جانے کے خطرات سے محفوظ رہ سکے۔ اس کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ مثلاً" ایک آدمی گوجرانوالہ سے کراچی جانا چاہتا ہے اور گوجرانوالہ ہی کے ایک ایسے آدمی کو رقم دے دیتا ہے جس کا کاروباری رفیق کراچی میں ہے اور جس کو رقم دی ہے' وہ تحریر یا فون کے ذریعہ سے اپنے کراچی والے رفیق سے کہہ دیتا ہے کہ اس آدمی کو اتنی رقم دے دینا اور یہ آدمی اس سے ثبوت لے کر کراچی چلا جاتا ہے اور ثبوت پیش کر کے اس سے رقم لے لیتا ہے تو اس کو سفتجہ کہا جاتا ہے۔

علامہ مجد الدین فیروز آبادی لکھتے ہیں۔

وَھِیَ اَنْ تُعطِیَ مَالاً لِرَجلٍ لَہٗ مالٌ فی بلدٍ تریدُ ان تسافر الیہ فَتَاْخُذَ مِنہُ خَطًّا لِمَنْ عِندَہُ المَالُ فِیْ ذَالِکَ البلدِ اَنْ یعطیکَ مثلَ مَالِکَ الَّذی دفعتَہٗ اِلیہ قَبلَ سَفرِکَ

(القاموس المحیط ج ا ص ۹۴ بحوالہ فقہی مسائل ج ا ص ۲۳۲)

اور وہ یہ ہے کہ تم کسی کو مال دو جس کا مال کسی اور شہر میں ہو۔ تمہارا مقصد یہ ہو کہ وہاں کا سفر کرو چنانچہ تم اس سے اس شخص کے نام ایک تحریر لو جس کے پاس اس دوسرے شہر میں اس کا مال ہو کہ وہ تم کو اتنا ہی مال دے دے جتنا مال تم نے اس کو اپنے سفر سے پہلے دیا تھا۔ اگر اس میں کالا دھن نہ ہو یا حکومتی شعبوں کو نقصان پہنچانا مقصود نہ ہو تو یہ بیع درست ہے ورنہ درست نہیں ہے۔

شیئرز کی خرید و فروخت

اس پر بھی مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دام مجدہم نے تفصیل سے بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کی تحقیق کے مطابق شیئرز خریدنے والا اس کمپنی کے اتنے حصہ کا مالک بن جاتا ہے جتنے حصے اس نے خریدے ہیں۔ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ چار

شرائط کے ساتھ ان کی خرید وفروخت جائز ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ جس کمپنی کے شیئرز یہ آدمی خرید رہا ہے' وہ کمپنی کھلے حرام کاروبار میں ملوث نہ ہو یعنی سودی بنک یا جوا پر مبنی انشورنس کمپنی یا شراب وغیرہ کا کاروبار کرنے والی کمپنی نہ ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ اس کمپنی کے اثاثے بلڈنگ یا زمین یا مشینری وغیرہ کی صورت میں ہوں' نقدی کی صورت میں نہ ہوں اس لیے کہ اگر نقدی کی صورت میں ہوں گے تو ان کا کمی بیشی سے خریدنا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ کمی بیشی کے ساتھ وہ سود بن جائے گا۔

تیسری شرط یہ ہے کہ اگر ایسی کمپنی ہے جس کا بنیادی کاروبار مجموعی طور پر حلال ہے اور اس میں حرام کا اختلاط بھی ہو اور حرام کم ہو تو یہ آدمی جس نے شیئرز خریدے ہیں باقی حصہ داروں کے سامنے اس حرام کے خلاف آواز اٹھائے اور حرام کو بند کرنے پر زور دے اگرچہ اس کی آواز مسترد کر دی جائے۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ یہ شیئرز خریدنے والا جب منافع تقسیم ہو تو یہ معلومات کر کے کہ اس کمپنی کے کس قدر حصے حرام ذریعہ سے حاصل ہوئے ہیں تو یہ آدمی اپنا منافع وصول کرنے کے بعد اپنے حصہ میں جو تناسب حرام کے ذریعہ سے حاصل شدہ منافع کا ہو سکتا ہے۔ اس تناسب سے رقم نکال کر حرام سے بچنے کی نیت سے صدقہ کر دے۔ چونکہ یہ حرام مال کا صدقہ ہے' اس لیے اس میں ثواب کی نیت نہیں کرنی چاہیے جیسا کہ فقہ کی کتابوں اور فتاویٰ جات میں اس کی صراحت موجود ہے۔

شیئرز کے کاروبار کی تفصیل کے لیے مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دام مجدہم کے فقہی مقالات کا مطالعہ کریں۔

شیئرز کے بارے میں مذکورہ شرائط کو دیکھا جائے اور شیئرز ہولڈر حضرات کے رویہ کو دیکھا جائے تو مسئلہ مشکل ہو جاتا ہے اس لیے کہ آج کل کوئی کمپنی بھی اپنے بارے میں واقعاتی معلومات فراہم نہیں کرتی خواہ اس کے جتنے مرضی حصے خرید لیے جائیں اس لیے دین داری اور احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ اشد مجبوری کے بغیر ایسے کاروبار سے اجتناب ہی کیا جائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

دعاء کی درخواست

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بیوع سے متعلق حَتَّی الْمَقْدُوْر بحث کر دی گئی ہے۔ بعض بزرگ اساتذہ کا مشورہ بھی ہے اور خود اپنا بھی ارادہ ہے کہ ترمذی شریف کی اس کے بعد

کے ابواب کی بھی بحث کر دی جائے تا کہ ترمذی شریف مکمل ہو جائے۔ طلبہ کرام سے
خصوصاً اور اس کتاب کے دیگر قارئین کرام سے عموماً درخواست ہے کہ احقر کے لیے دعاء
فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس محنت کو قبول فرمائے اور بخشش کا ذریعہ بنائے اور باقی کام مکمل
کرنے کے لیے صحت وعافیت وفرصت نصیب فرمائے۔ آمین یا اللہ العالمین۔
احقر عبد القدوس قارن

مراجع ومصادر

اس کتاب میں جن کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں ان کے مطابع بھی ذکر کیے جاتے ہیں تاکہ اصل حوالہ جات دیکھنے والوں کو آسانی ہو اور کتابوں کے نام کے ذکر کرنے میں ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے رکھی گئی ہے اور پہلے قرآن کریم کا ذکر کیا گیا ہے۔

	نام کتاب	نام مصنف	طابع
۱		قرآن کریم	
۲	ابوداؤد شریف	امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث	مکتبہ امدادیہ ملتان
۳	انوار المحمود	علامہ محمد صدیق نجیب آبادی	طبع دہلی
۴	اعلاء السنن	علامہ ظفر احمد عثمانی	ادارة القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی
۵	اوجز المسالک	الشیخ محمد زکریا	ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
۶	ابن ماجہ شریف	امام محمد بن یزید بن ماجہ	ایچ ایم سعید کمپنی کراچی
۷	امداد الاحکام	علامہ ظفر احمد عثمانی	مکتبہ دار العلوم کراچی
۸	امداد الفتاوی	افادات مولانا محمد اشرف علی تھانوی	مکتبہ اشرف العلوم کراچی
۹	اشعۃ اللمعات	الشیخ عبد الحق دہلوی	کتب خانہ مجیدیہ ملتان
۱۰	اصول الشاشی	نظام الدین الشاشی	مکتبہ امدادیہ ملتان
۱۱	بخاری شریف	امام محمد بن اسمٰعیل البخاری	قدیمی کتب خانہ کراچی
۱۲	بذل المجهود	علامہ خلیل احمد سہارنپوری	مکتبہ قاسمیہ ملتان
۱۳	بدایۃ المجتہد	علامہ محمد بن احمد بن رشد	مکتبہ مصطفی البابی مصر
۱۴	البدائع الصنائع	امام ابوبکر بن مسعود الکاسانی	مطبعہ جمالیہ مصر
۱۵	البحر الرائق	علامہ ابن نجیم المصری	طبع مصر
۱۶	البنایہ شرح الہدایۃ للعینی	علامہ محمود بن احمد العینی	المکتبۃ الامدادیہ فیصل آباد
۱۷	ترمذی شریف	امام محمد بن عیسی الترمذی	ایچ ایم سعید کمپنی کراچی

کتاب	مصنف	ناشر
۱۸ تحفۃ الاحوذی	علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوریؒ	نشر السنۃ ملتان
۱۹ تہذیب سنن ابی داؤد	علامہ ابن القیم الجوزیؒ	مکتبۃ السنۃ المکیۃ
۲۰ التعلیق الممجد	علامہ عبدالحی لکھنویؒ	نور محمد اصح المطابع کراچی
۲۱ تقریر ترمذی لشیخ الہندؒ	علامہ محمود الحسن الدیوبندیؒ	ایچ۔ایم سعید کمپنی کراچی
۲۲ تقریر ترمذی للمدنیؒ	مرتبہ مفتی عبدالقادر صاحب قاسمی	کتب خانہ مجیدیہ ملتان
۲۳ تنظیم الاشتات	مولانا محمد ابوالحسن صاحب	اصلاحی کتب خانہ دیوبند
۲۴ جواہر الفقہ	مفتی اعظم مفتی محمد شفیع صاحبؒ	مکتبہ دارالعلوم کراچی
۲۵ جدید فقہی مباحث	مرتبہ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی	ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی
۲۶ جدید فقہی مسائل	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	حبیب الشفیق بک ڈپو لاہور
۲۷ الجوہر النقی	علامہ علی بن عثمان الماردینی	دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن
۲۸ حاشیہ شرح الوقایہ	علامہ عبدالحی لکھنویؒ	ایچ ایم سعید کراچی
۲۹ حجۃ اللہ البالغہ	امام الشاہ ولی اللہ الدہلویؒ	المکتبۃ السلفیۃ لاہور
۳۰ دارقطنی	امام علی بن عمر الدارقطنیؒ	دار المحاسن للطباعۃ قاہرہ
۳۱ دارمی	امام محمد بن عبدالرحمٰن الدارمیؒ	شرکۃ الطباعۃ الفنیۃ سعودی عرب
۳۲ زرقانی شرح المؤطا	امام محمد الزرقانیؒ	طبع مصر
۳۳ سنن الکبریٰ للبیہقی	امام ابوبکر احمد بن الحسین البیہقیؒ	دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن
۳۴ سبل السلام	علامہ محمد بن اسمٰعیل الامیر یمانیؒ	المکتبۃ الاثریہ لاہور
۳۵ شمائل ترمذی	امام محمد بن عیسیٰ الترمذیؒ	ایچ ایم سعید کمپنی کراچی
۳۶ طحاوی شریف	امام احمد بن محمد الطحاویؒ	مکتبہ رحیمیہ دیوبند
۳۷ عمدۃ القاری	علامہ محمود بن احمد العینیؒ	طبع بیروت
۳۸ العرف الشذی	علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ	مکتبہ رحیمیہ دیوبند
۳۹ عین الہدایہ	مولانا سید امیر علیؒ	ادارہ نشریات اسلام لاہور
۴۰ فتح الباری	علامہ ابن حجر عسقلانیؒ	مکتبہ مصطفےٰ البابی مصر
۴۱ فتاویٰ دارالعلوم	افادات مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ	مکتبہ امدادیہ ملتان
۴۲ فتاویٰ محمودیہ	مفتی محمود حسن گنگوہیؒ	کتب خانہ مظہری کراچی
۴۳ فتاویٰ ابن تیمیہ	شیخ الاسلام احمد بن تیمیہؒ	مطابع الریاض

۴۴ فتاویٰ نذیریہ	مولانا نذیر حسین دہلویؒ	اہلِ حدیث اکادمی لاہور
۴۵ فتاویٰ شامی	علامہ شامیؒ	مکتبہ ماجدیہ کوئٹہ
۴۶ فتاویٰ عالمگیری	مرتبہ مولانا نظام وجماعۃ من علماء الہند	مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ
۴۷ فقہی مقالات	مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دام مجدہم	میمن اسلامک پبلشرز کراچی
۴۸ فیض الباری	علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ	المطبعۃ الاسلامیۃ السعودیہ لاہور
۴۹ فتح القدیر	علامہ محمد بن عبدالواحد (ابن الہمام)ؒ	مکتبہ مصطفیٰ محمد مصر
۵۰ قمر الاقمار حاشیہ نور الانوار	علامہ محمد عبدالعلیم لکھنویؒ	ایچ ایم سعید کمپنی کراچی
۵۱ کتاب الام	امام محمد بن ادریس الشافعیؒ	طبع بیروت
۵۲ کتاب الآثار لمحمدؒ	امام محمد بن الحسن الشیبانیؒ	ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی
۵۳ الکوکب الدرّی	مولانا رشید احمد گنگوہیؒ	مکتبہ یحیویہ سہارن پور
۵۴ اللامع الدراری	علامہ ابوزکریا محمد یحیی الصدیقیؒ	المکتبۃ الامدادیہ مکہ مکرمہ
۵۵ مسلم شریف	امام مسلم بن الحجاجؒ	قدیمی کتب خانہ کراچی
۵۶ معالم السنن	امام ابوسلیمان الخطابیؒ	مکتبۃ السنّۃ المکیہ
۵۷ مؤطا امام مالک	امام مالک بن انسؒ	نور محمد اصح المطابع کراچی
۵۸ مؤطا امام محمد	امام محمد بن الحسن الشیبانیؒ	〃 〃 〃 〃
۵۹ المحلی لابن حزم	علامہ ابن حزم الظاہریؒ	مکتبہ مصر
۶۰ مرقات شرح مشکوٰۃ	علامہ ملّا علی قاریؒ	مکتبہ امدادیہ ملتان
۶۱ مسند احمد	امام احمد بن حنبلؒ	طبع بیروت
۶۲ مختصر المزنی	امام اسمٰعیل بن یحیی المزنیؒ	〃 〃
۶۳ مسند ابی یعلیٰ	امام احمد بن علیؒ	〃 〃
۶۴ المعجم الکبیر للطبرانی	امام سلیمان ابن احمدؒ	طبع قاہرہ
۶۵ مصنف عبدالرزاق	امام ابوبکر عبدالرزاق بن ہمامؒ	طبع بیروت
۶۶ المبسوط للسرخسی	امام شمس الدین السرخسیؒ	مطبعۃ السعادۃ مصر
۶۷ المولوی علی الحسامی	مولانا محمد یعقوب البنانیؒ	مطبع تعلیمی لاہور
۶۸ مقدمہ انوار الباری	مولانا احمد رضا بجنوریؒ	مکتبہ حفیظیہ گوجرانوالہ
۶۹ مقدمہ ہدایہ اخیرین	مولانا عبدالحی لکھنویؒ	مطبع المجیدی کانپور

۷۰	مستدرک حاکم	امام ابو عبداللہ محمد النیسابوریؒ	مکتبۃ النصر الحدیث الریاض
۷۱	المواہب اللدنیہ	الشیخ ابراہیم بن محمد البیجوریؒ	مکتبہ مصطفےٰ البابی مصر
۷۲	مختصر سنن ابی داؤد	امام منذریؒ	مکتبۃ السنۃ المکیہ
۷۳	مسائل الرشید	مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی دام مجدہم	مکتبہ حلیمیہ کراچی
۷۴	المصفیٰ شرح الموطا	الشاہ ولی اللہ الدھلویؒ	کتب خانہ رحیمیہ دہلی
۷۵	نسائی شریف	امام احمد بن شعیب النسائیؒ	قدیمی کتب خانہ کراچی
۷۶	نصب الرایہ	علامہ ابو محمد عبداللہ بن یوسف الزیلعیؒ	طبع مصر
۷۷	نووی شرح مسلم	امام یحیی بن شرف النوویؒ	قدیمی کتب خانہ کراچی
۷۸	نیل الاوطار	امام محمد بن علی الشوکانیؒ	مکتبہ مصطفےٰ البابی مصر
۷۹	النامی علی الحسامی	مولانا عبدالحق حقانیؒ	میر محمد کتب خانہ کراچی
۸۰	نور الانوار	الشیخ محمد المعروف بہ ملا جیونؒ	ایچ ایم سعید کمپنی کراچی
۸۱	الورد الشذی	الشیخ اصغر حسینؒ	معہد الخلیل الاسلامی کراچی
۸۲	ہدایہ	امام علی بن ابی بکر المرغینانیؒ	مطبع المجیدی کانپور

بخاری شریف
غیر مقلدین کی نظر میں
قیمت ۱۸ ـــ ۰۰
علامہ ابن القیم الجوزیؒ کی مشہور کتاب
حَادِی الاَرْوَاح اِلٰی بِلَادِ الْاَفْرَاح کا اردو ترجمہ
جنت کے نظارے
مترجم: حافظ عبدالقدوس خان قارن
مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ
● یہ وہ کتاب ہے جس میں علامہ ابن القیمؒ نے جنت اور اس کی نعمتوں کے بارہ میں قرآنی آیات اور بے شمار احادیث پر مشتمل علمی ذخیرہ جمع فرمایا ہے۔
● اس کتاب کے اقتباسات علماء کرام اور تبلیغ سے وابستہ حضرات اکثر پیش کرتے رہتے ہیں جن سے جنت کی قدر دل و دماغ میں سما جاتی ہے۔
● اس کتاب کے مطالعہ سے جنت حاصل کرنے کا شوق اور جہنم سے بچنے کا فطری شعور اجاگر ہوتا ہے۔
● یہ کتاب دنیا کی مادی اور فانی نعمتوں میں مست لوگوں کو اصل اور غیر فانی نعمتیں یاد دلانے کا بہترین ذریعہ ہے
● قرآنی آیات اور اکثر احادیث کا اصل متن اور نمایاں ترجمہ اور وضاحت طلب عبارات کی بریکٹ میں مختصر تشریح۔
● اصل کتاب کی عبارات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ترجمہ کی عبارت میں تسلسل۔
● اصل کتاب میں دیئے گئے حدیث کی کتابوں کے اکثر بقید صفحات حوالہ جات۔
۱۸۰ روپے

امام اہلسنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دام مجدہم کی کتابوں پہ
غیر مقلد عالم مولانا ارشاد الحق اثری صاحب کی جانب سے کئے گئے

اعتراضات کے مدلل جوابات

مولانا ارشاد الحق اثری صاحب کا مجذوبانہ واویلا

مجذوبانہ واویلا

پر غیر مقلد عالم مولانا ارشاد الحق اثری صاحب کے اعتراضات کے جوابات

تصویر بڑی صاف ہے سبھی جان گئے

بجواب

آئینہ انکو دکھایا تو برا مان گئے

امام اعظم امام ابوحنیفہ پر بے بنیاد اعتراضات کے جواب میں
علامہ کوثری مصری کی کتاب تانیب الخطیب کا اردو ترجمہ

امام ابوحنیفہؒ کا عادلانہ دفاع

غیر مقلد عالم مولوی محمد امین محمدی صاحب کے طلاق ثلاثہ

کے موضوع پر مقالہ کا مدلل جواب **جواب مقالہ**

غیر مقلدین کے بخاری شریف کی احادیث پر عمل کی بجائے

دوسری روایات کو ترجیح دینے کا مختصر سا نمونہ

بخاری شریف غیر مقلدین کی نظر میں

حنفی شافعی وغیرہ اختلافات کا طعنہ دینے والوں اور فقہ

کو اختلاف کا سبب کہنے والوں کی اندرونی داستان

غیر مقلدین کے متضاد فتوے

اہل سنت والجماعت کے وضوء میں پاؤں دھونے کے

نظریہ پر شیعہ حضرات کے اعتراض کا مدلل جواب

وضوء کا مسنون طریقہ

از قلم: حافظ عبد القدوس قارن

عمر اکادمی نزد مدرسہ نصرۃ العلوم گھنٹہ گھر گوجرانوالہ

احناف کا رسول اللہ ﷺ سے اختلاف یا

غیر مقلدین کی بد دیانتیوں اور جہالتوں بھری داستان

انکشاف حقیقت

رمضان المبارک کے آخری جمعہ میں دو نوافل کو قضاء عمری قرار دینے والوں کے نظریہ کی مدلل تردید پر مولانا عبدالحی لکھنویؒ کی کتاب ردع الاخوان کا اردو ترجمہ

مروجہ قضاء عمری بدعت ہے

امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدر دام مجدہم کی ردبدعات پر مدلل اور لاجواب کتاب راہ سنت پر لغو اور لایعنی قسم کے اعتراضات پر مشتمل کتاب مصباح سنت کا مسکت اور مدلل جواب

ایضاحِ سنت جلد اول

بجواب

مصباح سنت جلد اول

از قلم

حافظ عبدالقدوس خان قارن...... مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

عمر اکادمی نزد مدرسہ نصرۃ العلوم گھنٹہ گھر گوجرانوالہ

مکتبہ صفدریہ نزد گھنٹہ گھر گوجرانوالہ کی مطبوعات

خزائن السنن
تقریر ترمذی طبع سوم

احسن الکلام
مسئلہ فاتحہ خلف الامام کی مدلل بحث طبع ششم

تسکین الصدور
مسئلہ حیات النبی ﷺ پر مدلل بحث طبع ہفتم

الکلام المفید
مسئلہ تقلید پر مدلل بحث

ازالۃ الریب
مسئلہ علم غیب پر مدلل بحث طبع ہشتم

راہ سنت
رد بدعات پر لاجواب کتاب

آنکھوں کی ٹھنڈک
مسئلہ حاضر وناظر پر مدلل بحث

احسان الباری
بخاری شریف کی ابتدائی اسباق

طائفہ منصورہ
نجات پانیوالے گروہ کی علامت

ارشاد الشیعہ
شیعہ نظریات کا مدلل جواب

درود شریف
پڑھنے کا شرعی طریقہ

عبارات اکابر
اکابر علماء دیوبند کی عبارات پر اعتراضات کے جوابات

تبلیغ اسلام
ضروریات دین پر مختصر بحث

گلدستہ توحید
مسئلہ توحید کی وضاحت

دل کا سرور
مسئلہ مختار کل کی مدلل بحث

راہ ہدایت
کرامات و معجزات کے بارہ میں صحیح عقیدہ کی وضاحت

بانی دارالعلوم دیوبند
مولانا محمد قاسم دیوبندیؒ کے حالات زندگی اور ان پر اعتراضات کے جوابات

ینابیع
غیر مقلد عالم مولانا ثناء اللہ امرتسری کے رسالہ تراویح کا اردو ترجمہ

چراغ کی روشنی
معراج النبی ﷺ کے بارہ میں قادیانی وغیرہ کے اعتراضات کے جوابات

مسئلہ قربانی
قربانی کی فضیلت اور ایام قربانی پر مدلل بحث

عیسائیت کا پس منظر
عیسائیوں کے عقائد کا رد

مقالہ ختم نبوت
قرآن وسنت کی روشنی میں

المسلک المنصور

اتمام البرہان
رد توضیح البیان

حلیۃ المسلمین
داڑھی کا مسئلہ

توضیح المرام
فی نزول مسیح علیہ السلام

آئینہ محمدی
سیرت پر مختصر رسالہ

شوق حدیث
حجیت حدیث پر مدلل بحث

ملا علی قاری
اور مسئلہ علم غیب وحاضر وناظر

تنقید متین
بر تفسیر نعیم الدین

باب جنت
بجواب راہ جنت

الکلام الحاوی
سادات کیلئے زکوۃ وغیرہ لینے کی مدلل بحث

مودودی صاحب کا غلط فتویٰ

تفریح الخواطر
بجواب تنویر الخواطر

چہل مسئلہ
حضرات بریلویہ

عمدۃ الاثاث
تین طلاقوں کا مسئلہ

الشہاب المبین
بجواب الشہاب الثاقب

اظہار العیب
بجواب اثبات علم الغیب

سماع موتیٰ

چالیس دعائیں

مقام ابی حنیفہؒ

صرف ایک اسلام

حکم الذکر بالجہر

شوق جہاد

اطیب الکلام
ملخص احسن الکلام

انکار حدیث کے نتائج
منکرین حدیث کا رد

مرزائی کا جنازہ اور مسلمان

مولانا ارشاد الحق اثری کا
مجذوبانہ واویلا

اخفاء الذکر
ذکر آہستہ کرنا چاہیے

مطبوعات عمر اکادمی

بخاری شریف
غیر مقلدین کی نظر میں

خزائن السنن
جلد دوم کتاب البیوع

جنت کے نظارے
علامہ ابن القیم کی کتاب حادی الارواح کا اردو ترجمہ

حمیدیہ
فن مناظرہ کی کتاب رشیدیہ کا اردو ترجمہ

علامہ کوثری کی تانیب الخطیب کا اردو ترجمہ
امام ابوحنیفہؒ کا عادلانہ دفاع

غیر مقلدین کے متضاد فتوے

احتیاط کار سول اللہ ﷺ سے انتساب یا غیر مقلدین کی بددیانتیوں اور جہالتوں بھری داستان
انکشاف حقیقت

رد سنت پر اعتراضات کا مدلل جواب
ایضاح سنت
بجواب
مصباح سنت

شیعہ کی جانب سے اہل سنت کے وضوء پر اعتراضات کے جوابات
وضوء کا مسنون طریقہ

تین طلاقوں کے مسئلہ پر مقالہ کا
جواب مقالہ

الدروس الواضحہ فی شرح الکافیہ

مروجہ قضائے عمری
بدعت ہے